اندھی گلیاں

محمد شعیب قریشی

یونیورسٹی بک ایجنسی خیبر بازار۔ پشاور

اندھی گلیاں

(ناول)

شعیب قریشی

پبلشرز

یونیورسٹی بک ایجنسی۔ خیبر بازار۔ پشاور

شعیب کی یہ تخلیق ایک لحاظ سے سہل ممتنع کے ذیل میں آتی ہے۔ پڑھیئے تو اتنی عام اور سادہ کہ روزمرہ کی زندگی گویا مجسم ہو کر منہ سے بول اٹھتی ہے۔ عام لوگوں کو روزانہ پیش آنے والے عام واقعات۔ عام محسوسات اور حادثات کی اِس عام انداز میں تصویر کشی کرنے بیٹھئے تو خامہ انگشت بدندان نظر آئے۔

عام ناولوں کے برعکس جن کے مرکزی کردار عموماً شہزادے، امیرزادے، پروفیسر یا لیڈر ہوتے ہیں اس ناول کا مرکزی کردار ایک کلرک ہے۔ یہ کلرک جو پہلے فوج میں رہ چکا ہے اور وہاں سے قبل از وقت ریٹائر ہو کر اپنے اہل و عیال کا پیٹ پالنے کے لئے جامعہ میں کلرکی کر رہا ہے۔ عام ہیروؤں کے برعکس شادی شدہ ہے۔ بال بچوں والا ہے اور خاصا معمر بھی ہے۔ شعیب کا یہ کردار اپنے طور طریقوں سے سرحد کے باشندوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ فیّاض، مہمان نواز، سادہ، صاف گو، جلد غصّے میں آنے اور جلد معاف کر دینے والا معمّر ہونے کے باوجود اس میں جسمانی دلکشی بھی ہے۔ اور عادات و اطوار میں جاذبیت بھی۔

ناول میں کئی عورتیں ہیں جو صورت، شکل، عادات و اطوار میں مختلف ہونے کے باوجود عورت ہیں۔ محرومی اور ناآسودگی اُن میں قدرِ مشترک

ہے۔ عورتیں جو افسر بھی ہیں اور ماتحت بھی۔ یا تو کلرکوں میں دلچسپی لیتی ہیں یا پھر باس "کو گھیرے رہتی ہیں۔ اور باس" یا تو کلرکوں پر رعب جماتے نظر آتے ہیں یا پھر خواتین کے ساتھ خوش فعلیوں میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ دفتری زندگی کی اس سے بہتر نقشہ کشی اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ ہمارے معاشرے کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ عورت ہر جگہ عورت رہتی ہے اور مرد ہر جگہ مرد۔ وہ دفتر میں بھی آتی ہے تو حیثیت بھڑکیلے لباس میں پورے میک اپ اور عشوہ و ادا کے ساتھ۔ ادھر مرد ہیں جو گھر اور دفتر کا فرق بھول کر ان کی نسائیت سے پوری طرح متاثر رہتے ہیں اور کام کے اوقات تصوّرِ جاناں، کی نذر کر دیتے ہیں۔ اس قسم کا دفتری ماحول جہاں کام کی بجائے قدم قدم پر ترغیب ہو ان کو جس اعصابی تناؤ میں مبتلا کر دیتا ہے۔ شعیب کا ہیرو اس تجربے کو بھی بلا کم و کاست آپ کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ وہ ایک خاص قسم کی تربیت کی بناء پر موجودہ عورت کے کردار سے مطمئن نہیں ہے اور عورت کی آزادی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔ پھر بھی اس نے عورت کا کردار مسخ کر کے پیش کرنے کی شعوری کوشش بالکل نہیں کی بلکہ اپنے ہر تجربے کو جوں کا توں پیش کر دیا ہے۔ اس پیش کش میں ایک بازاری لڑکی ایک شریف مرد سے بازی لے جاتی ہے اور ایک ملازم پیشہ عورت (مس ہاردن) اپنی ہر محرومی اور ناآسودگی کے باوجود اور اپنے ماتحت کلرک سے پوری طرح متأثر ہونے کے باوصف اپنے مقام اور اپنی حیثیتوں کے فرق کو نہیں بھولتی اور اس طرح کیریکٹر کے لحاظ سے مرد پر

فوقیت لے جاتی ہے۔

ناول میں شعوری طور پر دقیق فلسفہ اور بے مزہ پند و نصائح کے دفتر نہیں کھولے گئے ہیں نہ تحلیل نفسی کی گئی ہے۔ نہ تجزیۂ باطن۔ بس عام واقعات اور محسوسات کو اس انداز اور صداقت کے ساتھ پیش کیا ہے کہ فلسفے منہ سے بول اُٹھتے ہیں۔ تحلیل نفسی اور تجزیۂ باطن خود بخود ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور جیسے پس منظر میں کوئی ناصح مشفق انگلی اٹھا کر معاشرے کے اخلاقی دیوالیہ پن سے خبردار کرتا رہتا ہے۔

ناول کا ہیرو بسوں میں سفر کرتا ہے اور سفر کے دوران ابن آدم اور بنت حوا کے درمیان جو معاملات پیش آتے ہیں۔ انہیں خود بھی دیکھتا ہے اور ہمیں بھی دکھاتا ہے۔ ان تمام چیزوں نے مل کر ناول کو زندگی کی طرح دلچسپ زندگی کی طرح حقیقی اور زندگی کی طرح متنوع بنا دیا ہے۔ میرے خیال میں کسی ناول کی تعریف نہ اس سے بہتر ہو سکتی ہے اور نہ اس سے زیادہ اس کے لئے کچھ کہا جا سکتا ہے۔ شعیب میں لکھنے کی بے پناہ صلاحیتیں ہیں۔ خدا کرے۔ اس کی یہ صلاحیتیں زیادہ سے زیادہ بروئے کار آئیں۔

سیّدہ حنا

ایم۔ اے

بار اول - - - - - مئی ۱۹۶۹ء

قیمت - - - - - بارہ [redacted] روپے

(منظور عام پریس پشاور)

انتساب

اپنے محترم بھائی

ایوبؔ صابر

کی کتاب

"اس حمام میں"

کے نام

جسے پڑھ کر میں نے محسوس کیا کہ اس حمام میں جو پہلا شخص ننگا پایا گیا ہے۔ وہ خود اس کا اپنا بھائی ہے!

ناشرین یونیورسٹی بک ایجنسی پشاور

طابع منظور عام پریس پشاور

تاریخ ماہ مئی سنہ ۱۹۶۹ء

بار اول ایک ہزار (۱۰۰۰)

تعارف

ہر ناول نگار اپنی زندگی میں ایک ہی شاہکار تخلیق کرتا ہے اور وہ بالعموم اس کی اپنی زندگی کے واقعات پر مشتمل ہوتا ہے۔ وہ خود نوشت سوانح عمری تو نہیں ہوتی مگر ہیرو کے پردے میں اس کے اپنے مشاہدات، جذبات اور احساسات جلوہ گر ہوتے ہیں۔ وہ نہ صرف حقیقت پر مبنی ہوتا ہے بلکہ اس میں اس کے مشاہدے کی گہرائی اور احساس کی شدت شامل ہوتی ہے۔ وہ افسانے کے روپ میں حقیقت ہوتی ہے۔ ویسے افسانے کو حقیقت کے روپ میں پیش کرنا بھی کمال ہے۔ یعنی یہ بھی کمالِ فن ہے کہ افسانے کو اس طرح پیش کیا جائے کہ وہ بعینہٖ حقیقت معلوم ہو مگر حقیقت پھر بھی حقیقت ہوتی ہے چاہے وہ افسانے کے روپ ہی میں جلوہ گر کیوں نہ ہو۔

سمرسٹ ماہم نے کم و بیش سو ناول لکھے لیکن "OF HUMAN BONDAGE" اس کا شاہکار ہے۔ یہی حال چارلس ڈکنس کے — "DAVID COPPERFIELD" کا ہے "آگ کا دریا" جیسی عظیم

تخلیق کے باوجود قرۃ العین حیدر کے ابتدائی ناول "میرے بھی صنم خانے" اور "سفینۂ غم دل" زندہ رہیں گے کیونکہ اول الذکر میں در پردہ اور ثانی الذکر میں اعلانیہ اس کی شخصیت آشکار ہوتی ہے۔ ویسے "آگ کا دریا" میں بھی وہ الگ تھلگ نہیں ہے۔ حقیقت نما افسانہ اور افسانہ نما حقیقت میں مابہ الامتیاز جذبات اور اس کی صداقت ہے۔ ہے یوں کہ ہر آدمی بجائے خود ایک محشر خیال ہے۔ اس میں جذبۂ اظہار کم و بیش موجود ہوتا ہے۔ اگر ابلاغ کا سلیقہ بھی ہو اور اس نے مطالعہ سے اس کو جلا بھی دے دی ہو تو وہ ایک کامیاب ناول نگار بن جاتا ہے۔ مطالعہ میں مطالعۂ فطرت اور اعلیٰ درجہ کی تخلیقات کا گہرا مطالعہ دونوں ہی شامل ہیں۔ چنانچہ ہر اچھے ناول نگار کی تخلیق میں پڑھے لکھے قاری کا ذہن ان شاہکاروں کی طرف منتقل ہوتا رہتا ہے۔ جن سے مصنف متاثر ہوتا رہتا ہے۔ مولانا عبدالحلیم شرر اور محمد علی طبیب اپنے زمانے میں مشہور ہونے کے باوجود بلند پایہ لطیف چیزیں پیش نہ کر سکے۔ کیونکہ ان کا مطالعی سرمایہ رینالڈز تک محدود تھا۔ بہت آگے بڑھے تو سر والٹر سکاٹ اور رائڈر ہیگرڈ تک پہنچ گئے مگر اسکاٹ کے فن کو بھی وہ کما حقہ سمجھ نہ سکے۔ اس زمانے میں جن ناولوں کے ترجمے ہوئے اُن سے اُس عہد کا مذاق معلوم ہوتا ہے۔ اسرارِ دربارِ لندن، سیر پرستان، روز الیہرٹ، مارگریٹ اور سپاہی کی دلہن وغیرہ۔ قرۃ العین حیدر کی تخلیقات میں ورجینیا وولف، ہنری جیمس اور ٹالسٹائے کی صاف جھلکیاں موجود ہیں۔ بقول فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔

شعیب قریشی صاحب کو نہیں جانتا ضرور تھا مگر پہچانتا نہ تھا۔ ان کے ناول اندھی گلیاں پڑھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ نہ صرف ایک سوچنے والے دماغ اور دھڑکتے ہوئے دل والے انسان ہیں بلکہ ان کا مطالعہ کائنات گہرا اور مطالعۂ کتب وسیع ہے۔ اب اس کو ان کی خوش قسمتی کہیئے یا خوش ذوقی کہ انہوں نے انگلستان، فرانس اور روس کے مایہ ناز ناول نگاروں کی تخلیقات پڑھیں چنانچہ قارئینِ کرام کو ان تاثرات کی جھلکیاں جابجا نظر آئیں گی۔ جو بلا کوشش و بے ارادہ ان کے ناول میں سرایت کئے ہوئے ہیں۔

اس ناول کا پلاٹ "اکہرا" ہے جو بیشتر اپنے ہیرو موسیٰ کے گرد ہی گھومتا ہے۔ بخت، جمال اور شمیم شعلہ ہائے مستعجل کی طرح چمک کر بجھ جاتے ہیں۔ مگر دونوں کے احوال سے نہ صرف واقعات کی یک رنگی میں تنوع پیدا ہو گیا ہے بلکہ ہیرو کے کردار کے چند خدوخال نمایاں ہو گئے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ ناول رومانی ہے مگر مس ہارون کی تلون مزاجی نے اس میں جاسوسی ناولوں جیسا سسپنس (SUSPENSE) پیدا کر دیا ہے۔ اور قاری منتظر رہتا ہے کہ مس ہارون اور موسیٰ کے تعلقات کا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے اور اس سے دلچسپی جو ہر ناول یا افسانے کی جان ہے برابر قائم رہتی ہے آخر کار ایک جذباتی ہیجان پر یہ المیہ انجام پذیر ہوتا ہے۔ پورے ناول میں واقعات کی تشکیل و ترتیب فطری ہے۔ کردار عام انسان ہیں جن میں خوبیاں بھی ہیں اور برائیاں بھی۔ اچھے لوگ جن کو حالات نے پسندیدہ نہ رہنے دیا۔ مثلاً

شمیم اور خود میں ہارون۔ مصنف نے اپنے کرداروں کے ساتھ انصاف برتا ہے۔ غیر اہم کرداروں کو بھی بالکل نظر انداز نہیں کیا گیا ہے جیسے مس امتیاز اور ناظم صاحب۔ ناظم صاحب ہمارے بڑے صاحبوں کا بولتا ہوا مجسمہ بھی ہیں اور ان پر بھرپور طنز بھی۔

موسیٰ شدتِ احساس کا شکار ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عربی النسل ہے اور عربوں کے متعلق مشہور و معروف المانی مستشرق گولڈ مہر کا خیال ہے کہ وہ اعصابی ہیجان کا شکار ہوتے ہیں۔ اس ناول میں مکالمے ہمارے عام ناولوں کی طرح بے کا اور لایعنی نہیں ہیں اور ہر فقرہ اپنے بولنے والے کی شخصیت اور مزاجی کیفیت کی غمازی کرتا ہے۔ موسیٰ کی بعض تقریریں بادی النظر میں طولانی معلوم ہوئیں مگر غور کرنے پر اندازہ ہوا کہ جب انسان جوش میں آتا ہے تو بولتا ہوا چلا جاتا ہے۔ لہٰذا ان پر طولِ مُمل کا اطلاق نہیں ہوتا۔ نہ وہ خشک واعظانہ تقریریں ہیں جو بدقسمتی سے ہمارے بعض ناول نگاروں کا طرۂ امتیاز ہیں۔

شعیب قریشی صاحب کا یہ پہلا ناول ہے مگر میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ بہ حیثیت مجموعی یہ نہ صرف کامیاب ہے بلکہ اس کا شمار اچھے ناولوں میں کیا جائے گا۔

(پروفیسر) سید وصی رضائی اے (آنرز) ایم اے
وائس پرنسپل گورنمنٹ کالج کوہاٹ۔
مورخہ ۱۳ جنوری ۱۹۶۹ء

سُرخ اینٹوں اونچے اونچے گنبدوں اور میناروں پہ مشتمل عمارتوں کے جامعہ کے پھاٹک میں جب وہ داخل ہُوا تو سورج کی زرد زرد کرنیں گھڑیال کے مینار سے پھسلتی ہوئی نیچے عین سامنے والی عمارت کے روشن دانوں اور اُن پر لپٹی ہوئی عشق پیچاں کی بیلوں سے اُلجھ رہی تھیں۔ خنک ہوا سرسراتی ہوئی عشقِ پیچاں کی بیلوں سے یوں اٹکھیلیاں کر رہی تھی۔ جیسے بیکراں سمندر کی موجیں کنارے پر کھڑی الگ تھلگ چٹان کو بار بار اپنی لپیٹ میں لے رہی ہوں۔ بیلوں پر سے موتی ایسے شبنم کے قطرے ٹپ ٹپ گرتے نیچے زمین میں جذب ہو رہے تھے۔

احاطے کے اندر درختوں پر کہیں چڑیاں چہچہا رہی تھیں اور کہیں اِکّا دُکّا کوّے بیٹھے کائیں کائیں کی متواتر آوازوں سے جامعہ کے اس سحر کن ماحول کا سکوت توڑنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن عمارتوں پر ایک گمبھیر خاموشی اور طمانیت مسلّط تھی۔ اونچے اونچے مینار خلا کو جیسے للکار رہے تھے!

جامعہ کی فصیل کے ساتھ ساتھ سرسبز قطعوں میں جگہ جگہ سُرخ عُنابی زرد اور گلابی رنگ کے پھول کھلے مہک رہے تھے اور شبنم آلود گھاس کے چوکور قطعے آنکھوں میں تراوٹ اور تازگی حلول کرتے لگ رہے تھے۔ موتی نے بدن میں ایک جھرجھری سی محسوس کی۔ پھر آگے بڑھ کر عمارت کے عقبی حصہ میں پہنچ گیا جہاں سائے لمبوترے ہو گئے تھے اور مسجد کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہوئی سڑک پر تازہ چھڑکاؤ ہُوا تھا۔

مسجد کے سامنے گذرتی ہوئی اس سڑک پر سُرخ بجری بچھی ہوئی تھی اور سڑک کے کنارے، باڑھ کے ساتھ ساتھ کالی مرچ کے بانجھ درختوں کی قطار لگی ہوئی تھی۔ کالی مرچ کے ان بانجھ درختوں کے سائے چھڑکاؤ کی ہوئی سڑک پر یوں بیٹھے ہوئے تھے جیسے ٹھنگنی عورتیں اکڑوں بیٹھی اپنے اپنے بچوں کو دودھ پلا رہی ہوں!
دائیں جانب اونچے نیچے بے ترتیب گھاس کا کافی کشادہ چوکور قطعہ پھیلا ہوا تھا۔ جس کے ایک کنارے پر لیموؤں کی قطار تھی اور پھر اس کے مغرب میں باڑھ کے ساتھ ساتھ چند سرو اور سفیدے کے درخت عجب بہار دکھا رہے تھے۔ کتنے خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو یہاں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ وہ سوچنے لگا۔ آہ! کیسا سکوت، کس قدر تازگی اور کتنی گمبھیرتا ہے اس ماحول میں!
کاش! وہ اپنی عمرِ رفتہ کو آواز دے سکتا۔ اٹھارہ سال قبل جب

وہ محض سترہ بر س کا کھلنڈرا نوجوان تھا، فوج میں بھرتی ہونے کے بجائے اس ادارے کی طرف نکل آتا۔ اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری لیکن تب حالات مختلف تھے۔ جن دور افتادہ پہاڑوں کا وہ باشندہ تھا۔ وہاں تعلیمی وسائل بے حد محدود تھے۔ اور غربت نے اسے تعلیم ادھوری چھوڑ کر فوج میں بھرتی ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ اٹھارہ سالہ فوجی ملازمت کے بعد آج وہ اپنی کنپٹیوں کے سفید بالوں کے ساتھ اس جامعہ میں ایک ملازم کی حیثیت سے داخل ہو رہا تھا۔ خوش آئند زندگی کے خواب دیکھتے دیکھتے، اچانک جب اسے ہوش آیا تو معلوم ہُوا، اس نے اب تک کچھ بھی نہ پایا تھا، البتہ فوج کے ضابطوں پابندیوں اور جگہ جگہ روک ٹوک نے اس کے ذہن کو کسی حد تک احساس کمتری میں مبتلا کر دیا تھا اور احساس کمتری کا پانا، سب کچھ کھونے کے مترادف تھا۔ اس لئے اٹھارہ سال کے بعد جو پہلا موقع اسے ملا، اس نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور وہ چند مہینے گردن اکڑا اکڑا کر گلی کوچوں اور بازاروں میں آزادانہ گھومنے پھرنے لگا۔ گو اس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ دوبارہ ملازمت کا نام نہ لے گا لیکن!

چند ہی مہینوں کی بیکاری نے اس کے کس بل نکال دیئے تھے اور وہ دوبارہ ملازمت کی جستجو میں مارا مارا پھرنے لگا۔ اخبار کے ایک اشتہار کی بدولت آج وہ اس جامعہ میں ایک محاسب کی حیثیت سے شامل ہو رہا تھا۔ بھلا ہو فوج کا جس نے اسے حساب کتاب کے چند

گُر سکھا دیئے تھے، ورنہ سفید بالوں کی کون قدر کرتا ہے۔ عجیب بات تھی جب سے اس کے بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی تھی، اس کے چہرے سے وقار، سنجیدگی اور تمکنت ٹپکنے لگی تھی، شاید اسی وجہ سے اس کے انتخاب میں کوئی رکاوٹ یا دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا۔ پہلے کی نسبت اس کے قدردان بھی بڑھ گئے تھے۔ اب لوگ اس کی باتیں غور سے سنا کرتے اور اس کے ساتھی، اس کی عزت و احترام میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے۔ لیکن اس کے باوجود دل ہی دل میں وہ اب بھی اپنے آپ کو وہی کھلنڈرا اور نوعمر نوجوان سمجھتا تھا، جو آج سے اٹھارہ برس پیشتر تھا۔ اور شاید اسی لئے کبھی کبھی اس کے منہ سے بے وقوفی کی باتیں بھی نکل جاتیں جنہیں وہ بعد میں بڑی شدت سے محسوس کیا کرتا۔

مسجد سے ملحقہ دفتر سے ایک چپڑاسی ہاتھ میں جھاڑن لئے ہوئے نمودار ہوا۔ ہوسٹی لپک کر اس کے پاس پہنچ گیا۔

"دیکھئے! ڈاکٹر صاحب کا مطب کہاں ہے؟" اس نے جیب سے سگریٹ کی ڈبیہ نکالتے ہوئے چپڑاسی سے دریافت کیا۔

"وہ سامنے لوہے کے پھاٹک کے قریب ایک تنگ سی گلی سیدھے مطب کو جاتی ہے۔ لیکن ابھی تو صرف سات ہی بجے ہیں۔ ڈاکٹر ساڑھے آٹھ بجے سے پہلے نہیں آتا"، چپڑاسی نے جھاڑن کی گرد جھاڑتے ہوئے جواب دیا۔

بھائیں بھائیں کرتی ہوئی عمارتوں اور دفتروں سے ہوتا ہوا۔ وہ آہنی پھاٹک سے نکل کر اس تنگ گلی میں داخل ہوا جہاں ڈاکٹر کا مطب واقع تھا۔ لیکن اس

وقت وہاں ایک بھی متنفس موجود نہ تھا۔ چاروں طرف خاموشی اور سکوت طاری تھا۔ موسٰی مطب کے برآمدے میں ایک بینچ پر بیٹھ گیا، اور پھر خیالوں کے تانے بانے بننے لگا۔

"اباجی! میرے لئے سائیکل ضرور لانا" یہ اس کے بچے کی فرمائش تھی جو پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا۔

"اور میرے لئے سفید لباس والی گڑیا" یہ اس کی چھوٹی بچی کی فرمائش تھی لیکن اس کی منجھلی آٹھ سالہ بچی نے کوئی فرمائش نہیں کی تھی۔ وہ رات کو چپ چاپ اس کے کندھے سے ٹیک لگائے مغموم بیٹھی رہی تھی۔ شاید وہ سوچ رہی تھی۔ اس کا عمر بھر کا مسافر باپ جانے پھر کب لوٹے۔ موسٰی نے بینچ پر بیٹھے بیٹھے ایک سرد آہ بھری اور بینچ کی پشت پر سر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔ وہ ان کھلونوں کی قدر نہ کرسکا۔ شاید بے کاری نے اس کا دماغ مفلوج کر دیا تھا۔ وہ بات بے بات ان معصوم بچوں پر برسا کرتا تھا۔ اور یہ بچے دن بھر سہمے سہمے رہتے۔ موسٰی کف افسوس ملنے لگا۔ اس کا دل موم کی طرح پگھل گیا اور جی چاہا اسے پر لگ جائیں، وہ اڑ کر بچوں کے پاس پہنچ جائے اور ایک ایک کو زور زور سے سینے سے بھینچے، پھر ان کے گالوں کو چومے جن پر اکثر اس کی بھاری اور کھردری انگلیوں کے سُرخ نشان پڑ جایا کرتے تھے۔

"یہ ضروری نہیں کہ دنیا میں ہر شخص کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہو" اس نے سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر ہتھیلیوں میں ٹھوڑی جما کر ایک ٹک سامنے والی دیوار کو تکتے ہوئے سوچنے لگا۔

"لیکن یہ بھی کیا کہ انسان اپنے بچوں کی چھوٹی چھوٹی فرمائشیں بھی پوری نہ کر سکے۔
شاید یہ ملازمت پہلی ملازمت سے بہتر ثابت ہو"
سورج کی کرنیں برآمدے میں داخل ہو گئی تھیں اور اس کے پیروں کو چھو رہی تھیں۔ رفتہ رفتہ خنکی کا احساس زائل ہو رہا تھا اور تمازت بڑھتی جا رہی تھی۔
آٹھ بجے مطب کا چپڑاسی آیا اور دروازے کھڑکیاں کھول کر جھاڑ پونچھ میں مصروف ہو گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ادارے کے دیگر ملازمین کی چہل پہل بھی شروع ہو گئی۔ چند ایک بیمار ملازم برآمدے میں آکر بینچوں پر بیٹھ گئے اور آپس میں باتیں کرنے لگے۔ اپنی باری پر تقرر نامہ ہاتھ میں لیئے موسٰی ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہوا۔ سلام کے جواب میں ڈاکٹر نے اسے سٹول پر بیٹھنے کا اشارہ کیا جو اس کے قریب ہی پڑا تھا، اور پھر اپنے کاغذات میں محو ہو گیا۔ پانچ منٹ بعد ڈاکٹر نے نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور دریافت کیا۔
"فرمائیے۔ آپ کو کیا تکلیف ہے۔؟"
"میں طبی معائنے کے لیئے حاضر ہوا ہوں" موسٰی نے تقرری کے کاغذات ڈاکٹر کے سامنے رکھتے ہوئے جواب دیا۔
"او۔ آئی سی۔ تو پھر آپ قمیص اتار کر اس پلنگ پر لیٹ جائیے"
ڈاکٹر نے اس گدیلوں والے پلنگ کی طرف اشارہ کیا جو کونے میں بچھا ہوا تھا اور جس کا ایک ٹوٹا سپرنگ نیچے کی طرف جھول رہا تھا۔ موسٰی نے بنیان اور قمیص اتاری اور ابھی وہ پلنگ پر لیٹنے ہی والا تھا کہ ساڑھی پہنے ایک بھاری بھرکم خاتون ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہوئی اور موسٰی کو ادھ ننگا دیکھ کر الٹے قدموں

واپس چلی گئی۔ ڈاکٹر نے موسٰی کے پیٹ اور سینے کا معائنہ کیا اور پھر ایک کاغذ پر کچھ لکھ کر موسٰی سے مخاطب ہوا۔

"یہ چِٹ دوسرے کمرے میں کمپونڈر کو دے دیں اور کل پھر آئیں"

موسٰی نے کپڑے پہنے اور باہر نکل آیا۔ وہی بھاری بھرکم خاتون باہر برآمدے میں ٹہل رہی تھی۔ موسٰی نے ایک اچٹتی نگاہ اس پر ڈالی اور کمپاؤنڈر کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ چِٹ پڑھ کر کمپونڈر نے ایک پیشاب دانی اس کے حوالے کی اور وہ پیشاب خانے کی تلاش میں نکل گیا۔

تھوڑی دیر بوتل میں اپنا ہی پیشاب لئے وہ دوبارہ کمپونڈر کے پاس گیا۔

"اب آپ کل اسی وقت آئیں" کمپونڈر نے اس کے پیشاب کو بڑے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ موسٰی مطب سے باہر نکل کر سوچنے لگا کہ اب وہ کہاں جائے۔ جامعہ کے احاطے میں خاصی رونق اور چہل پہل تھی۔ طلباء کے علاوہ طالبات کثیر تعداد میں ادھر ادھر گھوم پھر رہی تھیں۔ رنگین ملبوسات کی سرسراہٹ اور طالبات کے بالوں سے اٹھتی ہوئی مہک سے وہ بار بار چونک اٹھتا اور پھر اپنی گہری سوچ اور فکروں میں ڈوب ڈوب جاتا۔ کتنی بے فکری تھی یہاں! وہ سوچنے لگا۔ ہر ایک کے چہرے سے لگن اور حصولِ تعلیم کی جستجو ٹپک رہی تھی۔ اعلٰی مقاصد اور اعلٰی مستقبل کے سہانے خوابوں میں کھوئے ہوئے طالب علموں کے غول کے غول ادھر ادھر گھوم پھر رہے تھے۔

بینک کے سامنے لڑکوں اور لڑکیوں کی الگ الگ قطاریں کھڑی تھیں جو

غالباً اپنی اپنی فیسیں جمع کرنے اکٹھے ہوئے تھے۔ دوسری جانب کچھ لڑکیاں جالی دار نوٹس بورڈ پر مختلف ہدایات پڑھنے میں محو تھیں، کچھ لڑکے محض لڑکیوں کو دیکھنے یونہی بے مقصد آ جا رہے تھے۔ ہوسٹی سب سے الگ تھلگ ایک طرف کھڑا جامعہ کی اس گہما گہمی سے محظوظ ہو رہا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ اس نے چہرے پہچاننے شروع کئے۔ ابھی ابھی جو لڑکی اس کے سامنے سمٹی سمٹائی، لجاتی اور شرماتی گذر گئی تھی، وہ غالباً اس جامعہ میں پہلی مرتبہ داخلہ لے رہی تھی۔ اور دوسری لڑکی جس کے سنہری بال شانوں پر پھیلے ہوئے تھے اور جس کے ہونٹوں پر سدا بہار مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور جو لڑکوں سے بڑی بے باکی اور بے تکلفی سے باتیں کر رہی تھی، جامعہ میں دو ایک سال گذار چکی تھی۔ اس کے علاوہ چند حسین چہرے ایسے بھی تھے جن سے غرور و تکبر اور بے نیازی ٹپک رہی تھی یہ غالباً آخری سال کی طالبات تھیں۔ اور بہت اونچی ہواؤں میں اڑ رہی تھیں۔ سفید گاؤن پہنے ہوئے یہ لڑکیاں یوں لگتی تھیں جیسے دنیا کو پیروں تلے کچلنے کا مصمم ارادہ رکھتی ہوں۔ جیسے جامعہ کے باہر ان کا پہلا قدم ہی دنیا کے لئے ایٹم بم ثابت ہو گا۔

"ہونہہ!" وہ سوچنے لگا۔ "کتنی لغو سی بات ہے کہ دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے یہ نام نہاد ڈگریاں انتہائی لازمی ہیں۔ یہی ڈگریاں بہت سے لوگ بعض اوقات محض دولت اور جاہ و حشمت کے بل بوتے پر حاصل کر لیتے ہیں مگر زندگی بھر کبھی اپنے آپ کو ان ڈگریوں کے اہل ثابت نہیں کر پاتے۔" ہوسٹی نے اونچی ہواؤں میں اڑنے والی ان لڑکیوں پر طائرانہ نگاہ ڈالی اور پھر

منہ پھیر کر سامنے کالی مرچ کے ان بانجھ درختوں کی جانب بڑھنے لگا جہاں ایک لڑکا اور دو لڑکیاں مصوری کی مشق کر رہی تھیں۔

قریب ہی ایک مزدور ٹوکرا سر پر دھرے اور پھاوڑا ہاتھ میں لئے کھڑا تھا وہ بار بار پہلو بدل رہا تھا جیسے تھک گیا ہو۔ لیکن اسے اپنی جگہ سے ہلنے کی اجازت نہ تھی۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے اور گلے کی بوسیدہ قمیض پسینے میں شرابور ہو رہی تھی۔

مصوروں کے برش بڑی سرعت اور تیزی سے مزدور کو کینوس پر اتار رہے تھے۔ عقب میں جامعہ کے مینار ہلکے ہلکے رنگوں میں ابھر رہے تھے۔ اور مزدور ان میناروں کی للکار سے بے خبر ٹوکرا اور پھاوڑا لئے چند ٹکے کمانے کی فکر میں کبھی ایک اور کبھی دوسرے پاؤں پر جھک جاتا۔ موسیٰ سوچنے لگا۔ کاش! یہ مصور اس مزدور کا رُخ موڑ دیں اور اسے مینار دیکھنے پر مجبور کر دیں۔ آخر وہ کب تک اندھیرے میں بھٹکتا رہے گا؟

احاطے سے بھیڑ چھٹ چکی تھی۔ غالباً طلباء اور طالبات اپنی اپنی جماعتوں میں چلی گئی تھیں۔ مصوّر بدستور اپنے کام میں مصروف تھے پھر وہ بھی تھک گئے اور گھاس کے قطعے پر بیٹھ کر آپس میں باتیں کرنے لگے۔ ان سے کچھ فاصلے پر مزدور ٹوکرا اور پھاوڑا ایک طرف رکھ کر سستا رہا تھا۔

موسیٰ جامعہ سے باہر نکل آیا۔ اور بے مقصد قریبی بازار میں سیر گشت کرنے لگا۔ وہ اس شہر میں نو وارد تھا۔ اب اس نے یہی مناسب سمجھا کہ اس ہوٹل کا رُخ کرے جہاں پچھلی رات اس نے قیام کیا تھا۔ لیکن ابھی اس نے چند قدم ہی بڑھائے

تھے کہ ایک پرانے دوست بخت جمال سے ملاقات ہوگئی۔

تین چار سال پیشتر بخت جمال گھر سے بھاگ کر اس شہر میں پناہ گزیں ہوا تھا جن دگرگوں حالات سے وہ اپنے وطن میں دوچار ہوا تھا ان کا تقاضہ یہی تھا کہ وہ ہجرت کرلے۔ حالات جو اس کی ہیجانی طبیعت اور جذباتی رجحان کے پیدا کردہ تھے۔ ایسی فولادی دیوار کی طرح اس کے سامنے تن گئے تھے کہ جن سے وہ ٹکر لیتا تو خود اپنا سر پھوڑتا۔ لہٰذا ایک رات جب اس کے بہن بھائی اور ماں سو رہی تھی۔ وہ دبے پاؤں گھر سے نکلا، اور پھر واپس نہ گیا۔ آج اچانک دونوں کی ملاقات ہوگئی تھی۔ دونوں دوست گلے ملے اور دونوں کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"یہاں خوش ہو؟" موسیٰ نے بخت جمال کے دل کو ٹٹولا۔

"بس گذر رہی ہے" بخت جمال نے آنکھیں چراتے جواب دیا "میں بڑا بے شرم ہوں جو اب تک جی رہا ہوں۔ اچھا یہ بتاؤ۔ کیسے آنا ہوا۔؟"

بخت جمال نے موسیٰ کی طرف دیکھا۔ اور زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔

"مجھے جامعہ میں ملازمت مل گئی ہے۔ کل شام کو یہاں پہنچا ہوں" موسیٰ نے بخت جمال کے چہرے کا جائزہ لیتے جواب دیا۔ بخت جمال کبھی بڑا خوبصورت اور صحت مند نوجوان ہوا کرتا تھا۔ اب تو اس کے چہرے پر دھول جمی ہوئی لگ رہی تھی۔ جیسے برسوں کا مریض ہو۔

"کہیں قیام کا انتظام ہے؟" بخت جمال نے موسیٰ کا ہاتھ پکڑ لیا اور دونوں ساتھ ساتھ بڑھنے لگے۔

"فی الحال تو ہوٹل میں مقیم ہوں اور طبی معائنے کے چکر میں ہوں۔ اس کے بعد کہیں مستقل ٹھکانے کے متعلق سوچوں گا۔ سنا ہے رہائشی مکانات کی یہاں بڑی قلت ہے۔" موسیٰ کو اچانک اپنے بچے یاد آگئے اور وہ سوچنے لگا۔ اگر کوئی اچھا سا اور سستا مکان مل گیا تو وہ بچوں کو بھی یہاں لے آئے گا۔

"مکان کی فکر نہ کرو۔ رہنے کو میرے پاس جگہ موجود ہے اور پھر میرے ہوتے ہوئے تم کسی اور ٹھکانے کے بارے میں سوچو بھی نہیں۔ میں تنہا ہوں اور پریشان بھی۔ مجھے تمہاری اشد ضرورت ہے۔" بخت جمال نے موسیٰ کی طرف یوں دیکھا جیسے اس سے بھیک مانگ رہا ہو۔ اس کی یاس بھری آنکھوں نے وہ سب کچھ اُگل دیا۔ جسے اس کی زبان ادا کرنے سے قاصر تھی اور موسیٰ کو اپنے دوست کی خواہش کے احترام میں سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ دونوں پہلے ہوٹل گئے موسیٰ نے اپنا سامان سمیٹا۔ کرایہ ادا کیا اور پھر دونوں تانگے میں بیٹھ کر بخت جمال کے ٹھکانے کی طرف روانہ ہوئے۔

تانگے میں بیٹھے دونوں دوست اپنے اپنے ماضی میں کھو گئے۔ جانے بخت جمال کیا سوچ رہا تھا۔ لیکن موسیٰ اس وقت اپنے دوست بخت جمال ہی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ جس کی زندگی حادثات سے پُر تھی۔ اور پھر آخری حادثہ اس کے لئے اتنا جانکاہ ثابت ہُوا کہ اسے گھر بار چھوڑ کر اس شہر میں پناہ لینا پڑی تھی۔

"کاش! میں خودکشی کرسکتا؟" بخت جمال نے سکوت توڑا۔ اور ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"خودکشی انسان کا عظیم کارنامہ ہے۔ میرے دوست! گوئٹے نے بھی یہی کہا تھا۔ لیکن دنیا میں زندہ رہنا بھی اپنی جگہ ایک عظیم کارنامہ ہے"۔ موسیٰ نے جواب دیا۔

"لعنت بھیجو ایسی زندگی پر جس میں انسان قدم قدم پر دُکھ ہی دُکھ جھیلے۔ اور مسرت کا نشان تک نہ ملے"۔

"تم جسے مسرّت کہتے ہو وہ لمحاتی ہے۔ حقیقی مسرّت کی جستجو تم نے کبھی کی ہی نہیں"۔

سچ کہتا ہوں۔ اگر وہ لڑکی تمہیں مل جاتی تو مسرت اپنی موت آپ مر جاتی دوست! انسان کبھی بھی قانع نہیں ہُوا۔ میری طرف دیکھو۔ جب میں فوج میں ملازم تھا۔ تو اپنے آپ کو غلام در غلام محسوس کرتا تھا۔ اور یہی خواہش ہمہ وقت میرے اعصاب پر مسلّط رہتی کہ کاش! میں اپنی زندگی کا ایک صرف ایک دن آزادانہ طور پر بسر کر سکوں۔ پھر جب وہ دن آیا تو میں نے اپنے آپ کو دوسرے قسم کے حالات میں جکڑا ہُوا پایا اور اپنا ماضی یعنی وہی قواعد وضوابط والی غلامانہ زندگی مجھے شاندار دکھائی دی۔ اور آج آزادانہ زندگی بسر کرنے کی آرزو کا گلا گھونٹ کر دوبارہ ملازمت اختیار کرنے یہاں چلا آیا ہوں۔ انسان محتاج ہے۔ میرے دوست! بے حد محتاج۔ قدم قدم پر نت نئے حادثوں کے لئے نئے سہاروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ انسان وہ ہے جو ہر قسم کے حالات کا مردانہ وار مقابلہ کر سکے۔ فرار بزدلی کا دوسرا نام ہے"۔

موسٰی نے کہنے کو تو یہ سب کچھ کہہ دیا لیکن خود اسے بھی اپنے آپ سے اتفاق نہ تھا۔ بعض لوگوں کی زندگی ایسے ایسے بھیانک اور ہولناک حادثات سے پُر ہوتی ہے کہ ان کا مقابلہ ناممکن ہی ہوتا ہے اور فرار ہی ان کا واحد حل ہوتا ہے۔

وسیع سڑکوں اور چوراہوں کو پیچھے چھوڑتا ہوا ان کا تانگہ ایک پُل کے نیچے گذر رہا تھا جس کے اوپر چھکا چھک، چھکا چھک کرتی ریل گاڑی کالے سیاہ دھوئیں کے بادل اڑاتی بھاگ رہی تھی۔

"وقت بھی کتنی تیزی سے گذر جاتا ہے"۔ بخت جمال نے ریل گاڑی کی طرف دیکھتے کہا جس کی رفتار اور بڑھ گئی تھی۔

"اور انسان کے ارادے دھوئیں کی طرح ہوا میں تحلیل ہوتے رہتے ہیں۔ وقت انسان کو دکھ بھی دیتا ہے اور زخموں پہ پھاہا بھی رکھتا ہے"۔

"ہاں۔ لیکن انسان جب کبھی پیچھے پلٹ کر دیکھتا ہے تو جو روحانی خوشی اسے اس وقت محسوس ہوتی ہے وہ دنیا کی تمام خوشیوں پر بھاری ہے۔ انسان کا ماضی دراصل روشنی کا وہ مینار ہے جو انسان کو آگے بڑھنے کا راستہ دکھاتا ہے"۔ موسٰی نے جذباتی انداز میں برجستہ جواب دیا۔ مگر بخت جمال کو اس سے اتفاق نہ تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ بیتے لمحے کبھی بھی روشنی کے مینار نہیں ہوئے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اب تک اندھیرے میں نہ بھٹک رہا ہوتا۔

"میرے لئے تو ماضی ایک جہنم کدہ بن کر رہ گیا ہے۔ جب سے یہاں آیا ہوں برابر سلگ رہا ہوں۔ اور ایک دن راکھ میں تبدیل ہو جاؤں گا

بخت جمال قنوطیت کا شکار تھا۔ اس کے لئے ماضی، حال اور مستقبل سب برابر تھے۔ اس لئے وہ موسیٰ کی ہر منطق ہر دلیل اور ہر خیال کو رد کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اور جب موسیٰ نے اپنی آخری دلیل پیش کی کہ

"ہر ایک انسان کا ماضی ایک درسگاہ ہے۔ بشرطیکہ وہ خلوصِ نیت سے اپنے ماضی کا مطالعہ کرے"

تو بخت جمال جھنجھلا اٹھا۔

"خاک ڈالو ماضی اور اس کی درسگاہ پر۔ سامنے دیکھو۔ بس سٹاپ پر حسیناؤں کا جھرمٹ ہے۔ ادھر دیکھو یہ جو ہمارے قریب بس گذر رہی ہے۔ کتنی خوبصورت ہے کہ اس میں میری بستی کی تمام حسینائیں صبح شام سفر کرتی ہیں۔ صبح صبح طالبات کی جو بھیڑ ہوتی ہے اور خوشبوؤں کے جو جھونکے اس بس میں اڑتے ہیں انسان کا دماغ ماؤف کر دینے کے لئے کافی ہیں۔ ماضی سے پیچھا چھڑانے کے لئے میں ہر صبح اسی بس میں سفر کیا کرتا ہوں۔"

بس تانگے سے آگے نکل گئی اور بس سٹاپ پر رک گئی۔ جہاں طالبات کا ایک اور گروہ اُن کا انتظار کر رہا تھا۔ طالبات ایک دوسرے سے چمٹی ہوئی بس میں داخل ہو گئیں۔ ابھی تانگہ سٹاپ تک پہنچا ہی تھا کہ بس ہارن بجاتی دوبارہ چل پڑی۔ موسیٰ نے دیکھا کہ بخت جمال بس میں کھڑی ایک لڑکی کو گھور گھور کر دیکھ رہا ہے۔

"تمہاری روح پراگندہ ہو رہی ہے۔ ایسے دھوڑ ڈالو" موسیٰ نے سنجیدگی سے

بخت جمال کو مشورہ دیا۔ اور بخت جمال کھکھلا کر ہنس پڑا۔

"کچھ دن یہاں رہو گے میرے دوست! تو تم بھی میری ہی طرح سوچنے لگو گے۔ اور ہر وقت بیہودہ تصورات میں کھوئے رہو گے پھر ایک دن میری طرح تم بھی کنگال ہو جاؤ گے"۔

"میں اسے نہیں مانتا" موسیٰ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ "اپنے کردار پر پہرہ لگانا اپنے ہی بس کی بات ہے۔ جو لوگ ثابت قدم ہوتے ہیں، دنیا ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی"۔

اس بستی کا نام جہانگیر آباد تھا جس کی ایک تنگ سی مگر پختہ گلی میں ان کا تانگہ ایک جھٹکے کے ساتھ رک گیا تھا۔ شہر سے پانچ چھ میل دور شمال میں یہ ایک نئی آبادی عالم وجود میں آرہی تھی۔ جس کا پس منظر دیہاتی تھا مگر عمارتیں جدید طرز کی تعمیر ہو رہی تھیں۔ چند سو گز کے فاصلے پر ایک کارخانے کی چمنیوں سے گاڑھا دھواں اٹھ رہا تھا اور حدِ نظر تک ہریالی ہی ہریالی دکھائی دے رہی تھی۔ جس مکان کے سامنے ان کا تانگہ رک گیا تھا اس کا رنگ زردی مائل تھا۔ موسیٰ نے تانگے سے اترتے ہوئے اپنے دوست بخت جمال کی طرف دیکھا۔ ہلدی کی طرح زرد رنگ تھا اس کا کتنا کمزور ہو گیا ہے بے چارا! اس نے اپنے دل میں سوچا۔ اس کے ہونٹوں پہ پپڑیاں جمی ہوئی تھیں اور آنکھوں سے ویرانی جھانک رہی تھی۔ پچھلے چند سالوں سے وہ متواتر جذبات کے دھارے پر ایک تنکے کی طرح بہہ رہا تھا۔ جو چیز انسان کے اختیار سے باہر ہو اسے حاصل کرنے کی سعی نہیں کرنی چاہیئے۔ اور یہی اس کی زندگی کی سب سے بڑی بھول تھی۔

بخت جمال کے پاس دو کمرے تھے جن کا وہ پچاس روپے ماہوار کرایہ ادا کرتا تھا۔ بغیر چھت کے غسلخانے میں دستی نل لگا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ایک کمرہ اور بھی تھا جسے مالکِ مکان نے تالا لگایا ہوا تھا۔ مالکِ مکان خفیہ پولیس میں ملازم تھا۔ مہینے دو مہینے بعد کبھی کبھی اچانک آدھمکتا اور بخت جمال کے سکون کو درہم برہم کر دیتا۔ بخت جمال نے مکان میں قدم رکھتے ہی مالکِ مکان کے اس دخل در معقولات کا رونا شروع کیا۔

"کھانا پکانے کا کیا انتظام ہے؟" موسیٰ نے ایک خالی چارپائی پر اپنا بستر لگاتے ہوئے بخت جمال سے پوچھا۔

"سالن خود پکاتا ہوں" بخت جمال نے ہنس کر کہا "اور روٹیاں تنور سے لگواتا ہوں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ تنور والی کی جوان بیٹی سے عشق بھی کرتا ہوں۔ لڑکی ہے تو سانولے رنگ کی مگر بالکل تنور کی خمیری روٹی کی طرح نرم گرم ہے۔"

موسیٰ کو ہنسی آگئی۔ کتنی تیزی سے وہ اپنا ماضی بھلا رہا تھا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ اپنا ماضی نہ بھول سکنے کا شکوہ کر رہا تھا اور اب وہ ایک نئی دنیا بسانے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ ماضی کے کھنڈر پر جو نیا محل تعمیر ہوتا ہے اس میں کتنی جاذبیت ہوتی ہے۔ انسان اپنا آپ اور اپنا ماضی بھول جانے پر کتنا قادر ہے۔

بخت جمال کمرے سے باہر آگیا تھا اور اونچے برآمدے کے ستون سے ٹیک لگا کر پھر کہیں کھو گیا تھا۔ موسیٰ نے بستر پر سفید چادر

بجھائی اور دبے پاؤں باہر آکر اپنے دوست کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔
بخت جمال نے ایک پاؤں قینچی کی طرح دوسرے پاؤں پر دھرا ہوا تھا اور آنکھیں موند رکھی تھیں۔ آہٹ پا کر اس نے چونک کر موسلی کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔

"تنہائی نے میرے حواس گم کر دیئے ہیں۔ اور میں نفسیاتی مریض بن کر رہ گیا ہوں" بے چارا فلسفی سپے نوزا! جو زندگی بھر تنہائی کا شکار رہا۔ میں سمجھتا ہوں۔ اس کا فلسفہ ادھورا رہ گیا ہے۔ اس کا تخیل تنہائی کے سمندر کو پاٹنے میں بالکل ناکام رہا ہے۔ اور یہی اس کے فلسفے کی ناکامی کی دلیل ہے۔ تنہائی وہ وحشت ہے جس میں ویرانیوں کا راج ہوتا ہے اور ویرانہ آباد کرنے کے لئے دوست کا وجود اہم کردار ادا کرتا ہے۔ تمہارے یہاں رہنے سے شاید میں سدھر جاؤں" بخت جمال نے پھر آنکھیں موند لیں اور ستون کو اپنی باہوں میں جکڑ لیا۔

"اس شہر میں رہتے ہوئے آج تک کسی معیاری لڑکی نے میری طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ اب میں تنور والی لڑکی سے عشق نہ لڑاؤں تو اور کیا کروں؟ جس لڑکی کی خاطر میں گھر بار چھوڑ چکا ہوں میں سمجھتا ہوں۔ وہ بھی مجھ سے محبت نہیں کرتی تھی۔ میں ہی اسے والہانہ چاہتا رہا ہوں۔ کاش! کوئی لڑکی مجھے معشوق سمجھ کر پیار کرتی۔ میں بار بار روٹھتا اور وہ مجھے بار بار مناتی۔ ہائے! یہ حسرت لئے میں قبر میں ابدی نیند سو جاؤں گا۔ کوئی لاکھ جتن کرے مگر شکست

خوردگی کے احساس سے اپنے تئیں پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔"

"کبھی گھر کا بھی خیال آتا ہے؟" موسٰی نے بخت جمال کے ماضی کو پھر کریدنا چاہا جس کے لئے بخت جمال بالکل تیار نہ تھا۔ اس غیر متوقع سوال سے بخت جمال بوکھلا اٹھا۔ اور ایک جست لگا کر اونچے برآمدے کو عبور کر کے چھوٹے سے صحن کی نمدار مٹی کو اپنے بھاری بوٹوں تلے روندنے لگا۔ رفتہ رفتہ اس پر اضطراری کیفیت طاری ہونے لگی۔

"میرا کوئی گھر نہیں۔ میرا کوئی وطن نہیں۔" ٹہلتے ٹہلتے اچانک قدم روک کر بخت جمال نے موسٰی کو مخاطب کیا۔ جیسے ماضی کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی موجوں پر وہ ایک بے وزن، کمزور اور حقیر تنکے کی طرح بہہ گیا ہو۔ اس کے متضاد خیالات اور متضاد باتیں ہی اس کی شکست کے مترادف تھیں۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اور وہ ہونٹ کاٹنے لگا۔

"وطن بھی ــــ وطن کیا ہے بس ایک احساس ہے جو پیدائش سے لے کر موت تک ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ ہمارے اعصاب پر ایک بھاری سل کی طرح سوار رہتا ہے۔" بخت جمال نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

"میں نے ساری زندگی اس مٹی کو پوجا۔ جس کی گود میں میں نے آنکھیں کھولیں۔ پتھروں اور چٹانوں سے محبّت کی۔ گھر کی چار دیواری کو اپنے آپ سے، اپنی زندگی سے عزیز سمجھا۔ اور وہ میرے بھائی، میری بہنیں اور

میرے ماں باپ انہوں نے میرے لئے کیا کیا؟ میری محبت کے تابوت میں آخری کیل گاڑنے والی خود میری چچازاد بہن تھی۔ وہ حاسد تھی۔ میری محبت کو پھلتا پھولتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اب میں ساری زندگی انگاروں پر لوٹتا رہوں گا۔ میں نے بڑی محنت اور کاوش سے اپنے ماضی کی وہ تمام کرچیاں نوچ ڈالی تھیں جو ایک دراز عرصے سے میرے سینے میں پیوست ہو کر مجھے بے کل رکھتی تھیں۔ تم نے ماضی کی راکھ کرید کر اچھا نہیں کیا۔ کیا اس کی شادی ہو گئی؟"

بخت جمال نے آخر کار اپنی شکست تسلیم کر لی تھی اور اب وہ ماضی کے صحرا کی خاک چھاننے پر رضامند ہو گیا تھا۔

"شادی؟۔ کس کی شادی؟؟" موسیٰ بخت جمال کے اس اچانک سوال سے خود بوکھلا اٹھا تھا۔ اور سوچ سمجھ کر جواب دینے کی مہلت چاہتا تھا۔

"اسی حرماں نصیب کی شادی! جو میری محبت کا دم بھرتی تھی"۔

بخت جمال نے برآمدے کے فرش کے ایک کنارے پر بیٹھ کر پاؤں لٹکا کر جواب دیا۔ اور موسیٰ کے لئے اب کوئی چارہ نہ تھا۔ بجز سب کچھ اگلنے کے

"ہاں اسکی شادی ہو گئی تھی۔ موسیٰ اس کے قریب فرش پر بیٹھ کر پاؤں جھلاتا گویا ہوا۔

"تمہارے گھر سے بھاگ جانے کے کچھ عرصہ بعد اس کی شادی ہو گئی تھی"!

اب موسیٰ میں مزید کچھ بتانے کا یارا نہ رہا۔ اس کا دماغ خود ماضی کی آماجگاہ بن گیا۔ اسے وہ منظر یاد آیا جب وہ اپنے دوست کی قریب المرگ محبوبہ کو چارپائی پر ڈالے دوسرے لوگوں کے ساتھ ہسپتال لے جا رہا تھا۔ کتنی تکلیف میں تھی بے چاری! کیسی بے طرح کراہ رہی تھی۔ موسیٰ نے بخت جمال کو ایک ثانیے کے لئے گھورا۔ جیسے اسکی موت کی ذمہ داری اسی پر عائد ہوتی ہو۔

بخت جمال نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

"مجھے تو اب وہ بالکل بھول چکی ہوگی۔ کیا وہ خوش ہے؟"

"ہاں بہت خوش!" موسیٰ نے ایک بار اور اپنے دوست کو گھور کر دیکھتے جواب دیا "اسے مصیبتوں اور طعن و تشنیع سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھٹکارا مل گیا ہے۔"

موسیٰ کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے سینے میں ٹیسیں اٹھ رہی ہوں۔ کتنی دردناک تھی بیچاری کی موت! وہ سوچنے لگا۔ بظاہر تو وہ ایک حادثہ کا شکار ہوئی تھی۔

"کیا مطلب؟" بخت جمال نے متحیر ہو کر پوچھا۔ اس کی آنکھیں سکڑ کر آہستہ آہستہ پھیلنے لگیں۔ "کیا اس نے خودکشی کر لی تھی؟" بخت جمال نے موسیٰ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ شدت احساس سے اس کے ہونٹوں کے کنارے لرزنے لگے۔

"نہیں۔ اس نے خودکشی نہیں کی تھی اور پھر خودکشی کرتی بھی کیوں؟ تم نے کونسا وفاداری کا ثبوت دیا؟" موسیٰ کو اچانک غصہ آگیا تھا جسے پینے کی وہ ناکام کوشش کر رہا تھا۔

"اس کا خاوند بندوق صاف کر رہا تھا کہ اچانک ایک دھماکہ ہوا۔ اس کی بیوی سامنے بیٹھی بچے کو کھلا رہی تھی گولی سیدھی اس کی پیٹھ میں لگی اور سینے کے پار اتر گئی۔ ہم نے اسے ہسپتال پہنچایا لیکن وہ جانبر نہ ہو سکی۔"

یہ سن کر بخت جمال کچھ دیر تو بیٹھا موسیٰ کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا جیسے اسے اس کی باتوں پر یقین نہ آرہا ہو۔ پھر اس نے جھولتے ہوئے پاؤں سمیٹے اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور اپنے پیچھے کنڈی چڑھا لی۔

صبح جب موسیٰ جامعہ کے مطب میں داخل ہُوا تو کمپونڈر نے بڑی سرد مہری کا ثبوت دیا۔

"آپ کو ذیابیطس کی شکایت ہے" کمپونڈر نے اس کی طرف دیکھے بغیر مایوس کن لہجے میں کہا اور موسیٰ کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے بھئی! میں تو حال ہی میں فوجی ملازمت سے سبکدوش ہُوا ہوں۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا فوج میں میرا طبی معائنہ ہوا تھا۔ مجھے ایسی کوئی شکایت نہیں" موسیٰ نے حواس پر قابو پاتے ہوئے ایک بار اور کوشش کی۔ مگر کمپونڈر پر اس کا کوئی اثر نہ ہُوا۔

"میں کیا کر سکتا ہوں جناب!۔ بیماری کے آثار ظاہر ہو چکے ہیں" اب کمپونڈر نے اپنی عیارانہ اور مکارانہ نگاہیں اوپر اٹھائیں اور موسیٰ کو یوں محسوس ہُوا جیسے اس کی نگاہیں کوئی مطالبہ کر رہی ہوں۔

"یہ دیکھئے!" کمپونڈر نے پیشاب بھری بوتل الماری سے اٹھا کر موسیٰ کو

دکھاتے ہوئے کہا۔ "میں نے اپنا شک دُور کرنے کے لئے آپ کا پیشاب تین مرتبہ جانچا ہے۔ لیکن ہر بار ایک ہی نتیجہ برآمد ہوا۔ مجھے افسوس ہے۔ بے حد افسوس!" کمپونڈر نے بوتل واپس الماری میں رکھی اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ موسیٰ نے اس کی طرف نفرت سے دیکھا اور باہر نکل آیا۔ پھر اسے یوں محسوس ہُوا جیسے وہ واقعی کسی انجانی بیماری میں مبتلا ہو گیا ہے۔ اس نے خالی، خالی نگاہوں سے اپنے پیچھے بند ہوتے ہوئے جالی دار دروازے کی طرف دیکھا اور برآمدے کے ستون سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

"آپ کا طبی معائنہ ہو گیا؟" مطب کے ٹھنگنے قد اور بے ڈھنگی چال کے چپڑاسی نے وہاں سے گذرتے، موسیٰ کو گہری سوچوں میں ڈوبے ہوئے دیکھ کر اس سے دریافت کیا۔

"نہیں! کمپونڈر کہہ رہا تھا مجھے ذیابیطس کی شکایت ہے" موسیٰ نے پتلون کی جیب سے سگریٹ کی ڈبیہ اور ماچس نکالتے جواب دیا۔

"خدا رحم کرے۔ خدا رحم کرے" چپڑاسی نے بغل میں دبائے ایکسرے کے کاغذات ہاتھ میں لئے اور پھر ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں تبدیل کرتے اظہارِ افسوس کیا۔ اور نگاہ نیچی کئے ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہی چپڑاسی پھر اس کے قریب گذرا۔

"میری ایک بات سنو!" چپڑاسی نے سائیکل سٹینڈ کی طرف جاتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ سائیکل سٹینڈ کے پاس کھڑے ڈاکٹر کے سکوٹر کی جھاڑ پونچھ کرتے ہوئے چپڑاسی نے ایک مرتبہ اور موسیٰ کی طرف دیکھا اور اسے اشارے سے اپنی جانب

بڑھایا۔ موسیٰ تھکے تھکے اور نڈھال قدموں سے چپڑاسی کی طرف بڑھا۔

"کمپونڈر اچھا آدمی ہے۔ مگر بے چارا میری طرح عیال دار ہے۔ قرض خواہ اسے روز پریشان کرتے ہیں"، چپڑاسی نے سکوٹر صاف کرتے اس کی طرف دیکھے بغیر رُک رُک کر کہا۔

"مطلب کی بات کرو"، موسیٰ نے جھنجھلا کر اسے ڈانٹا۔ کتنے کمینے ہیں یہ لوگ جو محض چند ٹکوں کی خاطر کسی کے مستقبل سے کھیلنے میں بھی عار محسوس نہیں کرتے۔ موسیٰ سوچنے لگا۔ کم از کم فوج میں تو ایسی بددیانتیاں نہیں ہوا کرتیں۔ پھر اسے اپنی ترقی کا واقعہ یاد آیا اور دل ہی دل میں کڑھنے لگا۔ بادلِ ناخواستہ موسیٰ نے جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکالا اور چپڑاسی کی طرف بڑھایا۔

"یہ کمپونڈر کو دے دینا"

چپڑاسی گردوپیش دیکھ کر نوٹ پر جھپٹا اور پھر اسے جیب میں ٹھونستے ہوئے کہنے لگا۔

"میرے بچے کی سکول کی ٹوپی کہیں کھو گئی ہے۔ ماسٹر اسے روز مارتا ہے آج میرے پاس دو روپے تھے جن کا میں نے آٹا خرید لیا ہے"۔ چپڑاسی نے موسیٰ کی طرف للچائی نگاہوں سے دیکھتے گریۂ مسکین بن کر اپنے لئے کچھ رقم اینٹھنی چاہی۔

موسیٰ نے جیب سے دو روپے اور نکالے اور چپڑاسی کو دیتے ہوئے سوچنے لگا۔ کیا مصیبت ہے۔ انسان صرف اپنی ہی مصیبتوں پر نگاہ رکھتا ہے دوسروں کے دکھ اور مصیبتیں نظر ہی نہیں آتیں"۔

"اچھا! اب مہربانی کر کے اور وقت ضائع نہ کرو۔" موسٹی نے سگریٹ کے ٹکڑے کو پیروں تلے مسلتے چپڑاسی کو ڈانٹا۔

"بے فکر رہو بابو جی! سمجھو۔ تمہارا کام ہو گیا" چپڑاسی نے سکوٹر کی صفائی چھوڑتے۔ ذرا پیچھے ہٹ کر اسے ناقدانہ نگاہوں سے دیکھتے موسٹی کو جواب دیا اور پھر اپنی صفائی سے مطمئن ہو کر جھاڑن کو دو ایک جھٹکے دیئے اور بے ڈھنگی چال سے ڈسپنسری کی طرف لپکا۔ موسٹی نے تھوڑی سی دیر چپڑاسی کا انتظار کیا۔ لیکن جب وہ لوٹ کر نہ آیا تو موسٹی بھی لمبے لمبے ڈگ بھرتا ڈسپنسری کی جانب چل پڑا۔ ہر بڑے آدمی کی طرح اس کے دل میں یہ شک بار بار سر اٹھاتا رہا کہ چھوٹے آدمی یعنی چپڑاسی نے کہیں اسے دھوکہ نہ دے دیا ہو۔ لیکن جب ڈسپنسری میں موسٹی نے چپڑاسی کو کمپونڈر سے باتیں کرتے دیکھا تو اس کی تسلی ہو گئی۔

کچھ دیر بعد کمپونڈر ہاتھ میں وہی بوتل لئے باہر آیا اور مسکرا کر موسٹی کو مخاطب کیا۔

"آپ کے لئے مجھے جھوٹ بولنا پڑے گا۔" کمپونڈر نے چرب زبانی سے کام لیا۔

"لیکن میں آپ کو اب بھی مشورہ دوں گا کہ آپ اپنا علاج ضرور کروائیں۔ یہ ایک ایسا روگ ہے جس سے انسان برف کی قاش کی طرح آہستہ آہستہ پگھلتا ہے اور پھر ایک دن ۔ وہ ۔ وہ ۔ خیر ۔ آپ میرے ساتھ آئیے تاکہ میں آپ کی موجودگی میں ڈاکٹر صاحب کو بتا دوں کہ آپ بالکل تندرست ہیں۔"

کمپونڈر ڈاکٹر کے کمرے کا جالی دار دروازہ کھول کر اندر داخل ہُوا اور موسیٰ برآمدے میں کھڑا اس کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔

"اندر آئیے نا!" کمپونڈر نے تھوڑی ہی دیر بعد دروازے سے باہر جھانک کے موسیٰ سے کہا۔ موسیٰ دھڑکتے دل سے اندر داخل ہُوا۔

ڈاکٹر موسیٰ کے کاغذات پر دستخط کر رہے تھے۔ اس کے سامنے دبلی کل والی فربہ خاتون بیٹھی تھیں۔ جس کی نظر والی عینک اس کے چہرے پہ بالکل نہیں جچ رہی تھی۔ اس کے سانولے رنگ اور سیاہ ہونٹوں پر جمی ہوئی پپڑیاں اس بات کی غمازی کر رہی تھیں کہ وہ کسی مہلک بیماری میں مبتلا ہے۔

ڈاکٹر نے کاغذات پر دستخط کر کے موسیٰ کی طرف بڑھا دیئے اور پھر سامنے بیٹھی خاتون سے مخاطب ہُوا۔

"یہ صاحب آپ کے دفتر کے نئے محاسب ہیں۔ ان کا تقرر آج ہی ہُوا ہے۔" موسیٰ نے خاتون کو سلام کیا۔ اور پھر وہیں کھڑے ڈاکٹر کے دیئے ہوئے کاغذات پڑھنے لگا۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں کمپونڈر نے رشوت لینے کے باوجود کسی نام نہاد بیماری کی شکایت نہ کر دی ہو۔ لیکن ایسی کوئی بات نہ تھی۔ موسیٰ نے مطمئن ہو کر کاغذات تہہ کئے اور اپنی جیب میں ٹھونستے ہوئے ڈاکٹر سے دریافت کیا۔

"معاف کیجئے ڈاکٹر صاحب! میں اس شہر میں نووارد ہوں۔ اور میں نہیں جانتا۔ اب مجھے کہاں جانا چاہیئے؟"

"یہاں سے چھ سات میل دور جامعہ کی نئی عمارتیں تعمیر ہو رہی ہیں۔ آپ وہاں

جائیں اور کسی سے پوچھ لیں"۔ ڈاکٹر نے ایک ایکسرے کا پرنٹ اٹھا کر دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ شہر بہت وسیع اور گنجان آباد ہے۔ خیال رہے کہیں آپ گم نہ ہو جائیں"۔ ڈاکٹر نے مسکرا کر خاتون کی طرف دیکھا۔

خاتون بھی جواب میں مسکرا دی اور پھر اپنی عینک اتار کر ساڑھی کے پلو سے صاف کرتی ہوئی موسیٰ کی طرف دیکھا۔

"میں وہیں جا رہی ہوں۔ میں آپ کو لے چلوں گی" پھر وہ ڈاکٹر سے مخاطب ہوئی۔

"اچھا تو ڈاکٹر صاحب! میں جاؤں؟ — کل دوبارہ آنے کی ضرورت ہے؟"

"ہاں کیوں نہیں۔ مس امتیاز! — ابھی تو تین انجکشن اور لگیں گے۔ اس کے علاوہ میں چاہتا ہوں آپ کا خون بھی ٹیسٹ کر لوں۔ کل آپ دس بجے تشریف لائیے گا"۔ ڈاکٹر نے ایکسرے کی تصویر روشنی کی مدد سے جانچتے ہوئے، خاتون کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

"ڈاکٹر صاحب! — میں روزانہ آٹھ میل کا سفر طے کر کے یہاں آتی ہوں۔ کتنا پٹرول خرچ ہو جاتا ہے۔ آپ میرا کوئی ایسا علاج کریں کہ بار بار نہ آنا پڑے" مس امتیاز نے میز پر سے پرس اٹھا کر جھلاتے ہوئے کہا۔ اور پھر موسیٰ کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور ڈاکٹر کے کمرے سے باہر نکل گئی۔ موسیٰ اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ کتنی بے ڈھنگی چال تھی اس کی! جیسے کچھوا رینگ رہا ہو۔

موسیٰ نے اپنے دل میں سوچا۔ پھر وہ قدم تیز کر کے اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

"ہمارے ناظم آپ کا بڑی شدت سے انتظار کر رہے ہیں۔ آج بھی

صبح ہی صبح انہوں نے پہلا کام یہی کیا تھا کہ صدر دفتر کو آپ کی آمد کے سلسلے میں ٹیلیفون کیا تھا" جامعہ کے بڑے دروازے سے نکل کر اپنی کار کی طرف بڑھتے مس امتیاز اس سے مخاطب ہوئی۔ باہر سڑک کے کنارے اس کی چھوٹی سی نیلے رنگ کی موٹر کھڑی تھی۔

"میں تو کل ہی پہنچ گیا تھا۔ لیکن طبی معائنے میں پھنسا ہوا تھا" موسیٰ نے اپنی صفائی پیش کی۔

"ہاں۔ یہ ایک چکر ہی ہے۔ دو سال پیشتر جب میں اس تحقیقی ادارے میں شامل ہوئی تھی۔ تو یہ پاپڑ مجھے بھی بیلنے پڑے تھے" مس امتیاز نے موٹر کا دروازہ کھول کر اپنی نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "آپ دوسری طرف سے آجائیے"

موسیٰ نے دوسری طرف والا دروازہ کھولا اور اگلی نشست پر مس امتیاز کے قریب سکڑ سمٹ کر بیٹھ گیا۔ مس امتیاز کے بھاری بھرکم جسم نے نشست کے تین چوتھائی حصے پر قبضہ کر رکھا تھا۔

"عورت کے لئے موٹاپا بھی ایک عذاب ہے" موسیٰ نے مس امتیاز کے سراپا پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالتے ہوئے سوچا، بے ڈھنگی چال، بھدی صورت اور بے ڈول جسم۔ ایسی عورتیں اکثر اعلیٰ تعلیم حاصل کر لیتی ہیں تاکہ شعوری طور پر اپنا آپ بھلائے رکھیں جب کبھی وہ اپنے گریبان میں جھانکتی ہیں تو آنسو بہانے لگتی ہیں۔ اپنی نام نہاد ڈگریوں سے وہ مردوں کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

موٹر چوڑی اور شفاف سڑک پر یوں بہہ رہی تھی جیسے سیلاب

کا پہلا ریلا کسی تنگ سی گلی میں داخل ہو گیا ہو۔ لیکن یہ سلسلہ بہت جلد ختم ہو گیا۔ اب موٹر ایک پُر رونق اور پُر ہجوم سڑک پر بار بار ہارن بجاتی دوڑ رہی تھی۔ ٹیکسیوں، رکشاؤں اور بسوں کو پیچھے چھوڑتی یہ چھوٹی سی گاڑی بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔

موٹر چلاتے چلاتے مس انتیاز کا بایاں ہاتھ سٹیرنگ وہیل سے پھسل کر نادانستہ بائیں ران پر آگیا۔ اور وہ بدستور سامنے دیکھتی ایک ہاتھ سے سٹیرنگ وہیل گھماتی، اپنی ران کھجلانے لگی۔ موسٰی نے منہ پھیر لیا اور کھڑکی کے شیشے سے باہر دیکھنے لگا جہاں درخت، عمارتیں اور راہ گیر سب پیچھے کی طرف بھاگ رہے تھے۔

ایک ہی نظر میں موسٰی نے اندازہ لگا لیا کہ مس انتیاز کا ہاتھ انوکھی وضع کا تھا۔ اوپر کی جلد کھردری، موٹی اور بھدّی تھی۔ چھوٹی مربع شما انگلیاں کی گانٹھیں ہموار تھیں اور انگوٹھا چھوٹی ساخت کا تھا۔

موسٰی نے اپنے نامکمل علمِ دست شناسی سے اندازہ لگایا۔ یہ لڑکی مادہ پرست معلوم ہوتی ہے۔ ضدّی اور پست ذہنیت کی مالک ہے۔ ہو سکتا ہے کنجوس نہ ہو لیکن دولت جمع کرنے کی ہوس ضرور رکھتی ہے۔

اس کی موٹی موٹی آنکھیں یوں لگتا تھا جیسے شب بیداری کی عادی ہوں۔ اور ہونٹوں پر جمی ہوئی پپڑیاں اس بات کی غمازی کر رہی تھیں کہ وہ بے سکونی اور بے اطمینانی کی شکار ہے۔

"پیپ - پیپ - پیپیم پیپپ" مس امتیاز نے ہارن بجا کر اور بریک استعمال کر کے ایک چھوٹے سے بچے کو خبردار کیا جو سڑک کی ایک جانب سے اچانک نکل کر بھاگتے ہوئے سڑک پار کرنے کی کوشش میں عین کار کی زد میں آ کر بوکھلا گیا تھا۔ بچہ الٹے قدموں سرپٹ بھاگا اور سڑک کے کنارے کھڑی ایک دیہاتی عورت سے لپٹ گیا۔ مس امتیاز نے بریک ڈھیلے چھوڑ دیئے اور کار پھر ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

"بچے خدا کی بڑی پیاری اور بے ضرر مخلوق ہے" مس امتیاز نے موسٰی کی سفید کنپٹیوں کی طرف دیکھا اور مسکرا کر کہا۔ پھر وہ سٹیرنگ پر انگلیوں سے کھیلنے لگی۔

"ہاں!" موسٰی کی آواز مدھم تھی۔ شاید مس امتیاز نے سنی بھی نہ ہو۔ موسٰی کو اچانک اپنی آٹھ سالہ بچی یاد آ گئی۔ جو ہر وقت چپ چپ اور کھوئی کھوئی رہتی تھی۔ اس نے یہ چپ کیوں سادھ رکھی ہے؟ وہ سوچنے لگا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ سمجھتی ہو۔ میں دوسرے بچوں کی نسبت اس سے کم پیار کرتا ہوں پھر اس نے اپنے ضمیر کا جائزہ لیا۔ اور وہ تلملا کر رہ گیا۔ کتنی بیہودہ تھی یہ بات جو اس نے بچی کی پیدائش کے موقع پر سوچی تھی۔ جب تک میاں بیوی کا ایک دوسرے پر مکمل اعتماد نہ ہو، نباہ ہو ہی نہیں سکتا۔ مرد تو قدم قدم پر لغزشیں کرتے ہیں اور بیویاں سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی خاموشی سے برداشت کر لیتی ہیں

لیکن برعکس اس کے مرد ہمیشہ شک و شبہہ میں مبتلا ہو کر بیویوں کی زندگی حرام کر دیتے ہیں۔ بے چاری بیویاں بے زبان گایوں کی طرح سر اٹھا کر بڑتک نہیں دیکھتیں کہ ان کے مرد دوسری گایوں کے پیچھے کیوں مارے مارے پھرتے ہیں؟

اب کار ایک وسیع میدان کے بیچوں بیچ سیاہ اور تنگ سی سڑک پر بڑھ رہی تھی۔ دائیں جانب مرمریں عمارتوں کا لامتناہی سلسلہ تھا۔ اور دوسری جانب قریب ہی ایک بڑے رولر والا انجن سیاہ گاڑھا دھواں چھوڑتا آہستہ آہستہ رینگ رہا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر محنت مزدوری کرنے والے خانہ بدوشوں کی جھگیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ اور پھر دور تا حدِ نگاہ خشک اور بنجر زمین پھیلی ہوئی تھی۔

"اب آپ نئے جامعہ میں داخل ہو رہے ہیں۔ وہ سامنے ہمارا دفتر ہے" مس انتیا نے دائیں جانب دو منزلہ عمارت کی طرف اشارہ کیا۔ جو سب سے الگ تھلگ نمایاں طور پر دکھائی دے رہی تھی۔ اور جس کے سامنے والے حصے پر نیلے رنگ کے چوکور تختے سے جڑے ہوئے لگ رہے تھے۔

"عمارت کی دوسری منزل میں ہمارا دفتر واقع ہے۔ عقب میں ایک وسیع جنگل پھیلا ہوا ہے۔ جو کیکر، ببری۔ اور کہیں کہیں زیتون کے درختوں سے اٹا پڑا ہے۔ شام کو سیکڑوں پرندے اس جنگل میں

بسیرا کرنے آتے ہیں۔ ان کی چیں چیں، کاغ کاغ ایسی مسلسل چہکار مجھے اتنی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ کہ شام کو جب دفتر کا عملہ چھٹی کر کے چلا جاتا ہے۔ تو میں غروبِ آفتاب کے وقت کھڑی اس مسلسل چہچہاہٹ سے لطف اندوز ہوتی ہوں۔ تب میں بھول جاتی ہوں میں کون ہوں اور کہاں کھڑی ہوں۔ اچانک دفتر کا چوکیدار اپنا بھاری لٹھ لئے دفتر کے کمرے بند کرنے کے لئے آ دھمکتا ہے اور مجھے چونکا دیتا ہے۔ آپ کو بچوں کا شور اچھا لگتا ہے یا بُرا؟" مس امتیاز نے عمارت کے قریب پہنچ کر، سیدھی سڑک پر اچانک ایک موڑ مڑتے، کار کو برآمدے کے قریب کھڑی کرتے، اپنی لمبی گفتگو کی تان توڑی۔ اور موسٰی سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ جانے مس امتیاز اس سے کیا پوچھ رہی تھی۔ موسٰی کو بالکل یاد نہ رہا اور کھسیانا ہو کر ہنسنے لگا۔

"آپ کو غالباً بچے اچھے نہیں لگتے" مس امتیاز موٹر کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئیں۔ اور موسٰی کو یاد آیا۔ وہ بچوں کے متعلق کچھ کہہ رہی تھیں۔

"بچے جب آپس میں کھیلتے ہیں تو اچھے لگتے ہیں لیکن جب وہ ماں باپ کو اپنی کھیل کا ہدف بنانا چاہتے ہیں تو پریشانی کا موجب بنتے ہیں" موسٰی بھی کار سے اتر پڑا اور مس امتیاز کے ساتھ ساتھ دفتر کی جانب بڑھنے لگا۔

"مجھے تو کھیلتے بچے بڑے پیارے لگتے ہیں۔ جی چاہتا ہے۔ میں بھی ان کے ساتھ کھیلوں" مس امتیاز نے ساڑھی کو کندھوں پہ درست کرتے اور پھر اپنے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"لیکن ہمارے اتنے بڑے گھر میں ایک بھی بچہ نہیں"

ہوا اچانک تیز ہوگئی تھی۔ مس امتیاز کے خشک بالوں سے ایک آوارہ لٹ ہوا میں اڑ اڑ کر اس کی پیشانی اور گالوں پر بکھر رہی تھی۔ اس کے کھردرے بالوں میں کہیں کہیں ایک آدھ سفید بال، چاندی ایسا چمک کر پھر کالے بالوں میں روپوش ہو جاتا۔ موسیٰ نے سوچا۔ اس نے مس امتیاز کے متعلق شاید غلط اندازہ لگایا تھا۔ وہ مادہ پرست لڑکی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ تخیلات کے پرستار مادہ پرست نہیں ہوا کرتے۔ اور نہ ہی وہ دولت کو کبھی اہمیت دیتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ یہ موٹی سی، سانولی سی لڑکی بڑی حساس واقع ہوئی ہے۔

"یہ فنونِ لطیفہ کا شعبہ ہے۔ یہاں جدید مصوری اور تجریدی آرٹ کا درس دیا جاتا ہے۔" مس امتیاز نے برآمدے میں دائیں جانب بڑے بڑے شیشوں والے کمروں کی طرف اشارہ کیا۔ جن کے سامنے ایک اور برآمدے میں طالبات نے اپنی تخلیقات آویزاں کر رکھی تھیں۔ اور چند لڑکیاں اس وقت کھڑی ان تخلیقات کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں۔

"شعبۂ فنونِ لطیفہ کی ناظمہ مجھ سے دوہرے بدن کی خاتون ہیں۔ جب وہ زمین پر قدم رکھتی ہیں تو زمین ہل جاتی ہے۔" مس امتیاز نے اپنے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے ہنس کر کہا۔ "ان کی ناک پر ہر وقت عینک چڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ لیکن جب وہ لکھتی ہیں۔ پڑھتی ہیں یا کسی طالبہ کی تازہ تخلیق کا جائزہ لیتی ہیں۔ تو عینک اتار دیتی ہیں۔ اگر آپ نے کسی طالبہ کی کسی تازہ تخلیق کو سراہا تو پانچ منٹ میں پانچ مرتبہ آپ کو چائے پلائیں گی۔"

اوپر کی منزل کی طرف جاتی ہوئی سیڑھیوں پر مس امتیاز تھوڑی دیر کیلئے

رک گئیں۔

"وہ سامنے علم نباتات کا شعبہ ہے۔ اور اس سے ورے عمرانیات کا مضمون پڑھایا جاتا ہے۔ اور یہ سیڑھیاں جہاں ختم ہوتی ہیں۔ وہاں سے ہمارے شعبے کے دفاتر شروع ہوتے ہیں۔" چند ایک سیڑھیاں طے کر کے مس امتیاز رک کے ہوسٹل کے معلومات میں کوئی نہ کوئی اضافہ کرتی آگے بڑھتیں۔

"ہمارے شعبے میں پہلا کمرہ کلرکوں کا ہے۔ پھر آپ کا، اس کے بعد میرا اور پھر میری سہیلی مس ہارڈن کا ہے۔ مس ہارڈن آج کل تپ دق پر تحقیق کر رہی ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اس تحقیق سے ہمارے ملک کو بڑا فائدہ پہنچے گا۔"

سیڑھیاں عبور کر کے دوسری منزل پر پہلے کمرے سے گزرتے ہوئے مس امتیاز نے بڑے بڑے چوکور شیشوں سے صاف دکھائی دیتے ہوئے ایک کلرک کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ صاحب حال ہی میں سعودی عرب سے وارد ہوئے ہیں۔ اچھے کلرک ہیں۔ مگر دماغ ذرا بگڑا ہوا ہے۔ پانچ سال سعودی عرب میں گذار کر کیا آئے ہیں کہ ناک پہ مکھی بھی بیٹھنے نہیں دیتے۔ کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتے ادھر چار بج گئے۔ ادھر آپ سیٹی بجاتے گنگناتے کھٹ کھٹ کرتے سیڑھیوں سے اتر گئے۔ جیسے غسل نہانے جائیں گے۔ پن سوزکر اتنا تیز سکوٹر چلائیں گے کہ جیسے سکوٹر کی دوڑ میں کوئی بازی لگا رکھی ہو۔"

مس ہارڈن اپنے دفتر میں بیٹھی کام کر رہی تھی۔ ہوسٹل کے ساتھ ہو آئے ہیں گذرتے ہوئے مس امتیاز نے مس ہارڈن کے دفتر کے شیشے پر دو چار ضرب

دستک دی اور جب مس ہارون اس کی طرف متوجہ ہوئی تو مس امتیاز مسکراتی آگے بڑھ گئی۔

موسٰی نے دور سے مس ہارون کی ایک جھلک دیکھی۔ خاصی جاذب نظر ہے۔ اس نے سوچا۔

"امتیاز!۔ امتیاز!!" مس ہارون نے اپنے دفتر سے مس امتیاز کو پکارنا شروع کیا۔ مگر مس امتیاز مسکراتی ہوئی آگے بڑھتی گئی۔ مس ہارون اپنے دفتر سے باہر نکل آئی اور مس امتیاز موسٰی سے معذرت کر کے واپس لوٹی اور پھر دونوں مس ہارون کے دفتر میں نہ جانے کس بات پر قہقہے لگا رہی تھیں۔

موسٰی وہیں کھڑا مس امتیاز کا انتظار کرنے لگا۔ "اگر مجھے ناظم کا دفتر معلوم ہوتا تو میں اپنے آپ ہی وہاں جاکر اپنے تقرری کے کاغذات پیش کر دیتا۔" موسٰی کھڑا کھڑا سوچنے لگا۔ خاصی دیر ہو گئی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ تقرری کے کاغذات آج بارہ بجے سے پہلے داخل دفتر ہو جاتے تاکہ وہ آج کی تنخواہ کا حقدار ہو سکتا۔

کچھ دیر بعد مس امتیاز۔ مس ہارون کے دفتر سے نمودار ہوئی اور موسٰی کو اشارے سے بلایا۔ موسٰی مس امتیاز کے پیچھے پیچھے مس ہارون کے دفتر میں داخل ہوا۔

"یہ ہمارے نئے محاسب ہیں رسٹر ـــ" مس امتیاز نے موسٰی کا تعارف مس ہارون سے کرانا چاہا۔ لیکن شائد وہ اب تک موسٰی کا نام نہیں جانتی تھی۔ اور پھر بڑے لوگوں کو ضرورت ہی کیا پیش آتی ہے کہ وہ چھوٹے لوگوں کے نام جاننے کی کوشش کریں۔ نام جانے بغیر بھی وہ اپنا گذارہ کر لیتے ہیں۔

"مجھے موسٰی کہتے ہیں۔ خوشی ہوئی آپ سے مل کر،" موسٰی نے مس ہارون

سے اپنا تعارف خود کر لیا۔ مس ہارون نے اس کی طرف دیکھا اور محض مسکرا دی اس نے اپنے تعارف کی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔ اور موسٰی جز بز ہو کر رہ گیا

"مسٹر موسٰی مجھے ڈاکٹر کے مطب میں اتفاقاً مل گئے تھے۔ انہیں ہمارے دفتر کا محل وقوع معلوم نہ تھا۔ میں انہیں اپنے ساتھ لے آئی ہوں" مس امتیاز نے کہا

"خدائی خدمت گار جو ٹھہریں آپ" مس ہارون نے مس امتیاز پر فقرہ چست کیا اور دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

"ہاں یاد آیا" مس ہارون نے اچانک سنجیدہ ہو کر مس امتیاز کو مخاطب کیا۔ "آپ کو ناظم صاحب دو چار مرتبہ پوچھ چکے ہیں"

"وہیں تو جا رہی ہوں۔ تب تک تم چائے منگواؤ۔ میں مسٹر موسٰی کو ناظم صاحب کے حوالے کر کے ابھی آتی ہوں" مس امتیاز نے جواب دیا۔ اور پھر موسٰی سے مخاطب ہوئیں۔

"چلیئے موسٰی صاحب! پہلے میں آپ کو ناظم صاحب سے ملا دوں۔ اور اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں"

"چائے تو میں پی چکی ہوں" مس ہارون نے مداخلت کرتے مس امتیاز سے کہا۔

"میں نے تمہارا دو گھنٹے انتظار کیا۔ اب تم اپنے لئے چائے خود منگواؤ"

"ہائے۔ ہائے۔ ہارون! اتنی کنجوسی نہ دکھاؤ" مس امتیاز نے احتجاج کیا۔ لیکن مس ہارون اپنی بات پر اڑی رہیں۔

"میں کیا کرتی۔ مجھے بھوک لگی ہوئی تھی۔ میں نے تو اچھا خاصا ناشتہ کر لیا ہے"

اب تمہارا کوئی کب تک انتظار کرتا۔ نہ جانے سارا دن تم دفتر سے باہر کیا کرتی رہتی ہو؟"
مس ہارون نے اس کے احتجاج کو رد کرتے جواب دیا۔

"مجھ سے پوچھو میں نے کہاں کہاں کے چکر لگائے ہیں" مس امتیاز نے اپنی صفائی پیش کی۔

"آج میں نے تین لائبریریاں چھانیں۔ اور اپنے پراجیکٹ کے لئے فہرستیں تیار کیں"

"اور وہ انکل (چچا) کے پاس کون بیٹھا ہوا گپیں ہانک رہا تھا؟"۔ مس ہارون نے ہنس کر اعتراض کیا۔

"ہائے۔ توبہ توبہ۔ جھوٹوں کی سردار!۔ قسم لے لو جو میں نے انکل کے دفتر میں قدم بھی رکھا ہو" مس امتیاز نے مصنوعی غصہ دکھاتے، مس ہارون پر حملہ کیا۔

"اچھا۔ اچھا۔ اب زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ پہلے انہیں ناظم صاحب کے پاس لے چلو کتنے دنوں سے ناظم صاحب محاسب کا انتظار کر رہے ہیں۔ سب حساب کتاب نامکمل پڑا ہے سابق محاسب کے بھاگ جانے سے وہ بے حد پریشان ہیں"

مس ہارون نے مس امتیاز کو ڈانٹا۔ اور مس امتیاز جلدی میں میز پر پڑے مس ہارون کے پرس کو اٹھا کر چلنے لگی۔

"میرا پرس اٹھا لیے ہے امتیاز" مس ہارون کی آواز نے اس کا تعاقب کیا۔
مس امتیاز دروازے سے پلٹ آئی اور معذرت کر کے مس ہارون کے

پرس کو اپنے پرس سے بدل کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے پیچھے موسیٰ بھی نکل آیا۔ اور وہ دونوں پھر طویل برآمدے ہی ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

"یہ کمرہ مسٹر جبار کا ہے۔ جبار صاحب ہمارے شعبے کے سب سے پرانے کارکن ہیں۔ بس اللہ میاں کی گائے ہیں۔ اور یہ دوسرا کمرہ۔ جہاں رنگ برنگے پردے لٹک رہے ہیں۔ یہ مس تلخلخہ کا دفتر ہے۔ نام تو ان کا مس مخدوم خلجی ہے مگر تلخلخہ کے نام سے اکثر یاد کی جاتی ہیں۔ جب سے امریکہ سے لوٹ کر آئی ہیں۔ بے چاری آدھا تیتر آدھا بٹیر بن کر رہ گئی ہیں۔ اب تک اپنے آپکو اس ماحول میں ڈھال نہیں سکیں۔ کوئی ان سے پوچھے۔ امریکی گندم کھانے والے اس کے لئے امریکی پنیر کہاں سے لائیں۔ اس لئے بطور احتجاج انہوں نے چائے میں دودھ اور شکر کا استعمال ترک کر رکھا ہے" مس امتیاز نے دیگر کارکنوں کے متعلق بڑے بھونڈے انداز میں فقرے چست کئے جنہیں موسیٰ محسوس کئے بنا نہ رہ سکا۔

کمروں کی یہ رد ختم ہوئی تو مس امتیاز اوپر جانے والی سیڑھیوں کے نیچے محراب سے گذر کر دائیں جانب مڑ گئیں اور دو ایک کمرے چھوڑ کر ایک کمرے کا دروازہ کھٹکھٹائے بغیر، کھول کر اندر داخل ہو گئیں۔ موسیٰ باہر کھڑا رہ گیا۔

"آیئے! موسیٰ صاحب! اندر تشریف لے آئیے" ایک ثانیئے بعد ہی مس امتیاز کمرے سے باہر جھانکیں اور موسیٰ کو اندر آنے کی دعوت دی۔

یہ ایک کافی کشادہ، اور آراستہ و پیراستہ کمرہ تھا۔ فرش پہ دری اور اس کے اوپر ایک خوب صورت غالیچہ بچھا ہوا تھا۔ ایک بڑی سی میز کے پیچھے

ٹائی بہ فرہبی ناظم صاحب تشریف فرما تھے۔ ان کے سیاہی مائل گول مول چہرے پہ سے اگر عینک اتار دی جاتی تو ان پر چور بازاری کے دھندے والے سیٹھ کا آسانی سے گمان کیا جا سکتا تھا۔ بہت دنوں بعد یہ انکشاف ہوا تھا کہ ناظم صاحب انگلینڈ اور امریکہ ہر دو ممالک سے پی ایچ ڈی کی ڈگریاں لے کر اپنے ملک لوٹے ہیں۔ ان ڈگریوں کے باوجود ناظم کو متانت اور سنجیدگی چھو کر بھی نہیں گذری تھی۔ بات بے بات قہقہے لگانا ان کی عادتِ ثانیہ بن گئی تھی۔ جب وہ ہنستے تو ان کی باہر نکلی ہوئی توند بھونچال کی زد میں آجاتی۔ اور وہ ایک ہونق سیٹھ سے کسی صورت کم دکھائی نہ دیتے۔ اس پر طرہ یہ کہ جہاں ہنسنے کا مقام ہوتا، وہ رونی صورت بنا کر یوں چپ سادھ لیتے جیسے انہیں سانپ نے سونگھ لیا ہو۔ اور جب کوئی مصیبت زدہ مسکین صورت لئے ان کے سامنے اپنا دکھڑا بیان کرنے لگتا تو وہ زور زور سے قہقہے لگانے شروع کر دیتے جیسے کسی کی مصیبت ان کے لئے عین راحت ہو یا خوشی و انبساط کا پیغام ہو۔

"ہاہاہا" کسی سنجیدہ اور متین محفل میں ان کے قہقہے بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک بن کر ان کے حلق سے یوں نکلتے جیسے کسی نے اچانک ایک ساتھ کئی پھلجھڑیوں کو آگ دکھا دی ہو۔ اور اُن کے بے موقع قہقہوں سے محفل پر سناٹا چھا جاتا۔ اور گم سُم ہو کر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگتے۔ رفتہ رفتہ سٹاف میں گھل مل کر موسیٰ کو یہ جان کر بے حد قلق ہوا کہ ناظم برائے نام ناظم ہیں۔ وہ اپنی شخصیت اور وقار کھو چکے ہیں۔ دفتر کا ڈسپلن تہس نہس ہو چکا ہے اور ہر ایک اپنی من مانی کرتا پھرتا ہے۔ خصوصاً مس ہا مدن ناظم صاحب

کی کمزوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے آپ کو نائب ناظم سمجھتیں اور عملے کے دیگر اراکین کو اکثر پریشان کرتی رہتیں۔ کوئی جرأت نہ کر سکا کہ اس کے اس ناجائز رویّے کے خلاف آواز اٹھا سکتا۔ اس کے علاوہ ناظم اور مس ہارون کے متعلق طرح طرح کی افواہیں اور بے پر کیاں اڑ رہی تھیں مگر ناظم کے کان پر جوں تک نہ رینگتی۔

"بیٹھئے مسٹر موسیٰ!" ناظم صاحب نے پہلے موسیٰ سے ہاتھ ملایا اور پھر سامنے پڑی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے موسیٰ کو مخاطب کیا۔ موسیٰ نے پہلے تقرری اور طبی معائنے کے کاغذات ناظم صاحب کے سامنے رکھے اور پھر خاموشی سے کرسی پر بیٹھ کر ناظم صاحب کے مزید احکامات کا انتظار کرنے لگا۔

ناظم نے اپنی عینک اتاری اور سامنے دھرے موسیٰ کے تقرری کے کاغذات پر رکھتے گویا ہُوا۔

"مسٹر موسیٰ! پچھلے سے پچھلے مہینے میں ڈھاکہ گیا تھا۔ میرے سفر خرچ کا بل پہلے محاسب نے بنایا تو تھا۔ لیکن نہ معلوم کہاں کھو گیا" پھر ناظم صاحب کی تیوری پر بلاوجہ بل پڑ گئے۔ جیب سے رومال نکال کر ناک صاف کرتے ہوئے انہوں نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔

"دقّت یہ ہے کہ مجھے دن رات کام کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے میرا حافظہ بے حد کمزور ہو گیا ہے۔ اب وہ پہلی سی بات کہاں رہی۔ اہاہا ہا۔ (قہقہہ) مس امتیاز آپ بھی بیٹھئے نا!۔ ہاہاہا ___ آج تو آپ سارا دن غیر حاضر رہیں۔ مس ہارون اگر چائے کے لئے نہ پوچھتیں تو مجھے بالکل یاد ہی نہ رہتا۔ میں نے

آپ کی غیر حاضری لگا دی ہے۔ ہاں۔ ہاہاہا۔ اور پھر آج اسکرین بھی ختم ہو گئی ہے۔ دیکھئے نا۔ جب میں گھر سے آ رہا تھا۔ تو میں نے اپنی نوٹ بک میں صبح تک سارا خرچہ نوٹ کر لیا تھا۔ لیکن دفتر آ کر جب حساب کرتا ہوں۔ تو ایک روپے والا ۱۷۱۰۹۵۱ نمبر کا نوٹ نہیں مل رہا۔ سمجھ میں نہیں آتا ہیں کھا گیا یا میرا بٹوہ۔ گھر بھی ٹیلیفون کیا۔ لیکن لڑکیاں کالج جا چکی ہیں۔ کون جواب دیتا۔ والدہ بیمار ہیں اور نوکر بھاگ گیا ہے۔ دیکھئے نا۔ وقت بہ ہے۔ کہ۔ اوہو۔ یاد آیا۔ مس مخدوم نے ابھی تک اپنی رپورٹ تیار نہیں کی۔ کام کی اس قدر زیادتی ہے کہ صبح شام لیکچر دیتا ہوں۔ اب میں کوئی گدھا تو ہوں نہیں۔ ہاہاہا۔ (قہقہہ)

"ہاں تو۔ مسٹر موسیٰ!۔ میں کیا بات کر رہا تھا۔ ہاں۔ یاد آیا۔ سب سے پہلے آپ یہ کام کریں کہ میرے سفر خرچہ کا بل دوبارہ بنائیں۔ لیکن ایک بات کا خاص خیال رکھیں"۔ ناظم صاحب نے اپنی بے ربط اور بے جوڑ گفتگو اچانک توڑ دی۔ ہاتھ میں دیر سے سلگتے ہوئے سگریٹ کی راکھ، راکھ دان میں جھاڑی۔ اور پھر عینک آنکھوں پر لگا کر موسیٰ کے کاغذات کی طرف متوجہ ہوئے۔ موسیٰ نے مس امتیاز کی طرف دیکھا اور مس امتیاز نے اس کی طرف اور پھر مبہم سی مسکراہٹ مس امتیاز کے موٹے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

ناظم صاحب نے عینک دوبارہ اتار دی اور موسیٰ کی طرف دیکھ کر کہنے لگے۔

"تو مسٹر موسیٰ! ڈھاکہ میں میں جس ہوٹل میں مقیم تھا۔ وہاں بیرے کو دو روپے بطورِ ٹپ دیئے تھے۔ ظاہر ہے وہ سرکاری مد میں شمار نہیں کئے جا سکتے ... پھر بھی ــــ میری جیب سے تو خرچ ہوئے تھے اور ــــ میں ایک سرکاری نمائندہ کی حیثیت سے گیا تھا۔ اس لئے۔ ہاہاہا ــــ (قہقہہ) متفرقہ اخراجات کی مد میں تو آ سکتے ہیں۔ اور وہ میرے ٹیلیفون کا بل ــ اوہو!۔ میں آج بھی بھول گیا ــ صبح لڑکیاں اتنا پریشان کرتی ہیں ــ ہاہاہا ــ کہ مجھے ناشتہ اپنے ساتھ لانا پڑتا ہے۔ دیکھئے نا۔ میں پھر بھول گیا ہوں۔ میں نے اب تک ناشتہ نہیں کیا۔

مس اقبال ــ تم ذرا وہ میرا چرمی تھیلا تو اٹھانا"

اتنے میں دروازہ کھول کر کوئی صاحب اندر داخل ہو گئے۔ اور ناظم صاحب اپنی گفتگو ادھوری چھوڑ کر ان کی جانب متوجہ ہوئے۔

"آئیے۔ آئیے۔ مسٹر جبار!۔ آپ بھی بیٹھیے! اب آپ یہ معلوم کرنے آئے ہونگے کہ میں آپ کے پراجیکٹ کے لئے کتنا وقت دے سکتا ہوں۔ میں مانتا ہوں۔ آپ کا کام اہم ہے۔ مگر دقت یہ ہے کہ میں آپ کے لئے وقت کہاں سے چراؤں؟ ــ ہاہاہا ــ خیر آپ گھبرائیے نہیں۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔ ان سے ملئے۔ جبار صاحب! یہ ہیں مسٹر موسیٰ ہمارے دفتر کے نئے محاسب!۔ اور آپ ہیں مسٹر جبار ــ میرے عملے کے سب سے پرانے کارکن۔ کئی اہم پراجیکٹ ان کے ہاتھوں تکمیل پاتے ہیں۔" ناظم صاحب نے موسیٰ اور جبار صاحب کا آپس میں تعارف

کرایا۔ موسیٰ نے ذرا سا اٹھتے ہوئے جبار صاحب سے ہاتھ ملایا اور دوبارہ اپنی نشست پر بیٹھ گئے۔

"عجیب اتفاق ہے۔ ہمارے عملے میں تقریباً سب ہی کارکن عینک لگاتے ہیں۔ موسیٰ صاحب آپ بھی ایک عدد عینک خرید لیجئے" ناظم صاحب نے بڑی سنجیدگی سے موسیٰ کو مشورہ دیا۔ اور پھر آپ ہی آپ قہقہے لگانے لگے۔ مس امتیاز کے بھاری بھرکم جسم کو ہلکے ہلکے جھٹکے لگنے لگے اور جبار نے محض مسکرانے پر اکتفا کی۔

پھر جبار نے اپنی میلی سی قراقلی نما ٹوپی سر سے اوپر اٹھا کر دوبارہ سر پر اچھی طرح جما دی۔ اس کے بعد ناک سے عینک اتار کر اس کے شیشے رومال سے صاف کرتے ناظم صاحب سے مخاطب ہوئے۔

"ڈاکٹر صاحب! میں ایک درخواست لے کر آیا ہوں۔ مجھے اپنے پراجیکٹ کے لئے دو ماتحت کارکنوں کی ضرورت ہے۔ آپ نے جو نیا سٹاف بھرتی کر رکھا ہے۔ ان میں سے دو مجھے عنایت کر دیجئے"

ناظم صاحب نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ ان کے جسم کے ساتھ ساتھ کمرے میں بھی بھونچال آ گیا۔ پھر ناظم نے عینک میز پر سے اٹھا کر آنکھوں پر لگالی اور بڑے انہماک سے موسیٰ کے تقرری کے کاغذات پڑھنے لگے۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ نے چرمی تھیلہ مانگا تھا" موقع پا کر مس امتیاز نے چرمی تھیلہ ناظم صاحب کی طرف بڑھا دیا۔ لیکن ناظم صاحب بدستور کاغذات میں منہمک رہے۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے نظریں اٹھا کر موسیٰ کی طرف

دیکھا اس کے بعد باری باری جبار اور مس امتیاز کو گھورا۔ اچانک ناظم صاحب کو چرمی تھیلے پر رینگتی ایک دو چیونٹیاں نظر آگئیں اور وہ تھیلے پر یوں جھپٹے جیسے اس تھیلے میں ان کی ساری پونجی جمع ہو اور کوئی اسے لوٹنے لگا ہو۔

"یہ چیونٹیاں کہاں سے آگئیں ؟۔ ناظم صاحب نے تھیلے کے تسمے ڈھیلے کرتے تعجب کا اظہار کیا۔ "ہو نہ ہو۔ تھیلے میں کوئی سوراخ ہو گیا ہے۔"

ناظم صاحب نے جلدی جلدی تھیلے کی اشیا ایک ایک کرکے باہر نکالیں۔ اور پھر افسوس کرتے اپنا بھاری اور موٹا سر دائیں بائیں ہلانے لگے۔

"لڑکیوں نے کتنی محنت سے ناشتہ تیار کیا تھا اور وہ چیونٹیوں کی نذر ہو گیا۔" ناظم صاحب نے چپڑاسی بلانے کے لئے گھنٹی بجاتے ہوئے کہا۔ اور جب چپڑاسی اندر آگیا تو ناظم صاحب نے ایک قہقہہ لگایا۔

"لو ملازم حسین !۔ میرا ناشتہ چیونٹیاں کھا گئیں۔ جو کچھ بچ رہا ہے اسے باہر پھینک آؤ۔"

جب چپڑاسی دو سوکھے سینڈوچ لے کر باہر نکل گیا تو ناظم صاحب، مسٹر جبار سے مخاطب ہوئے۔

"ہاں تو۔ جبار صاحب! آپ پلاننگ کمیشن کے دفتر گئے تھے ؟۔ وہ کیا کہہ رہے تھے ؟؟۔ دقت یہ ہے کہ۔ مجھے تو سر کھجلانے کو بھی فرصت نہیں ملتی۔ ورنہ . . . . ہاہاہا . . ." ناظم صاحب نے ایک بے محل قہقہہ لگایا۔

"چیئرمین کہہ رہے تھے کہ ہم پہلے آپکی رپورٹ کا جائزہ لیں گے اس کے بعد

بقایا رقم کی ادائیگی کا کوئی انتظام کر سکیں گے۔" جبار صاحب نے اپنی ادھ کٹی ہٹلر مارکہ مونچھوں پر دو انگلیاں پھیرتے ناظم صاحب کو جواب دیا اور پھر سر سے ٹوپی ہٹا کر ہاتھ میں لیتے اپنی گفتگو جاری رکھی۔

" وہ بھی اپنی جگہ درست ہی کہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب! ہم نے بھی تو اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔ نامکمل رپورٹ ان کے کس کام کی؟"

اچانک ناظم صاحب جلال میں آگئے۔" میں نے ہزار مرتبہ مس مخدوم کو سمجھایا ہے کہ جہاں لین دین کا معاملہ ہو وہاں کوتاہی نہیں کرنی چاہیئے۔ دقت یہ ہے کہ ان کے پلے کچھ پڑتا ہی نہیں۔ اب ہر کام تو میں اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتا۔ پلاننگ کمیشن والے روپے نہیں ادا کرتے تو جائیں جہنم میں۔ میں حکومت کو لکھ دوں گا کہ مجھے واپس اپنے محکمے میں بھیج دو۔ اتنے سارے جھمیلے مجھ اکیلے سے نہیں نمٹائے جا سکتے۔ مجھ سے کوئی تعاون ہی نہیں کرتا۔" ناظم صاحب کا جلال ایک زوردار قہقہہ سے اچانک ٹوٹ بھی گیا۔ کہنے لگے۔" دقت یہ ہے کہ حکومت میری سنتی ہی کب ہے۔ وہ تو بس مجھے کاٹھ کا الّو سمجھتی ہے۔ ہاں تو۔ موسوی صاحب! میں آپ سے کیا کہہ رہا تھا۔ اب ایک وقت میں آدمی اتنے سارے حضرات سے کیونکر بات کر سکتا ہے۔ دقّت یہ ہے۔ کہ۔ ہاں۔ ٹھیک یاد آیا۔ میں آپ سے سفر خرچہ اور ٹیلیفون کے بل کے بارے میں بات کر رہا تھا۔"

" جی ہاں۔ آپ ٹیلیفون کے متعلق کوئی بات کر رہے تھے۔" مس ایڈیز

نے چاپلوسی کرتے ہوئے لقمہ دیا۔

اور ناظم صاحب ٹکر ٹکر مس امتیاز کو گھورنے لگے۔

"ٹیلیفون ؟ ـــ بس میں پھر بھول گیا۔ وقت کیا ہو گیا ہوگا۔؟" ناظم صاحب اپنی گھڑی دیکھتے اپنے آپ سے مخاطب ہوئے۔ "صبح دفتر آتے سمے بچی نے کہا تھا کہ اس کی پرنسپل کو ٹیلیفون کر دوں۔ دِقّت یہ ہے کہ ان کی پرنسپل صاحبہ بڑی بدمزاج ہیں۔ خواہ مخواہ چڑ جاتی ہیں۔ بڑی مشکلوں سے کالج میں داخلہ دلوایا تھا۔ اب وہ اپنی کسی سہیلی کے لئے ہوسٹل میں جگہ حاصل کرنے کی ضد کر رہی ہیں۔ مجھ سے پوچھو تو میں صاف کہوں کہ مجھے لڑکیوں کا ہوسٹل میں رہنا بالکل پسند نہیں۔ دِقّت یہ ہے کہ میری کوئی مانے تو تب نا ؟"۔

دو، سات، صفر، ایک، سات" ناظم صاحب نے ٹیلیفون ریسیور اٹھا کر نمبر زبانی دہراتے ڈائیل گھمایا۔

"کون صاحبہ بول رہی ہیں۔ محترمہ پرنسپل صاحبہ تشریف رکھتی ہیں؟۔ جی ؟۔ نہیں ؟

اچھا ـــ اچھا ـــ پھر سہی۔ مہربانی۔ نوازش" ناظم صاحب نے ٹیلیفون ریسیور کا آلہ اپنی جگہ رکھا۔ اور ٹیلیفون پر ہاتھ رکھے قہقہے لگانے لگے۔ قہقہوں کا ریلا کچھ تھما تو ناظم صاحب نے مس امتیاز کو مخاطب کیا۔

"میں نے ان سے پوچھا۔ پرنسپل صاحبہ تشریف رکھتی ہیں۔ جواب ملا وہ کھیل رہی ہیں۔ دقت یہ ہے کہ عورت ہمیشہ عورت ہی رہتی

ہے۔ کبھی ذمہ داری کا احساس قبول ہی نہیں کرتی ۔ اب ان محترمہ سے کوئی پوچھے۔ اس عمر میں بھلا کھیلنے کی کیا تک ہے؟"

"ڈاکٹر صاحب! وہ طالبات کو کھیلتے دیکھ رہی ہونگی ۔ آپ نے غلط سنا ہوگا" مس انتیاز عورتوں کی حمایت میں بولیں ۔ اور پھر کھی کھی ہنسنے لگیں ۔ موسیٰ نے اکتا کر سب کی طرف دیکھا لیکن فرار کی کوئی راہ نہ پاتے ہوئے مجبوراً بیٹھا بور ہوتا رہا۔

"اچھا۔ تو ڈاکٹر صاحب! اب میں جاؤں؟" مس انتیاز نے کرسی سے اٹھ کر، دو قدم پیچھے ہٹتے ناظم صاحب سے اجازت طلب کی لیکن اجازت ملے بغیر اس نے دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی۔ دروازہ اپنے آپ اس کے پیچھے بند ہو گیا۔

اب ناظم صاحب موسیٰ کے تقرری کے کاغذات پر دوبارہ جھک گئے۔ "کیا مصیبت ہے؟" موسیٰ نے اکتا کر جماہیاں لینی شروع کیں "یہ حال ہو تو کام کیسے چلیگا" موسیٰ پہلو بدلتے سوچنے لگا۔

"جبار صاحب! ۔ آپ ذرا موسیٰ صاحب کو ان کا کمرہ دکھادیں اور انہیں کام سمجھا دیں۔" بالآخر ناظم صاحب نے موسیٰ کی مشکل حل کر دی۔

"موسیٰ صاحب! میرا سفر خرچہ کا بل جو لئیگا نہیں۔ کل تو میں محکمہ بحالیات کے ایک ضروری اجلاس میں معروف رہوں گا۔ اس لئے آپ سے ملاقات نہ ہو سکے گی۔ ویسے آپ رہتے کہاں ہیں؟"

"جہانگیر آباد میں اپنے ایک دوست کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں۔

جہان گبرآباد غالباً ریلوے سٹیشن سے تین چار میل مغرب میں واقع ہے۔" موسیٰ نے اکتائے اکتائے جواب دیا۔

"اچھی بات ہے۔ اب آپ جبار صاحب کے ساتھ جائیں۔ یہ آپ کو کام سمجھا دیں گے۔ پھر آپ ایک ہفتے کے اندر اندر مجھے یہ بتائیں کہ پہلے محاسب نے حساب کتاب میں کوئی گڑبڑ تو نہیں کی ؟"

محاسب کے دفتر میں ڈھیروں مثلیں اور کاغذات کے پلندے بکھرے ہوئے تھے۔ ٹائپ کی مشین پر گرد کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کئی دنوں سے کسی نے دفتر کی جھاڑ پونچھ بھی نہ کی ہو۔

"میں چپڑاسی بلائے دیتا ہوں۔ وہ صفائی کرے گا۔ پھر ان کاغذات اور مثلوں کو آپ اپنے طور پر ترتیب دیں۔ دراصل میں خود بھی اس کام سے واقف نہیں ورنہ آپ کی مدد کر لیتا۔" جبار صاحب نے بڑی آسانی سے گلو خلاصی حاصل کر لی۔ اور باہر نکل کر چپڑاسی کو آوازیں دینے لگے۔

چپڑاسی موسیٰ کے کمرے کی صفائی میں مصروف ہوا اور موسیٰ ایک ایک مثل کو ترتیب وار الماری میں رکھنے لگا۔

کوئی ایک گھنٹہ بعد موسیٰ نے چپڑاسی کو رخصت کیا اور اپنی میز پر ضروری کاغذات کو الگ چھانٹنے لگا۔

اس کام سے فارغ ہو کر موسٹی نے ٹائپ مشین سنبھالی اور دو چار ضروری خطوط کے جواب ٹائپ کئے۔ اتنے میں دفتر کا ایک کلرک مسکراتا موسٹی کے کمرے میں داخل ہُوا۔ اور اپنا تعارف خود کرایا۔

"مجھے اعجاز کہتے ہیں۔ آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ ہم تو صبح سے آپ کا انتظار کر رہے تھے۔ مگر جب معلوم ہوا کہ آپ کو ناظم نے گھیر رکھا ہے تو ہم تسلی سے بیٹھ گئے کہ آپ کو بارہ بجے سے پہلے چھٹکارا ملنا ممکن ہی نہیں۔ آئیے پہلے آپ کو چائے پلائیں۔ پھر باتیں ہونگی یہ دفتر اس لحاظ سے بڑا دلچسپ ہے کہ آپ کام کریں نہ کریں۔ تنخواہ آپ کو باقاعدگی سے ملتی رہے گی۔ تو آئیے کنٹین میں بیٹھ کر ایک ایک پیالہ چائے پی لیتے ہیں۔

"جی شکریہ۔ دراصل صبح سے میرا بڑا وقت ضائع ہو گیا ہے۔ اور میں نے اندازہ لگالیا۔ مسلسل ایک ماہ تک شائد مجھے فرصت نہ مل سکے۔"

"اجی صاحب! چھوڑیئے بھی۔ یہ کام ہمارے بس کا ہے ہی نہیں۔ باقی تو رنگ رلیاں منائیں اور ہم محنت کریں۔ شروع شروع میں جب میں سعودی عرب سے اپنے وطن آیا اور اس شعبے میں ملازمت مل گئی تو میں بھی یہی جذبہ رکھتا تھا کہ یہاں میں دن رات کام کروں گا۔ لیکن رفتہ رفتہ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ یہاں سب مرد و زن محض پکنک منانے آتے ہیں۔ کام کوئی نہیں کرتا۔ جناب کوئی بے وقوف

ہی اسے دفتر سمجھیگا۔ میری نظر میں تو یہ چڑیا گھر سے کسی صورت کم نہیں۔ یہاں عجیب عجیب جانوروں سے واسطہ پڑیگا۔ سب سے پہلے آپ ہمارے ناظم ہی کو لے لیجئے۔ اس کے بعد ایک اور صاحب ہیں۔ میلی سی ٹوپی پہنے عینک لگائے اور ادھ کٹی مونچھوں کو بار بار تاؤ دیتے جب آپ سے باتیں کریں گے۔ تو آپ کا جی چاہے گا دو چار تھپیڑ رسید ہی کر دوں۔ باتیں کرنے کا سلیقہ ہی نہیں رکھتے اور اپنے آپ کو مختلف پراجیکٹ کے نگران سمجھتے ہیں۔ صبح جو موٹی سی سانولی سی اور ٹھنگنے قد کی لڑکی آپ کے ساتھ جا رہی تھی۔ جانتے ہیں وہ کون ہے؟۔ ان کا چچا جامعہ کے ایک شعبے کا سربراہ ہے۔ ان کے پاس جغرافیہ کی ڈگری ہے مگر تحقیق زراعت میں کرتی ہیں۔ سارا سارا دن یا تو دفتر سے غیر حاضر رہتی ہیں۔ اور یا دفتر میں کرسی پر بیٹھے بیٹھے خراٹے بھرتی رہتی ہیں۔ اور جب ذرا بیدار ہوتی ہیں تو چھابڑی والے سے نمکین دال خرید کر سارا دن، ہاتھ، انگلیوں اور دماغ کے بجائے منہ کو مصروف رکھتی ہیں۔ یوں شام ہو جاتی ہے اور آپ بالکنی میں کھڑی ہو کر دکھاوے کے لئے مطالعۂ قدرت میں محو ہو جاتی ہیں۔ تو جناب! میں کس کس کا تذکرہ کروں۔ یہاں کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ آگے چل کر آپ خود ہی سب کچھ جان جائیں گے۔ ایک اور لڑکی ہے جس کا نام مس ہارون ہے۔ یہ اپنے آپ کو نائب ناظم سے کم تو سمجھتی ہی نہیں۔ رعب گانٹھنے میں بے حد طاق۔ بظاہر اتنی سنجیدہ،

متین اور خاموش جیسے بیسویں صدی نے فلاسفر عورت کو جنم دے کر دنیا کو حیران کر دیا ہو۔ مغرور اتنی کہ کلرکوں سے سیدھے منہ بات کرنا اپنی توہین سمجھتی ہیں لیکن اس کے منہ سے نکلے ہوئے چند ہی جملے اس کا بھانڈا پھوڑ دیتے ہیں۔ تین ماہ کا پراجیکٹ ایک سال میں مکمل کر کے یوں اینٹھتی پھرتی ہیں جیسے بڑا معرکہ سر کر لیا ہو۔ اور جب کسی خط کا جواب دینا چاہتی ہیں تو ٹائپ کرنے والے کلرک کے سر پر بیٹھ جاتی ہیں۔ اور بات بے بات جھڑکنا اپنا وطیرہ بنا لیتی ہیں۔ بس آپ ان سے محتاط رہیں ورنہ چند ہی دنوں میں آپ کا بستر آپ کے کندھے پر ہوگا اور آپ ربوے سٹیشن کا فاصلہ طے کر رہے ہوں گے۔ بس اس دفتر میں یہ خوبی ہے کہ یہاں کا ماحول بے حد رنگین ہے ورنہ میں کب کی یہ ملازمت چھوڑ چکا ہوتا۔"

اعجاز کی اس طویل مگر معلوماتی گفتگو سے موسیٰ بھونچکا رہ گیا۔ معلوم ہوتا ہے یہ شخص نفسیات کا ماہر ہے۔ موسیٰ سوچنے لگا۔ چاہے کوئی اس کی رائے سے اتفاق کرے نہ کرے۔ اس نے دفتر کے چیدہ چیدہ کارکنوں کا تجزیہ خوب کیا تھا۔ اور ان لوگوں کے ساتھ چند گھنٹے گذار کر ہی موسیٰ نے اندازہ لگایا کہ اعجاز سو فیصد نہیں تو پچاس فیصد درست رائے رکھتا تھا۔ موسیٰ نے گھبرا کر کاغذات ایک طرف رکھ دیئے۔ اور اعجاز کے ساتھ کنٹین کی جانب چل پڑا۔

چائے سے فارغ ہو کر دونوں خراماں خراماں اپنے دفتر آ گئے۔

اور موسیٰ دوبارہ اپنے کام میں منہمک ہوگیا۔ اعجاز بھی اپنا کام چھوڑ کر کافی دیر تک اس کا ہاتھ بٹاتا رہا۔ حساب کتاب کے بہی کھاتوں میں پچھلے تین مہینوں کا اندراج نہیں ہوا تھا اور یہ بات موسیٰ کے لئے خاصی پریشان کن تھی۔ پھر بھی اس نے ہمت نہ ہاری۔ چھان پھٹک کر اس نے اخراجات کے بلوں کو الگ کر کے ترتیب دیا۔ اور بہی کھاتوں میں اندراج شروع کیا۔

"ٹھک ٹھک۔ ٹھک ٹھک" اونچی ایڑی کے جوتے چٹخاتی دو دبلی پتلی لڑکیاں دروازہ کھول کر موسیٰ کے کمرے میں داخل ہوئیں۔

"آئیے۔ آئیے۔ مس شہلا اور مس برکت مسیح! آپ سے ملیئے۔ یہ ہمارے دفتر کے نئے محاسب مسٹر موسیٰ ہیں۔ آج ہی تشریف لائے ہیں۔" اعجاز نے موسیٰ کا لڑکیوں سے تعارف کرایا۔ موسیٰ نے نگاہ اٹھا کر لڑکیوں کی طرف دیکھا اور سلام کر کے دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔

اعجاز نے کرسیوں سے مثلیں اور کاغذات کے پلندے اٹھا کر میز پر رکھتے ہوئے لڑکیوں کے لئے جگہ بنائی۔

"موسیٰ صاحب! آپ دونوں ہمارے دفتر کی آپریٹر ہیں۔ بادی النظر میں عجیب سا لگتا ہے۔ لیکن جب یہ دونوں خواتین بھاری بھاری مشینوں کو حرکت میں لاتی ہیں تو ان کے نازک ہاتھوں میں فولادی مشینیں کھلونے بن جاتی ہیں۔ خواتین کے پورے گروہ میں بس صرف

یہ دو لڑکیاں ہی ہیں جو حلال کی کھاتی ہیں"۔ اعجاز کے تعریفی کلموں سے لڑکیاں خوش ہو رہی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ شرما بھی رہی تھیں۔

"لیکن" اعجاز کے منہ سے لیکن کا لفظ سن کر وہ دونوں چونک اٹھیں اور گھبرا کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں۔ شائد وہ اعجاز کو پہلے سے جانتی تھیں کہ وہ منہ پھٹ واقع ہوا ہے۔ اس لئے دونوں کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ جسے اعجاز نے بھانپ لیا اور پینترا بدل کر اپنا کلام یوں جاری رکھا۔

"لیکن یہ چائے کے ساتھ شامی کباب اور کوکا کولا کے ساتھ سموسے کھانے کی عادی ہیں۔ مہمان نوازی ان پر ختم ہے۔ آدھی سے زیادہ تنخواہ ان کی ہمیشہ کنٹین والے کھا جاتے ہیں۔ جب کبھی دفتر سے سیدھے پکچر ہاؤس جانے کا پروگرام ہو تو ڈھیروں توس منگوا کر دوپہر کا کھانا دفتر ہی میں تناول فرما لیتی ہیں۔ اب آپ دونوں خواتین فرمائیں ہیں آپ کے لئے کیا منگواؤں؟۔ چائے یا مشروب؟" اعجاز صاحب نے کسی مصلحت کی بنا پر اپنی زبان کو لگام دے دی اور دونوں لڑکیوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

"کچھ بھی نہیں مسٹر اعجاز!" مس شہلا نے جھینپ کر کہا۔ اور پھر وہ موسیٰ سے مخاطب ہوئیں۔

"موسیٰ صاحب! پچھلے تین ماہ سے ہماری سالانہ ترقی واجب الادا ہے لیکن کوئی کارروائی عمل میں نہیں آتی۔ اس کے علاوہ ہمارے آمدورفت کے معاوضے میں نہ جانے کیسے تخفیف ہو گئی ہے۔ تنخواہ پہلے کی نسبت کم ملنے لگی ہے۔" مس شہلا نے شکایت کی۔ اور مس برکت مسیح نے اس کی تائید کی۔

مس برکت مسیح دائیں ہاتھ سے اپنے بالوں کے گرہ دار جوڑے کو ٹٹول رہی تھی جس میں سفید پھول اڑسے ہوئے تھے۔

"تو آپ چائے یا مشروب نہیں پئیں گی۔ لیکن اس میں حرج ہی کیا ہے؟"

اعجاز نے انہیں دوبارہ اپنی جانب متوجہ کرنا چاہا۔ لیکن لڑکیوں نے اس کی درخواست پر کوئی توجہ نہ دی۔ سنی اَن سنی کر کے مس شہلا دوبارہ موسیٰ سے مخاطب ہوئیں۔

"تو موسیٰ صاحب! ہمارے معاملے میں آپ کوئی کارروائی کریں گے یا نہیں؟"

اب مس برکت مسیح اپنی ساڑھی کی سلوٹیں درست کر رہی تھی اور بار بار اپنے خوبصورت بالوں پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔

مس برکت چھریرے بدن کی لمبی سی دبلی پتلی لڑکی تھی۔ ہونٹ پتلے پتلے، ناک ستواں اور آنکھیں خوب روشن اور موٹی موٹی تھیں۔ رنگ سانولا تھا مگر دیدہ زیب تھی اور اس وقت ساڑھی اس کے بدن پر خوب سج رہی تھی۔ اس کے برعکس مس شہلا درمیانے درجے کی ناٹی تھیں۔ اوپر سے باتیں بھی ناک میں کرتی تھیں۔ لمبی ناک نے اس کے چہرے کو اور بگاڑ رکھا تھا۔ اچانک مس شہلا کو چھینک آئی اور در و دیوار لرز اٹھے۔ "لڑکیوں کو اتنے زور سے نہیں چھینکنا چاہیے۔" موسیٰ نے ناگواری سے سوچا۔ البتہ مس شہلا کے بالوں کا انداز نرالا تھا۔ بال اوپر کی جانب اٹھے ہوئے تھے۔ جیسے اس نے سر پر تاج پہنا ہوا ہو۔

"محترمہ ابھی آج ہی آیا ہوں" موسیٰ نے مس شہلا کے سوال کا جواب دیا۔

"کام کا جائزہ لے رہا ہوں مجھے کچھ مہلت چاہیئے۔ دو چار دن کی بات ہے۔ پھر جو آپ کے مطالبے ہوں گے۔ سب کے سب پورے کر دوں گا۔"

مس شہلا اور مس برکت مسیح نے موسیٰ کا شکریہ ادا کیا اور اونچی ایڑی کے جوتے سے فرش پر ٹھک ٹھک کرتیں باہر نکل گئیں۔

"یہاں نقدی کس کی تحویل میں ہے؟" لڑکیوں کے جانے کے بعد موسیٰ نے اعجاز سے دریافت کیا۔

"ہر ایک کی جیب میں تھوڑی بہت نقدی تو ہوتی ہی ہے" اعجاز نے مزاحیہ انداز میں مسکرا کر جواب دیا۔

"میرا مطلب ہے سرکاری نقدی" موسیٰ نے اپنے سوال کی وضاحت کی۔

"میرا خیال ہے ہماری نائب ناظمہ مس ہارون کی تحویل میں ہو گی۔ اتنا تو میں جانتا ہوں۔ خزانے کی کنجیاں انہی کے پاس ہیں" اعجاز نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔

"اور خزانہ کہاں ہے؟"

"خزانہ۔ لائبریری والے کمرے کے ایک کونے میں دفن ہے" اعجاز نے اپنا طنز برقرار رکھا۔

"اب آپ پوچھیں گے۔ خزانے کا لائبریری سے کیا تعلق ہے؟ تو جناب یہی عرض کرتا ہوں۔ اور پہلے بھی ایک مرتبہ عرض کی تھی کہ مس ہارون اس دفتر کی سیاہ و سفید کی مالکہ ہے۔ اور چونکہ لائبریری کی ہزاروں کتابیں ان کے سپرد ہیں۔ کما حقہٗ ہمارے ناظم صاحب نے خزانہ بھی انہی کی تحویل میں دے رکھا ہے

ہمارے ناظم کا خیال ہے کہ اس طرح خزانے کی حفاظت بہتر طور پر ہو سکتی ہے۔ اب اگر آپ کو خزانے میں سے کوئی رقم نکالنی ہوگی تو سب سے پہلے نائب ناظمہ مس ہارون کے حضور درخواست پیش کریں گے۔ اگر انہوں نے لائبریری کی چابیاں عنایت کر دیں تو آپ خزانہ کھول سکیں گے۔ ورنہ ان کے کمرے میں کھڑے کھڑے سوکھ جائیں گے۔ وِقت یہ ہے۔ کہ ——" اعجاز نے ناظم صاحب کی نقل اتارتے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

"کہ یہاں عورتیں حاکم ہیں اور مرد محکوم۔ خود ہمارے ناظم صاحب بھی مس ہارون کے بے دام غلام ہیں۔"

اعجاز کچھ دیر اور ٹھہر کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور موسیٰ اپنے کام میں اور بھی تندہی سے مصروف ہو گیا۔ یہاں تک کہ شام کی آمد آمد ہوئی۔ سامنے شعبۂ نباتات کی عمارت کی چمنی پر سنہری دھوپ آہستہ آہستہ رنگتی پھسلنے لگی۔ پیچھے دُور کہیں سورج غروب ہونے کی فکر میں تھا۔ تبھی تو خنکی بڑھ رہی تھی۔ دن بھر کی تھکاوٹ سے چور ہو کر موسیٰ نے ایک لحظہ کے لئے کمر سیدھی کی اور باہر برآمدے میں کھڑے ہو کر سستانے لگا۔ آگے پیچھے سب عمارتیں بھائیں بھائیں کر رہی تھیں۔ سب ملازم کب کے جا چکے تھے۔

"اب چلنا چاہیئے!" موسیٰ نے دل میں سوچا۔ "ایک دن کا کام ہوتا تو میں رُک بھی جاتا۔ دو تین مہینوں کا کام اکٹھا ہو گیا ہے۔ آہستہ آہستہ ہی تکمیل پائے گا۔"

یہ سوچ کر موسیٰ دوبارہ اپنے کمرے میں داخل ہوا اور میز پر بکھرے ہوئے

کاغذات سمیٹ کر میز کی دراز میں رکھے اور کمرے کا دروازہ بھیڑ کر ٹھک ٹھک کرتا سیڑھیوں سے اتر کر وسیع عمارت کی غلام گردشوں سے ہوتا ہُوا نیچے سڑک پر آگیا اور سر جھکائے بوجھل قدموں سے خنکی میں آگے بڑھنے لگا۔ اب سورج مکمل طور پر غروب ہو چکا تھا۔ دور افق پر سرخی کی ایک تیز دھاری لکیر سی چمک رہی تھی۔

بجری بچھی ہوئی سڑک پر بڑھتے اچانک موسیٰ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا اور کان لگا کر غور سے سننے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا بس یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے اس کے کان بج رہے ہوں یا جیسے کہیں دُور سے ایک مسلسل مگر مدھم سا شور سنائی دے رہا ہو جیسے دور بہت دور بے شمار بچے گلیوں میں چلا چلّا کر کھیل رہے ہوں اور ہڑ بونگ مچا رہے ہوں۔ سڑک سے کچھ فاصلے پر مشرق سے مغرب کی جانب ایک پٹڑی چلی گئی تھی۔ جو سڑک کو عین چوراہے پر کاٹ رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا۔ اگر وہ پٹڑی کے ساتھ ساتھ لکڑی کے پھٹوں کو پھلانگتا دوڑے تو کیا وہ آج اپنے گھر پہنچ جائے گا؟

پھر خود ہی اُسے اس مہمل خیال پر ہنسی آگئی۔ اس کا گھر سینکڑوں میل کے فاصلے پر واقع تھا اور یہ پٹڑی اس کے گھر کی مخالف سمت میں بہہ رہی تھی۔ گو زمین گول ہے مگر وہ جانتا تھا یہ پٹڑی اسے اپنے گھر سے اور بھی دُور لے جاتی۔

خانہ بدوشوں کے گھاس پھونس کے چھپروں کے قریب ایک بڑا گڑ انڈیل

سا کتا بھونک رہا تھا۔ قریبی بس سٹاپ تک پہنچتے پہنچتے سڑکوں اور چوراہوں کی بتیاں روشن ہو چکی تھیں۔ بس سٹاپ کے قریب سرکاری مکانات قطار اندر قطار پھیلے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں کسی مکان کے سامنے موٹر اور کسی کے سامنے سکوٹر کھڑا تھا۔ اس پختہ سڑک کے سامنے مٹی اور گارے کی دکانوں اور ہوٹلوں کا سلسلہ تھا۔ عین سامنے والے ہوٹل سے ریڈیو پر یہ آواز سنائی دے رہی تھی۔

"اے وطن! مجھ کو امن اور تہذیب کی بھیک دے!!"

اور اس سے ملحقہ چھوٹی سی دکان میں دھوبی لالٹین کی روشنی میں کپڑوں پر استری پھیر رہا تھا۔ دھوبی بار بار ایک ہاتھ سے ماتھا چھو رہا تھا جیسے پسینہ پونچھ رہا ہو۔ روشنی کے کھمبے کے پاس ایک چھابڑی والا چنے مونگ پھلیاں اور ریوڑیاں فروخت کر رہا تھا۔ اس کے دیئے سے دھواں اٹھ اٹھ کر بار بار اس کی آنکھوں میں گھس رہا تھا۔ پھر ہوا کا ایک جھونکا آیا اور اس کا دیا بجھا کر چلا گیا۔ ابھی چھابڑی فروش دیا سلائی ہی ڈھونڈھ رہا تھا کہ ہوا نے جھکڑ کی صورت اختیار کر لی اور اس نے مجبور ہو کر چھابڑی کو ایک میلی کچیلی چادر سے ڈھانک دیا اور خود ہوا کے رُخ سے منہ موڑ کر سگریٹ جلانے کی کوشش کرنے لگا۔ گرد و غبار کا اندازہ کھمبے کی روشنی میں اڑتے ہوئے لاکھوں ذرّوں سے لگایا جا سکتا تھا جو روشنی کے دائرے میں ناچ رہے تھے۔ شام کے دھندلکوں پر رات کی تاریکی چھا گئی تھی۔ مغرب کی سمت سے تین چمکدار آنکھیں۔

نمودار ہوئیں اور آہستہ آہستہ بڑھتی ہوئی یہ آنکھیں آخر کار بس سٹاپ پہ آکر رک گئیں۔ اور موسیٰ بس میں بیٹھ گیا۔ کھڑکی کے قریب بیٹھے ہوئے اس نے ہوا میں نمی محسوس کی۔ دور بہت دور افق کے قریب بادل بے آواز گرج رہے تھے اور بجلی چمک رہی تھی۔

بس کے ریلوے سٹیشن تک پہنچتے پہنچتے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ ریلوے سٹیشن کے سٹاپ پر اتر کر موسیٰ بھاگتا ہوا ایک چائے کی دکان میں داخل ہو گیا۔ اتنی سی دیر میں وہ خاصہ بھیگ گیا تھا۔ اس کے بالوں سے بارش کے قطرے ٹپکنے لگے اور بھیگے ہوئے کپڑوں میں ایک سرد سی لہر وہ اپنے جسم میں سرایت کرتی ہوئی محسوس کر رہا تھا۔ ایک تانگے والا چلا چلا کر جہانگیر آباد کی سواریوں کے لئے آوازیں دے رہا تھا۔ دکان کے چھجے کے نیچے بارش کا گدلا پانی زور و شور سے بہہ رہا تھا۔ سڑکیں کیچڑ سے لت پت ہو چکی تھیں۔ موسیٰ پتلون کے پائنچے گھٹنوں تک اٹھا کر، سر پہ دونوں ہاتھوں سے جیبی رومال تان کر دکان سے باہر نکل آیا۔ اور تانگے والے کو آواز دی جو مایوس ہو کر صرف ایک ہی سواری بٹھائے جہانگیر آباد جانے لگا تھا۔

بارش کے موٹے موٹے قطرے تانگے کے سائبان پہ یوں پڑ رہے تھے جیسے اولے برس رہے ہیں۔ پچھلی نشست پہ بیٹھا موسیٰ بار بار پہلو بدل رہا تھا مگر بارش کے چھینٹوں سے بچنے کا کوئی امکان نہ تھا

آخر اس نے ہتھیار ڈال دیئے اور ایک ہی جگہ پر بیٹھا ہوا بھیگتا رہا۔

ریلوے پل کے نیچے قرب و جوار کے برساتی نالوں کا پانی نیلگوں کی صورت بہتا آ رہا تھا۔ اور لوگ جوتے ہاتھوں میں لیئے پائینچے گھٹنوں تک اٹھائے شڑاپ شڑاپ قدم رکھتے آ جا رہے تھے۔

آخر جہانگیر آباد کا چوک آ گیا اور موسٰی تانگے والے کو کرایہ ادا کر کے نیچے اُتر آیا۔ رات کے گھُپ اندھیرے میں اندازہ لگاتا ہوا وہ ایک گلی میں داخل ہوا۔ اور ٹھوکریں کھاتا گرتا پڑتا دوسرے سرے پہ پہنچ گیا۔ کھیتوں کی بُو باس اور کارخانے کی پھک پھک کی مسلسل آواز سے وہ جان گیا کہ وہ راستہ بھول گیا ہے۔ وہ واپس مڑا اور پھر اسی چوک میں پہنچ کر پہلی گلی کے متوازی دوسری گلی میں داخل ہوا۔ ہاں یہی گلی ہے۔ اس نے ایک مکان کی چھت پہ بادنما مرغ کو دیکھ کر اپنے آپ سے کہا۔ آخر وہ اپنے دوست کے لوہے کی چادر والے مکان کے دروازے تک پہنچ گیا۔ دروازہ ہاتھ کے ہلکے سے جھٹکے سے کھل گیا۔ اندر داخل ہو کر اس نے اپنے پیچھے دروازہ بھیڑ لیا اور برآمدے میں کھڑے ہو کر اپنے جوتوں سے ڈھیروں مٹی صاف کرنے لگا۔

"کون ؟ ــ موسٰی ؟ ؟" بخت جمال نے اپنے کمرے سے آواز دی۔

"ہاں ــ میں موسٰی ہوں۔ توبہ توبہ ــ یہ جگہ کتنی دور ہے ! ــ ایک ایک فٹ کیچڑ میں دھنسا بڑی مشکلوں سے یہاں تک پہنچا ہوں"

موسیٰ نے بدستور جوتوں سے مٹی ہٹاتے ہوئے جواب دیا۔

"اندر آجاؤ۔ موسیٰ! — اندر آجاؤ۔ باہر کیوں کھڑے ہو"

بخت جمال نے لڑکھڑاتے لہجے ہی موسیٰ کو مخاطب کیا۔

جونہی موسیٰ نے بخت جمال کے کمرے میں قدم رکھا شراب کی تیز بو نے اس کے دماغ کو جکڑ لیا۔

بخت جمال کرسی پر نیم دراز تھا۔ میز پہ گلاس دھرا ہوا تھا۔ اور گلاس میں شراب کے چند گھونٹ سونے ایسے دمک رہے تھے۔ کرسی کے قریب ہی رکھی ہوئی بوتل میں ابھی کچھ شراب باقی تھی۔ بخت جمال نے گلاس اٹھا کر باقیماندہ شراب غٹاغٹ چڑھالی اور پھر تھوڑی سی مقدار میں بوتل سے اور شراب انڈیل کر موسیٰ کی طرف گلاس بڑھایا۔

"لو پیو۔ میرے دوست! — آج کی رات ہماری ہے" بخت جمال نے اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے موسیٰ کی طرف دیکھا اور لڑکھڑائی آواز میں اس سے مخاطب ہوا۔ اس کے ہاتھوں پر رعشہ طاری تھا اور وہ بار بار ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ موسیٰ نے مسکرا کر اس کا بڑھا ہوا ہاتھ روک لیا۔ بخت جمال نے وہی گلاس پھر اپنے ہونٹوں سے لگالیا۔ دو چار چسکیاں بھر کر اس نے گلاس میز پہ پٹخ دیا۔

"جو لوگ شراب نہیں پیتے، زندگی بھر جھک مارتے ہیں۔ ان کی زندگی، زندگی نہیں ڈھکوسلہ ہے۔ فراڈ ہے۔ اور — وہ ساری زندگی اپنے آپ کو دھوکہ دیتے رہتے ہیں"

"ہاں۔ مگر۔" موسیٰ نے بدستور مسکراتے بخت جمال کی بہکی بہکی باتوں سے محظوظ ہوتے جواب دیا۔

"مگر لوگ کہتے ہیں شراب زندگی سے فرار سکھاتی ہے۔ اور زندگی سے فرار بزدلی کی نشانی ہے۔"

"بزدل! ۔ بزدل!! ۔ ہاں میں بزدل ہوں" بخت جمال اپنے بال نوچتے کہنے لگا۔

"میں اپنی محبوبہ کو حاصل نہ کر سکا۔ کیونکہ ۔ میں اپنے معاشرے اور اپنے نام نہاد خاندانی رواج سے بغاوت نہ کر سکا۔ اور اس بے چاری نے خودکشی کر لی۔ جانتے ہو ۔ آج کیا ہوا ۔ پچھواڑے ہمارے مالک مکان کی بیٹی نے بھی خودکشی کی کوشش کی۔ وہ ایم اے (انگریزی) پاس کر چکی ہے۔ اب تم کہو گے وہ بھی بزدل تھی ۔ اس کی عمر تیس برس سے تجاوز کرنے لگی ہے۔ لیکن اس کی منگنی جس کمینے سے طے پائی ہے وہ انگلستان میں رنگ رلیاں منا رہا ہے۔ آج شام جب میں دفتر سے لوٹا۔ تو اس کی ماں ۔ پردے سے بے نیاز ۔ گلی میں واویلا مچا رہی تھی۔ وہ رو رو کر ہلکان ہو چکی تھی۔ میں بھاگا بھاگا گیا اور ٹیکسی لے آیا۔ جوان لڑکی کو ۔ میں نے اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر ٹیکسی میں لادا۔ اس کے منہ سے جھاگ نکل نکل کر اس کے نیم برہنہ گریبان کو بھگو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ راستے میں ماں اپنی بے ہوش بیٹی کو گود میں لئے ہسپتال تک بین کرتی رہی۔

میں پوچھتا ہوں — ان بے انصافیوں کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے۔ تم پر۔ تمہارے جیسے ہزاروں بے حس انسانوں پر — عورتوں کے بیوپاریوں۔ وہ دن دور نہیں جب تم عورت کے سامنے اپنے گھٹنے ٹیک دوگے۔ بس عورت اپنا مقام حاصل کر کے رہے گی۔"

کافی دیر تک بخت جمال پیتا رہا اور بہکی بہکی باتیں کرتا رہا۔ موسیٰ نے اٹھ کر پتیلے سے تھوڑا سا سالن نکالا اور ایک روٹی لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کپڑے بدل کر اس نے کھانا کھایا اور بتی بجھا کر لیٹ گیا۔ دوسرے کمرے سے اس کے دوست کی بڑبڑانے کی آواز مسلسل آتی رہی۔

اگلی صبح جب موسیٰ تیار ہو کر بخت جمال کے ساتھ دفتر جانے کے لئے باہر نکلا تو مطلع اب تک ابر آلود تھا۔ درختوں کے پتوں سے اب بھی ایک آدھ قطرہ ٹپک کر زمین میں جذب ہو جاتا۔ ٹھنڈی ہوا سر اپا جسم کو فرحت اور تازگی بخش رہی تھی۔ مشرقی افق پر بادلوں کا سینہ چاک تھا۔ اور نیلے آسمان کے اس چھوٹے سے ٹکڑے سے سورج جھانک رہا تھا۔ ہوا میں خنکی تھی اور نمی بھی۔ زمین پر کہیں کہیں گدلا پانی چھوٹے بڑے گڑھوں میں تیر رہا تھا۔ جس پر سے گذرتی ٹھنڈی ہوا ننھی ننھی لہروں کو جنم دے رہی تھی۔

دونوں دوست چپ چاپ اور خاموش، اور گڑھوں سے بچتے بچاتے چوک والے بس سٹاپ کی جانب بڑھنے لگے۔ گلی کے آخری

سرے پہ پانی تالاب کی صورت جمع ہو کر آنے جانے والوں کا منہ چڑا رہا تھا۔ دائیں جانب ایک مکان کی دیوار کے ساتھ ساتھ بڑھتے ہوئے کسی کے قدموں پہ اپنے قدم جماتے، دونوں نے آخر کیچڑ اور دلدل کو عبور کر لیا۔

"انسان بڑا کمزور واقع ہوا ہے۔ نقش قدم پہ بڑھنے ہی میں اپنی عافیت سمجھتا ہے۔ کیا یہ ضروری ہے کہ انسان اپنی موت کا سامان آپ کرے۔ موت سے چھٹکارا نہیں۔ ایک نہ ایک دن وہ خود ہی آن کر گلا دبوچ لیتی ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں۔ رات کو جو کچھ ہوا۔ اچھا ہوا؟ اور پھر آپ نے تو اسے دیکھا ہی نہیں۔ وہ ایک ایسا زرد پتا ہے جو خود تو مرجھا چکا ہے۔ لیکن اس کی شاخ جس سے وہ جھول رہا ہے۔ اب بھی سرسبز ہے۔ لیکن اسے شاخ کی ہریالی سے کیا سروکار؟ کیا وہ دوبارہ ہرا ہو سکے گا۔؟؟ کبھی نہیں۔ کبھی نہیں۔ دوشیزگی ہی میں اس کے چہرے پہ جھریاں نمودار ہو چکی ہیں۔ ہسٹیریا کے مسلسل دوروں نے اس کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔

مجھے معاف کر دو میرے دوست!۔ کل میں ہوش میں نہیں تھا۔ میرا جنوں بڑھ رہا ہے کہیں میں پاگل نہ ہو جاؤں۔؟"

بخت جمال رات کو پینے کے لئے جو جواز پیش کر رہا تھا۔ وہ خود محسوس کر رہا تھا کہ وہ جھوٹ سے کام لے رہا ہے موسیقی کے مشاہیر میں ایسے کئی لوگ آئے تھے جو انتہائی مشکلات میں بھی صبر کا دامن نہیں

چھوڑتے تھے۔ اور پھر بخت جمال تو خود اپنے ہی اعمال کا شکار دو برو سے شاکی تھا۔ موسیٰ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور نہ ہی اپنے دوست کی طرف دیکھنے کی ضرورت محسوس کی۔

چوک والے بس سٹاپ پر لڑکیاں غول در غول بس کے انتظار میں ادھر ادھر ٹہل رہی تھیں۔ کچھ آپس میں کھسر پھسر کر رہی تھیں اور کچھ بے باک نگاہوں سے مردوں کو گھورتی ہوئی کھلکھلا کر ہنس رہی تھیں۔ موسیٰ اور بخت جمال بھی ایک طرف کھڑے ہو گئے تھے موسیٰ جھینپت رہا تھا۔ اس کے برعکس بخت جمال کی نگاہیں چار سُو پھسل رہی تھیں۔ ابھی وہ چست اور شوخ لباس والی لڑکی کو دیکھ رہا تھا جس کے کانوں میں ٹاپس جگ مگ جگ مگ کر رہے تھے۔ اور گلے میں موتیوں کا ہار جھول رہا تھا۔ اور جس کے گریبان کا چاک کافی کشادہ دیکھنے والوں کو دعوتِ نظارہ دے رہا تھا۔ کہ اس کی نگاہیں سب سے الگ تھلگ کھڑی سادہ لباس پہنے ایک چھریرے بدن کی لڑکی پر پڑیں۔

"یہ لڑکی کبھی تو مجھے کھا جانے والی نگاہوں سے گھورتی ہے اور کبھی اتنی لاتعلق بن جاتی ہے کہ میں اپنے غصے پر قابو نہیں پا سکتا۔ سمجھ میں نہیں آتا میں اپنی اہمیت کیسے جتاؤں"۔

بخت جمال نے سائبان کے قریب کھڑی مطالعہ میں محو ایک لڑکی کی طرف اشارہ کرتے کہا۔ موسیٰ کو یہ سادہ سی لڑکی بڑی پُروقار معلوم ہوئی "یہ لڑکی تو میرے اعصاب پر سوار ہوتی جا رہی ہے۔ کتنی ہی مرتبہ

میں نے اس کی طرف نہ دیکھنے کی قسم کھائی ہے۔ لیکن ہر مرتبہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔" بخت جمال کی گفتگو ابھی جاری تھی کہ بس نمودار ہوئی اور دائرے کا لمبا چکر لگا کر سٹاپ پر آن رکی۔ سب سے پہلے لڑکیاں ایک دوسرے کو دھکیلتی ہوئی۔ ہڑبونگ مچاتی بس میں داخل ہوئیں اور اگلی سیٹوں پر بیٹھ کر چہکنے لگیں۔ دوسرے دروازے سے مردوں نے یلغار کی جن میں کالج اور سکولوں کے طلبا، لڑکیوں کے پیچھے نشستوں پر جگہ حاصل کرنے کے لئے پیش پیش تھے۔ بس کی آخری تمام نشستیں خالی پڑی تھیں لیکن طلبا، اگلی نشستوں کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ الجھ رہے تھے اور اول فول بک رہے تھے۔ سب اپنے اپنے دلوں کے چوروں سے واقف تھے لیکن پھر بھی انجان بن کر دوسروں سے اپنی شرافت کا لوہا منوانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ موسیٰ اور بخت جمال کو درمیانی نشستوں پر جگہ مل گئی تھی۔ بخت جمال کی نگاہیں اب بھی کسی کو تلاش کر رہی تھیں۔ اگلی صفوں میں کھڑے بعض طلباء بار بار پیچھے کی طرف اس خیال سے دیکھ لیتے کہ پیچھے بیٹھے ہوئے لوگوں پر ان کی شرافت کی دھاک بیٹھ جائے۔

"ایک سیٹ بھی خالی نہیں ہے" لوہے کی موٹی سلاخ تھامے ہوئے ایک طالب علم دوسرے کو مخاطب کرتا۔ اور پھر دونوں آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے کرتے اور پھر بڑی عیاری سے وہ سامنے کھڑی لڑکیوں کو دیکھنے لگتے۔

"میں ان حرامزادوں کو اچھی طرح جانتا ہوں"۔ بخت جمال نے غصہ سے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ڈرائیور نے دو چار مرتبہ ہارن بجایا اور پھر سٹیرنگ پر ہاتھ رکھ کر بریک ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ گھر گھر کرتی بس چل پڑی۔ ایک شیطان طالب علم نے باہر جھانکتے ہوئے ڈرائیور کو گاڑی ٹھہرانے کی ہدایت کی۔ اور ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر کسی کا انتظار کرنے لگا۔ اتنے میں تین چار لڑکیاں ہانپتی ہوئی بس میں چڑھ گئیں۔ وہ ہانپتی، ہنستی ہوئی لڑکوں کے آگے کھڑی ہو گئیں۔ جہاں لڑکیوں کی بھیڑ تھی۔ اور وہ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتی تھیں۔ دونوں شیطان طالب علموں نے ایک دوسرے کی جانب معنی خیز نگاہوں سے دیکھا اور پھر وہ لڑکیوں کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔ ایک جھٹکے کے ساتھ بس دوبارہ روانہ ہوئی۔ اگلے سٹاپ پر چند اور طلباء اور طالبات اچک کر بس میں داخل ہوئیں۔ طالبات ایک دوسرے سے پیوست کھڑی ہو گئیں۔ کنڈیکٹر کے بار بار اصرار کے باوجود طلباء اپنی جگہ سے ایک انچ نہ ہلے۔ اب دو چار لڑکوں کے جسم دو چار لڑکیوں کو چھو رہے تھے۔ لڑکیوں نے بار بار آگے سرکنے کی کوشش کی۔ لیکن جگہ کی قلت انہیں ایک انچ بھی آگے نہ بڑھنے دیتی۔ آخر تھک ہار کر انہوں نے حالات سے مفاہمت کر لی۔ اور جہاں کھڑی تھیں وہیں ڈٹ گئیں۔ اگلے چند سٹاپوں پر بس بالکل نہ رکی۔ اب

تو پائیدان پر بھی تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ سٹاپ آنے سے پیشتر ہی کنڈیکٹر سیٹی بجاکر ڈرائیور کو گاڑی نہ روکنے کی ہدایت کر دیتا۔

ریلوے سٹیشن کے سٹاپ پر بس رُک گئی۔ اور ایک ایک کرکے لڑکیاں اترنے لگیں۔ شیطان طالب علم کے ساتھ لگی ہوئی۔ اب بھی ایک لڑکی کھڑی اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی۔ یہ وہی سادہ لباس والی پروقار اور عظیم لڑکی تھی۔ جو بخت جمال کے اعصاب پر بری طرح سوار تھی۔ موسیٰ نے بڑے دکھ سے اپنے دوست کی طرف دیکھا جس کی خون آشام نگاہیں اب بھی اسی لڑکی پر جمی ہوئی تھیں۔

موسیٰ اور بخت جمال بس سے اتر کر جدا ہو گئے۔ بخت جمال فٹ پاتھ کے آخری سرے پر ایک برگزیدہ درخت کی جانب بڑھنے لگا جس کے پتے بے موسم جھڑ رہے تھے مگر جس کا سایہ فٹ پاتھ کے ایک حصے کے علاوہ گرد و نواح کے بیشتر حصے پر محیط تھا اسی سائے میں بہت ساری لڑکیاں یکجا تھیں اور ان لڑکیوں کی چمک دمک بخت جمال کو اپنی جانب مقناطیس کی طرح کھینچ رہی تھی۔ فٹ پاتھ پر بخت جمال نے ایک ٹھوکر کھائی مڑ کر موسیٰ کی طرف دیکھا اور پھر مسکراتا ہوا آگے بڑھ کر لڑکیوں کے جھرمٹ کے قریب کھڑے ہو کر آنکھیں سینکنے لگا۔ موسیٰ نے ادھر ادھر دیکھا ابھی جامعہ کی خصوصی نیلے رنگ کی بس ریلوے سٹیشن پر نہیں پہنچی۔

تھی۔ لیکن جہاں بس آکر رکتی تھی وہاں چند طلبا اور طالبات کھڑی محو انتظار تھیں۔ موسیٰ فٹ پاتھ سے اتر کر اسی سمت بڑھنے لگا۔ ریلوے سٹیشن کے گھڑیال میں آٹھ بج رہے تھے اور اس کی اپنی گھڑی میں آٹھ بجنے میں تین منٹ باقی تھے۔ ابھی وہ طلبا کے قریب پہنچا ہی تھا۔ کہ جامعہ کی بس ہارن بجاتی سٹیشن کے سامنے گول دائرے میں نمودار ہوئی۔ اور ایک لمبا چکر کاٹ کر اپنے سٹاپ پر آکر رک گئی۔ طلبا اور طالبات ایک وقار اور نظم وضبط کے ساتھ ایک ایک کرکے بس میں چڑھنے لگیں اور سب چپ چاپ اپنی اپنی نشستوں پر باادب بیٹھ گئیں۔ لڑکیاں سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے باتیں کر رہی تھیں اور پیچھے بیٹھے ہوئے مرد سرگوشیوں کو سننے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ شور وغوغا اور ہلڑ مچانے والوں سے نکل کر اس بس میں بیٹھے ہوئے موسیٰ کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ عجائب گھر کی مورتیوں کے درمیان آن بیٹھا ہو۔ کتنی عجیب گمبھیرتا اور سکون کا مظاہرہ ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے پیچھے بیٹھے ہوئے طالب علم کے سانس کے لمس تک کو محسوس کر سکتا تھا۔

لیکن ایک ڈبلی پتلی سانولی سی لڑکی نے بس میں داخل ہوتے ہی اس گمبھیرتا اور سکوت کا شیرازہ درہم برہم کر دیا۔ یہ لڑکی شوخ رنگ کی ساڑھی میں ملبوس تھی۔ اور بناؤ سنگار میں سب پر

سبقت لے گئی تھی۔ اس سے نچلا بیٹھا ہی نہ جاتا تھا۔ کبھی ایک اور کبھی دوسری لڑکی سے نوک جھونک کرتی اور پھر کسی لڑکے سے آنکھیں چار ہوتے ہی جھینپ جھینپ جاتی۔ اس کے منہ کا دھانہ تنگ تھا۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور ہونٹ لٹک رہے تھے۔ لمبوترے چہرے پر ایک ناک ہی قدرے گوارا تھی۔ دو ایک بار پیچھے مڑ کر دیکھ لینے سے موسٰی نے اندازہ لگایا کہ اس کے ہلالی ابرو مصنوعی تھے اور موسٰی تصنع سے شدید نفرت کرتا تھا۔ اس لئے جب وہ لڑکی آنکھیں مٹکا کر دوسری لڑکیوں سے چھیڑ خوانی کرتی تو موسٰی کے غصے کی انتہا نہ رہتی۔

بس کا کنڈیکٹر جس نے ایکٹروں ایسے بال چھوڑ رکھے تھے ٹکٹ یا پاس چیک کرتا ہوا موسٰی کے سر پر آن کھڑا ہوا۔

"میں نے ابھی پاس نہیں بنوایا کل ہی آیا ہوں۔ آج بن جائیگا" موسٰی نے کنڈیکٹر کے استفسار پر جواب دیا۔

"میں مجبور ہوں جناب! حکم نہیں ہے۔ آپ مہربانی کر کے بس سے اتر جائیے!"

کنڈیکٹر نے دوسری سواری کے پاس پہ نشان لگاتے ہوئے بڑی ڈھٹائی سے کہا۔

"لیکن میں ٹکٹ خریدنا چاہتا ہوں۔ آج کے سفر کے لئے آپ مجھے ایک ٹکٹ کاٹ دیں۔" موسٰی نے جیب سے چند سکے

نکال کر کنڈیکٹر کی طرف بڑھاتے جواب دیا۔ لیکن کنڈیکٹر پھر بھی نہ مانا۔ اس نے تاویل پیش کی کہ ٹکٹ دفتر میں ملتے ہیں۔ یہاں نہیں اس لئے موسٰی کو مجبوراً بس سے اترنا پڑا۔ ابھی اس نے پائیدان پہ قدم رکھا ہی تھا۔ کہ پیچھے سے ایک خاتون نے آواز دی۔

"ٹھہریئے! میرے پاس ایک ٹکٹ فالتو ہے"، موسٰی نے مڑ کر دیکھا مس برکت مسیح اپنی جگہ پر کھڑی اس سے مخاطب تھی۔ موسٰی نے ممنون ہو کر دوبارہ اپنی نشست سنبھالی۔ تمام سواریوں کے ٹکٹ یا پاس پر نشان لگا کر آخر کنڈیکٹر نے ڈرائیور کو اشارہ کیا اور بس روانہ ہو گئی۔

طبی کالج کے سٹاپ پر طالب علموں میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ خصوصاً کھڑکیوں کے قریب بیٹھے ہوئے۔ طلبا بار بار باہر جھانکتے اور پھر اشاروں کنایوں میں ایک دوسرے کو کچھ سمجھاتے یہ معمہ تب حل ہوا جب ایک نہایت حسین و جمیل خاتون لمبی گردن اور شانوں پر بال بکھرائے، سفید ساڑھی پہنے بس میں ایک دلفریب ادا سے مسکراتی داخل ہوئی۔ دو ایک طالب علموں نے تعظیماً اٹھ کر اس کے لئے اپنی اپنی نشستیں پیش کیں۔ لیکن وہ شکریہ ادا کرتی آگے بڑھ گئی۔ اور سب سے اگلی نشست پر لڑکیوں کے ساتھ سمٹ سکڑ کر بیٹھ گئی۔

"واہ! مزہ آ جائے گا۔ آج پروفیسر نسیم پھر کلاس لیں گی۔"

موسیٰ کے آگے بیٹھے ہوئے ایک طالب علم نے دوسرے کے کان میں سرگوشی کی۔ بس پھر چل پڑی اور متعدد موڑ مڑتی ہوئی جامعہ کی حدود میں پہنچ کر ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ طالبات کے بعد ایک ایک کر کے طالب علم بس سے اترے اور ٹولیوں میں بٹ کر بجری بچھی ہوئی سڑک پر بڑھتے آپس میں باتیں کرنے لگے۔ اب وہ قہقہے لگا رہے تھے تیز تیز باتیں کر رہے تھے جیسے وہ طلسم ٹوٹ چکا ہو جس نے ان کی زبان بند کر رکھی تھی۔

"لڑکی جب تک لڑکی رہتی ہے۔ معصوم اور پُرخلوص رہتی ہے لیکن جوں ہی وہ لڑکپن کے حدود سے باہر آجاتی ہے۔ اور زمانے کی گرم سرد ہوا کا لمس محسوس کر لیتی ہے وہ ایک ایسا پھول بن جاتی ہے جو بظاہر خوبصورت تو لگتا ہے مگر خوشبو سے عاری ہوتا ہے" موسیٰ نے اپنے آگے بڑھتی ہوئی مس برکت مسیح اور مس شہلا کے متعلق سوچا۔ جو چست لباس کے ساتھ ایک ہی قسم کے فوری جوتے پہنے اور ایک ہی رنگ کے دوپٹے اوڑھے ہوئے تھیں۔ یہ عجیب اتفاق تھا۔ دونوں الگ الگ معاشرے کی افراد تھیں لیکن دونوں کے مزاج میں کس قدر موافقت پائی جاتی تھی۔ موسیٰ کے لئے یہ ایک بالکل نئی دریافت تھی۔ کم از کم اپنے معاشرے میں وہ اس کے متعلق سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ خصوصاً ایک ٹکٹ کے عوض موسیٰ کا دل مس برکت مسیح کے لئے شکرگذاری کے انتہائی جذبے سے معمور ہو گیا تھا

بڑے بڑے مستطیل برآمدوں سے ہوتا ہوا اور دفتروں کی مختلف تختیاں پڑھتا، وہ ان دونوں لڑکیوں کے پیچھے پیچھے بڑھتا ہوا محرابی سیڑھیوں پر

چڑھنے لگا۔ "ٹھک ٹھک۔ ٹھک ٹھک" اونچی ایڑی کے ان جوتوں میں کتنی جاذبیت تھی۔ ایک ساتھ ایک آواز اور ایک ردھم کے ساتھ دونوں سیڑھیوں پر چڑھ رہی تھیں۔ ٹھک ٹھک کی اس مسلسل آواز نے موسیٰ کے ذہن میں ماضی کے دریچے کھولنے شروع کئے۔ ماضی بعید جبکہ اس کے ملک پر انگریزوں کا راج تھا۔ وہ ایک فوجی ہیڈکوارٹر میں کام کر رہا تھا ایک انگریز سارجنٹ لڑکی کے سینڈل کی آواز ایسے ہی اس کے کانوں کے پردوں سے ٹکرایا کرتی تھی۔ پھر جب جاپان فتح ہو گیا تھا۔ اور موسیٰ رضاکارانہ طور پر ٹوکیو جا رہا تھا۔ تو اس انگریز لڑکی نے اسے ٹوکیو جانے سے روکا تھا۔

"اپنا ملک چھوڑ کر نہ جاؤ جوان! ـــ اپنے وطن کی مٹی میں بڑی مٹھاس ہوتی ہے" انگریز لڑکی نے اس سے بڑی حسرت سے کہا تھا۔

چوکیدار نے دفتر کے تمام کمرے کھول رکھے تھے۔ اور چپڑاسی جھاڑ پونچھ میں مصروف تھے۔ پہلے دو کمرے خالی تھے۔ نہ ابھی تک کلرک آئے تھے۔ اور نہ ہی مس امتیاز دکھائی دے رہی تھیں۔ موسیٰ اپنے کمرے میں داخل ہوا اور کرسی پر بیٹھ کر آج کے کام کی فہرست مرتب کرنے لگا۔ دس پندرہ منٹ بعد دفتر میں چہل پہل شروع ہوئی۔ مس برکت مسیح، مس شہلا، مس امتیاز اور مس ہارون ایک دوسرے سے چہلیں کرتی برآمدے میں سے گزریں۔ تھوڑی ہی دیر بعد مس برکت مسیح اور شہلا موسیٰ کے کمرے کا دروازہ کھولکر اندر داخل ہوئیں۔

"صبح کا سلام! مسٹر موسیٰ!!" مس برکت نے سلام کیا اور پھر ادھر ادھر کچھ ڈھونڈنے لگیں۔

"چپڑاسی کہہ رہا تھا۔ ناظم صاحب نے حاضری کا رجسٹر آپ کے کمرے میں رکھوا دیا ہے۔ اب ہم حاضری یہاں لگایا کریں گی" یہ کہہ کر مس برکت کھڑکی کے تختے پر پڑے ہوئے رجسٹر کی جانب لپکیں۔

"وہ رہا۔ ہاں۔ وہی ہے۔ یہ ہمارا اعمال نامہ ہے۔ ناظم صاحب کہتے ہیں۔ جس روز ہم غیر حاضری کرتی ہیں۔ رجسٹر میں سرخ نشان اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ آج ہم نے ضرور کوئی نہ کوئی گل کھلایا ہے"۔

موسیٰ نے دونوں لڑکیوں کی طرف باری باری دیکھا اور مسکرا کر پھر اپنے کام میں محو ہو گیا۔ "کتنی بے تکلف ہیں یہ لڑکیاں!" وہ دل ہی دل میں اس خیال سے محظوظ ہوا۔

"لائبریری کے لئے خریدی ہوئی کتابوں کی رقم کی ادائیگی آج ضروری تھی۔ اس نے عجلت سے کام لیتے ہوئے کاغذات کو مکمل کرنا شروع کیا۔ پھر اسے خیال آیا کہ اس کام سے ضروری مس برکت مسیح کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ جو آڑے وقت میں اس کے کام آئی تھی۔

"یہ تو کوئی بات ہی نہیں محاسب صاحب!" مس برکت مسیح نے رجسٹر پر دستخط کرتے موسیٰ سے کہا "وہ یہ میرا فرض تھا۔ بہتر ہے آپ بھی ٹکٹ ہی خریدیں۔ پاس بنوانے میں سراسر گھاٹا ہے"۔

"بس کے ٹکٹ کہاں ملتے ہیں مس برکت؟" موسیٰ نے قلم میز پر

دیکھ کر مس برکت مسیح کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"ٹکٹ صدر دفتر سے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ پانچ روپے کے ٹکٹ مہینے بھر کے لئے کافی ہوں گے"

مس برکت نے رجسٹر مس شہلا کی طرف بڑھاتے جواب دیا مس شہلا نے میز پر پڑا ہؤا موسیٰ کا قلم اٹھایا اور دستخط کر کے واپس اپنی جگہ پہ رکھ دیا۔ اتنے میں عملے کے دیگر کلرک بھی آگئے اور رجسٹر پر دستخط کے بہانے لڑکیوں سے نوک جھونک کرنے لگے۔ موسیٰ اکتا کر پھر اپنے کام میں منہمک ہو گیا۔

ساتھ والے کمرے سے جہاں مس امتیاز بیٹھتی تھیں زور زور سے باتوں اور قہقہوں کی ملی جلی آوازیں آرہی تھیں۔ ناظم صاحب صبح ہی صبح محکمۂ بحالیات کے اجلاس میں شرکت کرنے تشریف لے گئے تھے۔ لہٰذا تحقیقی عملے کو فراغت تھی اور وہ سب مرد و زن مس امتیاز کے کمرے میں اکٹھے ہو کر گپیں ہانک رہے تھے۔

ایک بل پہ درج شدہ رقم مشکوک تھی۔ موسیٰ وہ بل لیکر مس ہارون سے دریافت کرنے اس کے دفتر کی طرف بڑھا۔

مس ہارون اپنے دفتر میں موجود نہیں تھیں۔ موسیٰ مس امتیاز کے کمرے کے سامنے ٹہلنے لگا۔ وہ یہ سوچ رہا تھا مس امتیاز کے کمرے میں داخل ہوتا کہیں دخل در معقولات تو نہ ہوگا۔ کہ مس امتیاز اپنے کمرے سے باہر جھانکیں اور چپڑاسی کو آوازیں دینے لگیں۔

"ملازم حسین! ۔ ملازم حسین!!" اچانک اس نے موسیٰ کو دیکھا۔ اور سلام کیا۔ موسیٰ خفیف سا ہو کر اس کی طرف بڑھا۔

"میں مس ہارون کو ڈھونڈھ رہا تھا۔ وہ آپ کے کمرے میں تو نہیں بیٹھیں؟"

"جی ہاں۔ بیٹھی ہوئی ہیں۔ فرمائیے!"

"ذرا یہ بل انہیں دکھا دیں۔ مجھے یہ بل کچھ مشکوک دکھائی دے رہا ہے"۔

"اندر چلے جائیں موسیٰ صاحب! ۔ آپ خود ہی دریافت کر لیں"۔ مس امتیاز نے مسکرا کر بات بڑھائی۔ "آپ سے کوئی پردہ نہیں"۔

چپراسی ملازم حسین بھاگا آگیا تھا۔ مس امتیاز نے اُسے چائے لانے کا آرڈر دیا۔ اور موسیٰ سے دوبارہ مخاطب ہوئیں۔

"آئیے نا موسیٰ صاحب! ۔ اندر تشریف لے آئیں ۔ بے کھٹکے چلے آئیں" مس امتیاز کے پیچھے پیچھے موسیٰ جھجکتا کمرے میں داخل ہوا۔ سامنے مس ہارون بیٹھی ہوئی تھیں اور اس کے اردگرد تحقیقی عملہ احاطہ کئے ہوئے تھا جب وہ اندر داخل ہُوا تو اس وقت جبار صاحب علم الانسان پہ بحث کر رہے تھے۔

"آج سے کروڑوں برس پہلے جب انسان غاروں میں رہتا تھا۔ اور اپنا جسم درختوں کے پتوں سے ڈھانکتا تھا۔ تب بھی وحشی اور برابر تھا۔ اور اگر سنجیدگی سے سوچا جائے تو آج بھی انسان ویسا ہی وحشی اور درندہ ہے۔ اب عورت ہی کو لیجیے! کیا آپ سمجھتے ہیں عورت میں کوئی بنیادی

تبدیلی واقع ہوئی ہے ؟" لیکن موسیٰ کو دیکھ کر جبار صاحب نے چپ سادھ لی تو سب کی نگاہیں موسیٰ پر مرکوز ہو گئیں اور ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

"معاف کیجئے! اس بے جا مداخلت کے لئے معذرت خواہ ہوں" موسیٰ نے مس ہارون کے چہرے پر ناگواری کے آثار دیکھ کر کہا ——

"میں دراصل آپ کے دفتر میں گیا تھا۔ آپ وہاں تشریف نہیں رکھتی تھیں۔ اور یہ معاملہ بے حد ضروری تھا۔ اس لئے مجھے یہاں آنا پڑا۔ آپ کو تکلیف تو ہوگی مگر ——"

"مطلب کی بات کریں جناب! ۔ فرمائیے ۔ آپ نے کیسے تکلیف کی؟" اپنی طرف سے مس ہارون نے گویا اس کی شائستگی کا مذاق اڑایا لیکن موسیٰ نے اسے تلخ گھونٹ سمجھ کر پی لیا۔

"یہ بل مجھے مشکوک دکھائی دیتا ہے۔ مادام!" موسیٰ نے بل مس ہارون کی طرف بڑھاتے کہا۔ مس ہارون نے بل کو ایک نظر دیکھا اور جواب دیا۔

"کوئی مشکوک وشکوک نہیں ہے۔" مس ہارون نے بدستور ناگواری کا اظہار کیا۔ "یہ کتابیں میں نے خود خریدی ہیں۔ یہ رقم درست ہے۔ آج اس بل کی ادائیگی ہو جانی چاہیئے۔"

"اس کے علاوہ ——" موسیٰ نے بات جاری رکھی "چند کتب فروشان کے خطوط پڑے ہیں جن کا جواب دینا ضروری ہے۔ اور پھر چند تصفیہ طلب مسائل اور بھی ہیں۔ آپ کہیں تو وہ تمام خطوط آپ کو دکھا دوں؟"

"آپ وہ تمام خطوط میرے دفتر میں رکھ دیں۔ فارغ ہو کر میں خود ہی آپ کو بلا لوں گی۔" مس ہارڈن کا تحکمانہ لہجہ موسیٰ کو کھٹکنے لگا لیکن ابتدائی مرحلہ جان کر اس نے یہ بھی سہہ لیا۔ کہ ملازمت میں یہ سب کچھ سہنا ہی پڑتا ہے

موسیٰ دل برداشتہ باہر نکل آیا۔ اس کے باہر نکلنے کی دیر تھی کہ اس کے پیچھے کمرے سے قہقہے گونجنے لگے۔ موسیٰ غصے میں بھرا ہوا آیا اور اپنی میز پر سے تمام کاغذات سمیٹ کر مس ہارڈن کے کمرے میں داخل ہوا اور اس کی میز پر تمام کاغذات پٹخ دیئے۔ وہ واپس مڑنے ہی لگا تھا۔ کہ ناگاہ اس کی نظر لوہے کے ریک میں سجی ہوئی بے شمار کتابوں پر پڑی اور وہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ کتابوں کا مطالعہ اس کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ ایک ثانیے کے لئے اس نے سارا غصہ تھوک دیا اور بڑے انہماک سے کتابوں کے نام پڑھنے لگا۔ پھر اس نے ایک کتاب اٹھالی اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔

جن کتابوں سے یہ طالب علم نام نہاد ڈگریاں حاصل کرتے تھے۔ وہ ان کا مطالعہ محض تفنن طبع کے لئے کیا کرتا تھا۔ پھر اس نے سوچا۔ کتابوں کا مطالعہ بجز وقت گذاری کے ذریعے کے اور کچھ بھی نہیں۔ زندگی کا ایک ایک لمحہ انسان کو جو کچھ سکھاتا ہے۔ ہزاروں برس کے مطالعے سے بھی وہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ سقراط، بقراط، ارسطو، شوپنہار، سپائی نوزا اور کانٹ وغیرہ کی فکر اور فلسفہ برس ہا برس کے مشاہدات اور تجربے کا نچوڑ ہیں۔ برسوں کے مشاہدے کے بعد داخلی طور پر جو کچھ انہوں

نے محسوس کیا۔ صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیا۔ اور آج ان کے تجربوں سے دنیا فائدہ اٹھا رہی ہے۔ سوچا جائے تو ان فلسفیوں کو اس کا نعم البدل کیا ملا؟ زندگی بھر کا نچوڑ دنیا کے سامنے رکھ کر انہوں نے خود کیا پایا؟ زہر کا لبالب بھرا ہوا جام! — یا خواریاں، رسوائیاں اور ذہن کو ماؤف کر دینے والی تنہائیاں!! — بے چارہ اسپائی نوزا!! — پندرہ بیس برس کی جلاوطنی کے بعد جب وہ پائپ منہ میں دبائے میلے کچیلے کپڑے پہنے اور بوسیدہ ہیٹ کے ساتھ کبھی کبھی گلی کے نکڑ پر کھڑا دکھائی دیتا تو لوگ اسے اعجوبۂ روزگار سمجھ کر اس کا تمسخر اڑاتے، اس پر پھبتیاں کستے۔ اور یہ جو ساتھ والے کمرے میں بیٹھے ہوئے نام نہاد محققین ہیں۔ دنیا بھر کے مسائل پر گوہر افشانیاں کر رہے ہیں۔ تہذیب و تمدن کے ارتقاء پر بڑے بڑے لیکچر دیتے ہیں اور اپنی بے کار محض قسم کی لکھی ہوئی روئیدادوں کے ایک ایک صفحے پر اپنے نام کے ساتھ ڈگریوں کے لیبل چسپاں کرتے رہتے ہیں۔ تحقیق و تجسس کی روح کو بھی سمجھتے ہیں؟ — یا محض اپنا اور لوگوں کا وقت ضائع کرنے یکجا ہوئے ہیں؟ —

کتابوں کی ورق گردانی کرتے ہوئے موسیٰ کو خاصی دیر لگ گئی۔ ابھی وہ قرون اولیٰ کے تمدن اور معاش پر لکھی ہوئی ایک کتاب کا سرسری جائزہ لے رہا تھا کہ مس ہارڈن دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ پہلے اس نے موسیٰ کی طرف خشمگین نگاہوں سے دیکھا اور پھر آپ ہی آپ مسکرا دی۔

"ان میں سے ایک کتاب بھی آپ کے پڑھنے کی نہیں مسٹر!" مس

ہارون نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے موسیٰ پر طنز کیا۔

"میں جانتا ہوں مس ہارون!" موسیٰ نے اس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے جواب دیا۔

"یوں ہی دیکھ رہا تھا اور پھر مجھے تو انگریزی زبان سے ویسے بھی للّہی بُغض ہے۔"

"کم پڑھے لکھے لوگ اکثر یہی کہا کرتے ہیں۔ دراصل وہ احساسِ کمتری کے شکار ہیں" مس ہارون نے کاغذات کے پلندے کو جانچتے ایک اور چوٹ کی۔

"آپ نے اردو ادب کا مطالعہ کیا ہے؟"

"نہیں۔ اردو کیا انگریزی کیا میں ادب کا سرے سے مطالعہ ہی نہیں کرتی۔ ریسرچ کرنے سے فرصت ہی کب ملتی ہے۔"

"انسان کو نئی نئی تہذیبوں سے روشناس کرانے والا دراصل ادب ہی ہے۔ نئی تہذیب ادب ہی کی پروردہ ہے۔ ادب کی تخلیق رک جائے تو تمدن اپنی موت آپ مر جائے۔"

"اچھا!" ۔ مس ہارون نے حیرت و استعجاب سے موسیٰ کی طرف یوں دیکھا جیسے چھوٹے آدمی کے منہ سے بڑی بات نکل گئی ہو۔

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ ادب کا مطالعہ شوق سے کرتے ہیں۔ پھر تو آپ کا وجود ہمارے دفتر پر ایک بوجھ ہی ہوگا۔ کیونکہ ادب کے شائقین اکثر خیالی پلاؤ پکاتے رہتے ہیں۔ اور عملی لحاظ سے بالکل اپاہج ہوتے ہیں۔

اس دفتر میں کام کرنا ہے تو خیالی پلاؤ پکانا چھوڑ دیجئے - اپنی انتھک محنت سے یہ ثابت کیجئے کہ آپ اس عہدے اور مرتبے کے اہل ہیں۔"

مس ہارڈن کے اس ہتک آمیز لہجے سے موسیٰ کا پارہ ایک دم چڑھ گیا۔ اس کا دماغ شائیں شائیں کرنے لگا۔ اور اس کے خون میں ایک تموج پیدا ہوا۔ "تو اس کے متعلق اعجاز نے جو کچھ اسے بتایا تھا درست ہے یہ لڑکی مغرور بھی ہے۔ متکبر بھی، منہ پھٹ اور بدتہذیب بھی" موسیٰ نے اس کے متعلق سوچا۔ وہ چاہتا تو ترکی بہ ترکی جواب دے سکتا تھا۔ لیکن اس نے نفرت سے منہ پھیر لیا اور ایک لفظ منہ سے نکالے بغیر چپ چاپ کمرے سے نکلنے لگا۔

"کہاں چلے مسٹر!" مس ہارڈن نے اس کے پیچھے پیچھے آواز دی اور وہ رک گیا۔

"یاد رکھیں جب کبھی میرے پاس کتابوں کی خرید سے متعلق کاغذات بھیجیں۔ متعلقہ فائل میں لگا کر بھیجا کریں۔ کلرکوں کی یہ عادت بہت بری ہے۔ لاکھ سمجھانے پر بھی وہ بار بار اسی غلطی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ ویسے آپ ٹائپ کرنا جانتے ہیں؟"

"ہاں۔ رفتار کچھ سست ہے" موسیٰ نے خون کا گھونٹ پی کر مردہ دلی سے جواب دیا۔

"تو اپنی رفتار تیز کر لو۔ اس دفتر میں سست رفتاری سے ٹائپ کرنے والے کلرکوں کی ضرورت نہیں۔"

موسیٰ نے چاہا کہ وہ اسے صاف صاف بتا دے کہ وہ اس محکمے میں کلارک کی حیثیت سے نہیں بلکہ محاسب کی حیثیت سے بھرتی ہُوا ہے اور محاسب کے لئے ضروری نہیں کہ وہ ٹائپ کرنا بھی جانتا ہو۔ لیکن پھر مصلحت کے تحت خاموش رہا۔ ایک موسیٰ ہی نہیں۔ اس مصلحت نے ہر ادنیٰ ملازم کا سر جھکا رکھا ہے۔

"میں کوشش کروں گا۔ مس ہارون! چند دنوں کی مشق سے یہ خامی دور ہو جائیگی" اس نے اپنے گریبان میں سر ڈال کر کہا۔

"یہ میں اس لئے کہہ رہی تھی۔ کیا نام بتایا تھا آپ نے۔ ہاں مسٹر موسیٰ! — کہ ہمارے دفتر میں ایک گستاخ قسم کا کلرک ہے جس کا نام اعجاز ہے۔ جب کبھی وہ میری رد ئیدادیں ٹائپ کرتا ہے تو یوں ظاہر کرتا ہے جیسے مجھ پر بڑا احسان کر رہا ہو۔ نواب بنا پھرتا ہے۔ ایسی ہی بات ہے۔ تو اپنے گھر کیوں نہیں بیٹھ جاتا۔ ملازمت کریگا تو کام کرنا ہی پڑے گا"

"ملازمت ایک روگ ہے مس ہارون! جس کسی کو یہ روگ لگ جائے، عمر بھر اس سے چھٹکارا نہیں پا سکتا"

"ملازمت روگ نہیں مسٹر موسیٰ!۔ ملازمت عزت ہے عزت! بڑے بڑے نواب یہ عزت حاصل کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی ملازمت اختیار کر لیتے ہیں۔ مجھے ملازمت کی کیا ضرورت ہے۔ میرے والد کامیاب ڈاکٹر ہیں۔ میں گھر بیٹھے اچھا کھا پی سکتی ہوں۔ لیکن گھر کی قید مجھے بھی اُن عام لڑکیوں میں شمار کریگی۔

جنہیں ہمارے معاشرے نے زنجیریں پہنا رکھی ہیں"۔

"تو گویا آپ نے یہ قدم معاشرے سے بغاوت کی خاطر اُٹھایا ہے"

"معاشرے سے بغاوت انسان کی جبلت ہے۔ جو لوگ لکیر کے فقیر بن کر زندگی گذارتے ہیں۔ کبھی ترقی کا منہ نہیں دیکھتے۔ انسان کی ترقی کا راز اسی میں مضمر ہے کہ وہ نئے دور کے نئے حالات اور نئی اقدار کا ساتھ دے"

"چاہے وہ قدریں روبہ تنزل ہی کیوں نہ ہوں۔ قدیم اقوام کے تمدن کے مطالعہ سے یہ بات صاف ظاہر ہوگئی کہ جن اقوام نے اپنے معاشرے سے بغاوت کی ہے۔ قعرِ مذلت میں ڈوب گئی ہیں اور ان کا نام ہمیشہ ہمیشہ کے لئے صفحۂ ہستی سے مٹ چکا ہے"۔

"یہ ایک دقیانوسی خیال ہے مسٹر موسیٰ!۔ فی زمانہ اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ نچلا طبقہ ابھرنے میں ناکام رہ کر ایسی ہی بے بنیاد دلیلیں پیش کرتا ہے"

میں طبقاتی تقسیم پر مبنی نظام کی بات نہیں کر رہا مس ہارون!۔ بلندی اور پستی محض ایک انسان کے دوسرے انسان پر برتری حاصل کرنے کے احساس نے جنم دی ہیں۔ ورنہ پیدائش کے وقت بچہ مادرزاد ننگا جنم لیتا ہے۔ پھر کوئی اسے چیتھڑوں میں لپیٹ لیتا ہے اور کوئی اسے زربفت و ریشم و کمخواب میں ڈھانپ لیتا ہے۔ کیا شہزادی مارگریٹ کا اپنی پیدائش میں کوئی ہاتھ ہے؟۔

نہیں کوئی نہیں۔ وہ ایک بھکاری کے گھر جنم لیتی تو شہزادی ہرگز نہ کہلاتی۔ محض ایک معمولی سی لڑکی مارگریٹ ہوتی۔ اور اس جیسی لاکھوں انگلینڈ کی گلی کوچوں میں روز جنم لیتی رہتی ہیں۔ وہ ایک شہزادی نہ ہوتی تو اس کے عشق کے چرچے کبھی اتنے نہ پھیلتے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ محض ناکام عشق نے اسے شہرتِ دوام بخش دی ہے۔"

مس ہاردن کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ "وہ عجیب آدمی ہیں آپ بھی ملازمت پر بحث ہو رہی تھی اور آپ نے اسے عورتوں کے عشق تک طول دے دیا۔

مسٹر موسٰی! ہمارے ڈیپارٹمنٹ کا بیشتر عملہ لڑکیوں پر مشتمل ہے آپ کو اپنی گفتگو میں احتیاط برتنی چاہیئے۔ یہ باتیں کسی اور لڑکی کے سامنے نہ کرنا۔ اب میں آپ کو کتب فروشان کے بلوں کی ادائیگی کے متعلق بتاتی ہوں۔ ان میں سے یونائیٹڈ پبلشر والے کو رقم ادا کی جا چکی ہے۔ یہ خط دراصل بہت پرانا ہے۔ اس کے جواب کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور یہ جو خاقان کتب فروش ہیں انہوں نے پانچ کتابیں آئندہ بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔ ہم نے انہیں ایک خط بھی لکھا تھا۔ اسی سلسلے میں آپ اعجاز سے رابطہ قائم کریں اسی خط کا حوالہ دیکر انہیں تاکید کر دیں کہ جب تک وہ پانچ کتابیں ارسال نہیں کریں گے۔ تب تک ان کی بقایا رقم کی ادائیگی نہیں ہو سکتی۔ اور باقی بل ٹھیک ہیں۔ ان سب کو چیک کاٹ کر روانہ کر دو۔"

موسٰی نے حکم کی تعمیل میں ہامی بھری اور مس ہاردن کے دفتر سے باہر نکل آیا۔

"ہونہہ۔ بیشتر لڑکیاں ہیں!" اپنے کمرے میں آکر اس نے دل کا غبار نکالنا شروع کیا۔

"ایسی ہی عفت مآب ہیں تو دفتروں میں ماری ماری کیوں پھرتی ہیں؟ ملازمت کیوں اختیار کر رکھی ہے؟ گھر میں کیوں نہیں بیٹھ جاتیں؟" موسیٰ کام کرتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔

"آپ آ گئے موسیٰ صاحب؟!" اعجاز نے اس کے کمرے میں داخل ہو کر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

"آپ کہاں چلے گئے تھے؟ ہم ایک گھنٹے سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کوئی آپ کو اغوا نہ کرے۔"

"میں مس ہارڈن کے کمرے میں کام کر رہا تھا" موسیٰ نے ٹائپ کی مشین پر کاغذ چڑھاتے جواب دیا۔

"تو وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ گئے کام سے۔ بھئی۔ ہماری نصیحت کا گویا آپ پر کوئی اثر نہ ہوا۔"

اعجاز نے پتلون کی جیب سے کنگھا نکال کر بال سنوارتے کہا "جناب! میں نے پہلے بھی عرض کی ہے کہ مس ہارڈن بڑی خطرناک عورت ہیں۔ شکر چڑھی کونین کی گولی ہیں۔ باتیں بڑی مٹھاس سے کرتی ہیں لیکن جب وار کرتی ہیں تو اگلی پچھلی تمام کسر نکال لیتی ہیں۔ اب بھی وقت ہے۔ موسیٰ صاحب! میری نصیحت گرہ باندھ لیں اور اُن سے محتاط ہو کر باتیں کیا کریں"

"ہاں۔ اعجاز صاحب!۔ آپ درست فرماتے ہیں۔ کچھ کچھ اندازہ

میں نے بھی لگایا ہے۔ لیکن پھر بھی ہم پر عورتوں کا احترام لازم ہے۔
اپنی جانب سے ہمیں کوشش کرنی چاہیئے کہ ان کے جذبات مجروح نہ ہوں۔
شرافت کا تقاضا یہی ہے۔ مرد پر ہر حال میں عورت کی عزت لازم ہے۔"

"کیا خوب!" اعجاز نے چیں بجبیں ہو کر موسٰی پر چوٹ کی۔ "مس
ہارون جیسی عورتیں اس لائق ہیں۔ کہ ان سے جی بھر کے نفرت کی جائے۔
نہ جانے اس کا خمیر کس مٹی سے بنا ہے۔ عورت کے ماتھے پر ایک بدنما داغ
ہیں۔ داغ۔ آپ اسے عورت سمجھتے ہیں؟"

"میرے خیال میں مس ہارون بری عورت نہیں۔ دماغ ذرا اونچا ہے
ویسے غرور، تکبر اور رعونت تو تقریباً ہر عورت میں پائی جاتی ہے۔"

"چھوڑو جی!۔ موسٰی صاحب!۔ آپ بھی کیا بات کرتے ہیں۔ عورت
ہو کر وہ مردوں سے ایسی بدزبانی کرے۔ ملازمت کا معاملہ نہ ہوتا
تو میں اسے چھٹی کا دودھ یاد دلا دیتا۔

خیر۔ کبھی تو موقع ملے گا۔ اب یہ کام چھوڑو۔ گیارہ بج رہے ہیں۔
آؤ کنٹین میں بیٹھ کر چائے پئیں۔ بس اس جامعہ میں کنٹین ہی دیکھنے
کی چیز ہے۔ ہر میز پہ حسن، رنگین ملبوسات کی سرسراہٹ اور نقرئی قہقہے
جیسے بکھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ جی چاہتا ہے۔ ساری زندگی کنٹین کی
نذر کر دوں۔ آپ کی پلکیں تو ماشاءاللہ بڑی دراز اور گھنی ہیں جو حسن
میں آج تک نہ سمیٹ سکا۔ آپ چند لمحوں میں سمیٹ لیں گے۔"

موسٰی اپنی بے جا تعریف سے جھینپ گیا۔ اور میز کے نیچے مڑے

ہوئے کاغذ اٹھانے کے بہانے اپنی جھینپ چھپانے لگا۔ پھر اُسے خیال آیا کہ چیک کی کتاب تو لو ہے کے خزانے میں پڑی ہے۔ اور خزانے کا صندوق لائبریری میں رکھا ہوا ہے اور لائبریری کی چابیاں مس ہاردن کے قبضے میں۔ پھر کتب فروشان کو چیک کے ذریعے ادائیگی کیسے ہو سکتی ہے۔ اگر وہ مس ہاردن کے دفتر میں دوبارہ گیا۔ تو کہیں وہ بُرا نہ مان جائے۔ اس لئے اعجاز کے بار بار اصرار پر وہ اس کے ساتھ کنٹین میں چائے پینے چلا گیا۔

ایک کونے والی میز پر مس برکت مسیح اور مس شہلا بیٹھی ہوئی چائے پی رہی تھیں۔ علیک سلیک کے بعد وہ دونوں آگے بڑھ گئے اور ایک خالی میز پر بیٹھ گئے۔ واقعی کنٹین حسن کا مرقع تھا۔ تقریباً تمام میزوں کے ارد گرد طالبات، ایک سے ایک حسین براجمان تھیں۔ اور خورد و نوش کے ساتھ ساتھ اونچے اونچے قہقہے لگا رہی تھیں۔ کہیں کہیں طالب علم طالبات کی خاطر تواضع کر رہے تھے۔ اعجاز ادھر ادھر دیکھا آنکھیں سینکنے لگا۔ وہ ایک ایک طالبہ کو جانتا تھا۔ جیسے ان سب کا پرائیویٹ سیکرٹری رہ چکا ہو۔ چائے کا آرڈر دیکر اعجاز طالبات کے بارے میں ایسی ایسی گوہر افشانیاں کر رہا تھا۔ کہ موسیٰ پر سکتہ طاری ہو گیا۔

اچانک کونے والی میز نے ان کی توجہ اپنی جانب کھینچ لی۔ مس برکت مسیح مارے غصے کے کانپ رہی تھی۔ اور پاس کھڑے ایک طالب علم پر برس رہی تھی۔ جواب میں طالب علم بھی اسے جلی کٹی سنا رہا تھا۔ پھر

برکت مسیح سے برداشت نہ ہو سکا۔ اور وہ رونے لگی۔ پاس بیٹھی مس شہلا کا رنگ فق ہو گیا تھا اور وہ سہمی سہمی ادھر ادھر شاید کسی غائبانہ مدد کے لئے دیکھ رہی تھی۔ طالب علم چیخ رہا تھا۔

"کمینی!۔ میرے پیسے حرام کے نہیں تھے۔ جو تم ڈکار لئے بغیر انہیں ہضم کر گئیں۔" اس نے مس برکت مسیح پر طعن و تشنیع کی بوچھاڑ کر رکھی تھی پھر مس برکت نے چہرہ ہاتھوں میں ڈھانپ لیا اور رونے لگی۔

اچانک اعجاز کی نظر ان پر پڑ گئی۔ اور اس سے قبل کہ طالب علم کوئی اور لفظ منہ سے نکالتا۔ اعجاز نے کرسی پیچھے دھکیلی اور لپک کر طالب علم کو دبوچ لیا۔ پھر اس کی ناک پر ایسا گھونسا جمایا کہ اس کی ناک سے خون بہنے لگا۔ طالب علم لڑکھڑا کر دوسری میز پر گرا۔ ابھی وہ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ اعجاز نے دوبارہ اسے دبوچ لیا۔ اور اسے زمین پر گرا کر اس کی چھاتی پر بیٹھ "مکے" پر "مکے" اس کے منہ پر مارنے لگا۔ کنٹین میں افراتفری مچ گئی۔ لڑکیاں چیختی چلاتی ایک دوسرے سے ٹکراتی کنٹین سے باہر نکلنے کی کوشش میں ہڑبونگ مچانے لگیں۔ پھر دو طالب علم اور نہ جانے کہاں سے آ ٹپک پڑے اور اعجاز پر ٹوٹ پڑے۔ موسیٰ محض تماشائی نہ رہ سکتا تھا۔ آگے بڑھ کر اس نے بھی ایک طالب علم کو سنبھال لیا۔ اور دھینگا مشتی شروع ہوئی۔ میزوں پر پڑے ہوئے برتن ٹوٹنے لگے۔ کنٹین کا منیجر بھاگ کر باہر آیا اور دہائی مچانے لگا۔ باہر کھڑے کچھ لوگ مدد کو پہنچے اور فریقین کو چھڑا کر معاملہ ادارے کے حکام تک پہنچا دیا۔ طالب علم کی ناک سے اب

بھی خون بہہ رہا تھا۔ اعجاز کی نئی قمیص کا گریبان تار تار ہو چکا تھا۔ وہ اب بھی گلا پھاڑ پھاڑ اول فول بک رہا تھا اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ اور سانس پھولا ہوا تھا۔ خود موسیٰ کا جبڑا ابھی دکھ رہا تھا۔ جس پر ایک طالب علم نے مکہ رسید کیا تھا۔

ادارے کا سربراہ اس وقت کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ مس برکت مسیح ادارے کی حسین ترین پروفیسر مس نسیم کے دفتر میں روتی ہوئی داخل ہوئیں۔ کنٹین کے مینجر اور دیگر طالب علموں نے ایک امریکی پروفیسر سے مدد چاہی۔ اعجاز اور موسیٰ اور مس شہلا باہر کھڑے رہ گئے تھے۔ اعجاز اب بھی غصے سے کھول رہا تھا۔ اور بار بار مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔ اس واقعے کی خبر ان کے اپنے شعبے تک بھی پہنچ گئی تھی۔ مس ہارڈن، مس امتیاز اور جبار صاحب بھاگے بھاگے آئے اور اعجاز سے واقعات کی تفصیل سننے کے بعد فوراً مس نسیم کے دفتر میں داخل ہوئے۔ اندر زور و شور سے بحث ہو رہی تھی۔ مس برکت مسیح کی سسکیاں بھی وقفے وقفے بعد سنائی دے جاتیں۔ جنہیں سن کر اعجاز کا غصہ اور بڑھ جاتا تھوڑی دیر بعد وہ سب باہر نکل آئے۔

پروفیسر مس نسیم نے طالب علم کے خلاف سنگین کارروائی کا وعدہ کر لیا تھا۔ اور مس ہارڈن مس برکت مسیح کو تسلیاں دیتی ہوئی دیگر عملے کو اپنے دفتر چلے جانے کی ہدایت کر کے پھر مس نسیم کے دفتر میں داخل ہو گئیں۔ مجمع بکھر گیا۔ سب نے اپنی اپنی راہ لی۔ راستے میں مس شہلا

کی زبان کھل گئی تھی۔ اب وہ سب سے بڑھ چڑھ کر حادثے کے مختلف پہلو بیان کر رہی تھی لیکن حادثے کے عینی محرک کو صاف گول کر گئی تھی۔ مس برکت مسیح کا چھوٹا سا رومال آنسوؤں سے بھیگ گیا تھا۔ جس سے وہ اپنی سرخ ناک کو بار بار پونچھ رہی تھی۔

دوپہر کو ناظم صاحب جلسے سے لوٹے تو سب لڑکیوں اور دیگر ملازمین نے مل کر اس کے دفتر پر دھاوا بول دیا۔ لیکن اس نے یہ کہہ کر جان چھڑا لی کہ اس کے ہاتھ میں پولیس کا ڈنڈا نہیں۔

"دقت یہ ہے کہ یہ تعلیمی ادارہ ہے۔ میں نے ایک بات بھی کسی طالب علم کے خلاف منہ سے نکالی تو طالب علم ہڑتال کر دیں گے۔ اور پھر مس برکت مسیح سے کس نے کہا تھا کہ وہ کنٹین میں جا کر چائے پیئے۔ یہ لڑکیاں اپنے دفتر میں چائے کیوں نہیں منگواتیں؟ جان بوجھ کر بھوکے شیر کے منہ کا نوالہ تر کیوں بنتی ہیں۔؟ اور جب وہ بھوکا شیر دھاڑ کر اُن پر جھپٹتا ہے تو یہ دُھائی کیوں مچاتی ہیں؟ یہ دفتر ہے یا پہلوانوں کا اکھاڑا؟ سب اپنے آپ کو خدائی فوجدار سمجھتے ہیں۔ بلاؤ اس کو ــ کیا نام ہے اس کا ــ دِقت یہ ہے کہ ایک تو مجھے نام یاد نہیں رہتے۔ ہاں تو کیا مصیبت ہے! ادھر پلاننگ کمیشن والوں نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اور . . . ادھر . . . . اوفو!" ٹیلیفون کی گھنٹی زور زور سے بجنے لگتی ہے اور ناظم صاحب پریشان ہو کر ریسیور اٹھانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

"ہاں ہاں ۔۔ میں بول رہا ہوں ۔ جی کیا فرمایا! ۔ ڈاکٹر اسلم! جی نہیں وہ اس وقت دفتر میں موجود نہیں ۔ آپ تھوڑی دیر بعد ٹیلیفون کیجئے!"
ناظم صاحب نے ٹیلیفون کا آلہ پٹخ کر اپنی جگہ پر رکھ دیا۔

"اُف! ۔ میرا بھی دماغ خراب ہوگیا ہے ۔ وہ مجھ ہی کو تو پوچھ رہے تھے اور . . . . ۔ (ہاہاہا) . . . ۔ میں نے کہہ دیا کہ میں ۔ دفتر میں موجود نہیں ہوں . . . . اہاہاہا . . . دِقّت یہ ہے کہ . . . . بعض اوقات آدمی اتنا پریشان ہوتا ہے کہ ۔ مزید پریشانی ناقابلِ برداشت ہوتی ہے . . . لیکن . . . میں کیا کروں . . . بھئی میں اس معاملے میں کر ہی کیا سکتا ہوں! ۔ آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے ۔ میرے ہاتھ میں پولیس کا ڈنڈا بالکل نہیں ہے ۔۔ میں بھی آپ ہی کی طرح ملازم ہوں ۔ جاؤ بھئی اپنا اپنا کام کرو ۔ یا جا کر پولیس میں رپورٹ درج کر دو ۔ وہ خود یہاں آکر تفتیش کر لے گی ۔۔ دقّت یہ ہے ۔ کہ ایک مرتبہ پولیس نے یہ گھر دیکھ لیا ۔ تو پھر ۔ وہ روز روز آئے گی اور اپنا دیوالہ ہو جائیگا ۔۔۔ ہاہاہا ۔" ٹیلیفون کی گھنٹی پھر بجتی ہے ۔

ناظم صاحب ۔ آلہ اٹھا کر کسی سے باتوں میں مصروف ہو جاتے ہیں اور لڑکیاں منہ لٹکائے ایک ایک کر کے باہر نکل آتی ہیں ۔ ان کے پیچھے پیچھے مرد بھی اپنی ہنسی دبائے دروازے کا پردہ اٹھا کر باہر آ جاتے ہیں ۔

"اوہو! ۔ بیٹی! تم ہو ۔ پہلے کیوں نہ بتایا!" ناظم صاحب کے یہ الفاظ دفتر کے عملے کے کانوں میں پڑتے ہیں تو وہ برآمدے میں فلک

شگاف قہقہے لگانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

"شگون کچھ اچھا نہیں ہے" موسٹی نے اپنے دفتر میں داخل ہوتے ہوئے سوچا۔ دوسرا ہی تو دن تھا اس کی ملازمت کا کہ اس نے پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑا کر خواہ مخواہ کا ایک جھگڑا مول لے لیا تھا۔ طالب علم جانے اور مس برکت مسیح جانے ۔۔ اس نے اچھا نہیں کیا۔ لیکن یہ سب اعجاز کی کارستانیاں تھیں۔ ایک طرف تو ان سب لڑکیوں کی پیٹھ پیچھے غیبت کیا کرتا تھا۔ اور دوسری جانب ان کی خاطر لڑائی مول لی۔ اعجاز کے متعلق ایک نئے پہلو سے وہ سوچنے لگا۔ "یہ کیسے ہو گیا۔ مجھے تو کچھ پتہ ہی نہ چلا۔ جب ذرا ہوش آیا تو جبڑا اور کندھا دکھ رہا تھا" وہ سوچتا رہا اور آپ اپنے آپ مسکراتا رہا اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی مار دھاڑ والی فلم کا کردار بن گیا ہو!

کتب فروشان کے بل اس کی میز پر پڑے اس کا منہ چڑا رہے تھے۔ وہ لپکا مس ہارون کے دفتر کی جانب بڑھا اور دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر اندر داخل ہوا۔ مس ہارون کے کمرے میں مس برکت مسیح کے علاوہ شہلا اور مس امتیاز بیٹھی ہوئی گذشتہ واقعہ پر خیال آرائیاں کر رہی تھیں۔

"یہ بالکل جھوٹ ہے۔ مسیح کی قسم! میں نے اس سے کبھی بات تک نہیں کی تھی" مس برکت مسیح اپنی صفائی پیش کر رہی تھیں کہ موسٹی کو دیکھ کر اس کا رنگ زرد پڑ گیا اور نگاہیں جھکا کر دوپٹے سے کھیلنے لگیں۔

"آئیے! ۔ آئیے!! ۔۔۔ خدائی فوجدار ۔ تشریف لائیے!!"
مس ہارون نے مسکرا کر موسیٰ پر چوٹ کی۔

"مس ہارون! میں لائبریری کی چابیاں لینے آیا ہوں۔ خزانے سے چیک بک نکالنی ہے"

موسیٰ نے مس ہارون کے طنز کو نظر انداز کرتے مطلب کی بات کی پھر اس نے کنکھیوں سے مس برکت مسیح کی طرف دیکھا جو تیز تیز آنکھیں جھپکاتی کچھ نادم اور کچھ شرمسار اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

"خزانے کی گنتی ابھی ہوئی نہیں ہے آپ کو چابیاں کیونکر سونپ سکتی ہوں۔ وہ تو ہوتی رہے گی مسٹر موسیٰ! پہلے یہ بتائیے! آپ کو دھینگا مشتی کے لئے ہمارا ہی شعبہ ملا تھا۔ یہ زور آزمائی تو آپ کہیں اور جا کر بھی کر سکتے تھے" مس ہارون نے مس امتیاز کی طرف دیکھا اور مسکرا کر موسیٰ کو مخاطب کیا۔

"مس ہارون! حالات ہی کچھ ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ مجھے مداخلت کرنی پڑی ورنہ میں تو بڑا امن پسند ہوں" موسیٰ نے ایک بار اور مس برکت مسیح کی طرف دیکھا اور مس ہارون کو جواب دیا۔ دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں۔ تو موسیٰ نے محسوس کیا مس برکت کی آنکھوں میں تشکر اور ممنونیت کے آثار ہویدا ہو رہے تھے "یہ سودا برا نہیں ہوا" اس نے اپنے دل میں سوچا۔

"ناظم صاحب آپ کو یاد کر رہے ہیں" ایک چپڑاسی کمرے میں

داخل ہوا اور موسیٰ کو اطلاع دی۔

"پہلے آپ ناظم صاحب سے نپٹ لیجئے! یہ باتیں تو اب کبھی ختم نہ ہونگی۔" مس ہارون نے موسیٰ کو بڑی عجیب نگاہوں سے دیکھا اور مسکرادی۔ موسیٰ باہر آکر مس ہارون کے متعلق سوچنے لگا۔"یہ لڑکی ہے یا گرگٹ"

ناظم کے کمرے کے باہر موسیٰ نے سگریٹ کے آخری کش لگائے اور پھر اسے پیروں تلے مسلتا ہوا ناظم کے دفتر میں داخل ہوا۔ دفتر میں مس مخدوم اور ایک نووارد بیٹھا ہوا تھا۔ مس مخدوم مہمان کی چائے سے تواضع کر رہی تھی۔ ناظم صاحب نے اپنے چرمی تھیلے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اور اسے کھول کر اس میں سے سکرین نکالی اور ڈبیہ میں سے دو تین دانے لیکر اپنے پیالے میں ڈال کر چمچے سے لسے گھولنے لگا۔

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا شکور صاحب!" ناظم صاحب نے مہمان کو مخاطب کیا۔ "دقت یہ ہے کہ یہاں کوئی دلجمعی سے کام ہی نہیں کرنے دیتا۔ اب اسی فرنیچر کے قصے کو لیجئے۔

ہمارے ناظم اعلیٰ مُصر تھے۔ اوہ! — (موسیٰ کو دیکھ کر) معاف کیجئے شکور صاحب! میں نے انہیں ایک ضروری کام سے بلایا ہے۔ دقت یہ ہے کہ مجھے دن رات کام کرنا پڑتا ہے۔ میری نظر اور حافظہ کمزور ہو گئے ہیں۔ ہمارے نالائق ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ — میں

بوڑھا ہو گیا ہوں۔ آپ ہی بتائیں رنڈوے بھی کبھی بوڑھے ہوئے ہیں؟ ہاہاہا۔۔۔ ڈاکٹر تو میں خود بھی ہوں۔ ذرا دوسرے قسم کا ڈاکٹر ۔۔ پی ایچ ڈی کی ڈگری میرے تھیلے میں پڑی پڑی بوسیدہ ہو گئی ہے۔ ہاں تو میں بے حد شرمندہ ہوں۔ آپ کو سگریٹ تو پیش ہی نہیں کئے۔ سردست میرے پاس اپنا برانڈ کیونڈر موجود ہے۔ گو سگریٹ گھٹیا ہے۔ اسے پیش کرتے ہوئے شرم بھی آرہی ہے۔ لیکن جناب میں تو اس بات کا قائل ہوں کہ جو کچھ خود کھاؤں یا پیئوں وہی مہمانوں کو بھی پیش کروں۔ تکلف سے مجھے سخت نفرت ہے۔ اور لوگ ہیں کہ تکلفات میں پڑ کر اپنی اچھی بھلی تہذیب کا ناس مار رہے ہیں۔ موسیٰ صاحب!۔ آپ بھی بیٹھئے!۔۔۔ دقّت یہ ہے۔ کہ میرا حافظہ کمزور ہو گیا ہے۔ وقت پر کوئی بات ہی یاد نہیں رہتی۔ ہاں تو شکور صاحب!۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ رقم کی ادائیگی میں ہمارا محکمہ ذرا سست ہے۔ مہینے کیا کبھی کبھی سال بھی لگ جاتے ہیں لیکن آپ بے فکر رہیں۔ جونہی آپ کا بل پاس ہوا۔ اسی روز آپ کی تمام کی تمام رقم بکشت ادا کر دی جائیگی۔ دقّت یہ ہے کہ ۔۔۔ پورے تین مہینوں سے ہمارا حساب کتاب معطّل پڑا ہے۔ ہمارے سابق محاسب بغیر کوئی نوٹس دیئے چل دیئے۔ بس چل دیئے۔

شکور صاحب!۔ اور ہمارے صدر دفتر کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی اس خدا کے بندے بلکہ میں تو کہوں گا کہ اس بھگوڑے نے اتنی تکلیف بھی گوارا نہ کی کہ جاتے وقت کم از کم بل کر جاتا۔ صاحب!۔ عجیب زمانہ ہے۔

اب یہ بے چارے آئے ہیں ۔ موسیٰ !۔ مسٹر موسیٰ !۔ ہمارے نئے محاسب !۔ ابھی پرسوں ترسوں ہی آئے ہیں۔ اور بڑی مشکلوں سے ملے ہیں۔ آپ کب آئے ہیں موسیٰ صاحب ؟ یہی دو چار دن ہوئے ان کو آئے ہوئے ۔ حساب کتاب کی جانچ پڑتال میں مصروف ہیں۔ دقّت یہ ہے ۔ صاحب !۔ آدمی ایک ہوتا ہے۔ اور کام ہزاروں کرنے پڑتے ہیں ۔ میری گاڑی ۔ یعنی سرکاری گاڑی موجود ہے ۔ شکور صاحب ! آپ مس ہارون اور موسیٰ صاحب کو ساتھ لے چلیں اور اپنے شو روم میں انہیں وہ تمام فرنیچر دکھا دیں جو ہمارے دفتر کے لیے تیار ہو رہا ہے رنگ روغن کی کوئی بات نہیں ۔ وہ آپ کے ملازم یہاں آ کر بھی کر سکتے ہیں ۔ میں چاہتا ہوں ۔ میرا دفتر دوسروں کے لیئے نمونہ بن جائے ۔ دقّت یہ ہے کہ اپنے صدر دفتر سے میری آج تک نہیں بنی ۔ وہ دوسروں کے پھٹے میں ٹانگ اڑانے کے عادی ہو چکے ہیں ۔ اور میں کسی کی بالادستی کسی قیمت پر بھی قبول نہیں کر سکتا ۔ میرا اُن کے ساتھ روز کسی نہ کسی بات پر جھگڑا ہو ہی جاتا ہے ۔ وہ مجھے منہ پھٹ سرکش اور ہونّق اور نہ جانے کیا کیا سمجھتے ہیں ۔ لیکن میں کسی کی کیا پرواہ کرتا ہوں ۔ انتہائی مجبور کریں گے ۔ تو زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا میں اپنے پہلے محکمے کو واپس چلا جاؤنگا ۔ جہاں سے انہوں نے مجھے مستعار لے رکھا ہے ۔ میں ایک ایسا ٹٹّو ہوں جسے محکمۂ تعلیم نے محکمۂ طب سے مستعار لے رکھا ہے ۔ ہاہاہا ۔ (قہقہہ)۔

(اس کے ساتھ ساتھ مس مخدوم اور مہمان بھی ہنسنے لگے ۔)

آپ اور چائے پیجئے شکور صاحب ! ۔ لیکن سموسے تو آپ نے کھائے ہی نہیں ۔ لیجئے نا ۔ ایک تو لیجئے ! ۔ اچھا تو ۔ آپ کی اجازت سے میں ایک سموسہ کھا لیتا ہوں ۔ ہا ہا ہا ۔ دقّت یہ ہے ۔ کہ صبح اتنی مصروفیت ہوتی ہے ۔ کہ میں ناشتہ تک نہیں کر پاتا ۔ میری بچیاں کالج جانے سے پیشتر کچھ نہ کچھ میرے تھیلے میں ٹھونس لیتی ہیں ۔ لیکن مجھے ناشتہ کرنے کی کبھی فرصت نہیں ملتی ۔"

ناظم کی ان اوٹ پٹانگ باتوں سے مولٹی کرسی پر بیٹھے بیٹھے پہلو بدلنے لگا ۔ مہمان بھی خاصا بور ہو رہا تھا ۔ لیکن مجبوراً چپکا بیٹھا سنتا رہا ۔ اور کسمساتا رہا ۔ وہ بار بار اپنا چرمی تھیلا ہاتھ میں لیتا اور یہ ظاہر کرتا کہ اُسے دیر ہو رہی ہے ۔ لیکن ناظم صاحب بے تعلق بنے اپنی ہی ہانکتے رہے ۔ وہ بے تکان بولے جا رہے تھے ۔ بے سروپا ۔ اوٹ پٹانگ اور بے مطلب باتیں میں ہارون نے اچانک ناظم کے دفتر میں داخل ہو کر اس بوریت کا خاتمہ کیا ۔

" محترمہ ! ۔ اچھا ہوا ۔ آپ خود ہی آگئیں ۔ ورنہ میں آپ کو بلانے ہی والا تھا ۔" ناظم صاحب نے اب مس ہارون کو مخاطب کیا ۔ اور مہمان پھر کسمسانے لگے ۔

"شکور صاحب آئے ہیں۔ محترمہ! آپ ان کے ساتھ فرنیچر دیکھنے ان کے شوروم میں جائیں۔ موسٰی صاحب کو بھی لیتے جائیں راستے میں پلاننگ کمیشن کے دفتر سے یہ بھی معلوم کریں۔ کہ وہ ہماری بقایا رقم کی ادائیگی کب کر رہے ہیں۔ بعض اہلکاروں کو اب تک تنخواہ نہیں ملی۔ اور وہ روز میرا دماغ چاٹتے رہتے ہیں۔ اب میں ان کے لئے کسی کا سر تو پھوڑنے سے رہا۔۔ اچھا تو شکور صاحب! میں آپ کا اور وقت ضائع نہیں کرونگا۔ آپ بے فکر رہیں۔ مجھ سے جو کچھ ہوسکیگا، کرونگا۔ آپ کے پچھلے واجبات بھی جلد ہی ادا کر دونگا۔ ویسے آپ کا کام نہایت عمدہ ہے۔ ماننا ہی پڑے گا۔ ایک ہی میز دیکھ کر میں آپ کے کاریگروں کی ہنرمندی کا قائل ہو گیا ہوں۔۔ اچھا۔۔ خدا حافظ۔۔ خدا حافظ۔ وعلیکم سلاام!"

خدا خدا کر کے مہمان کی گلو خلاصی ہوئی۔ اور وہ تھیلا سنبھال کر ناظم صاحب کے دفتر سے تیر کی طرح نکلے۔ اُن کے پیچھے پیچھے مس ہارون اور موسٰی بھی باہر نکل گئے۔ موسٰی نے مس ہارون کی طرف دیکھا۔ تو وہ مسکرا رہی تھی۔ جیسے ناظم تو نرے احمق ہوں لیکن وہ خود داناؤں کی دانا۔ مس ہارون نے چپراسی بھیج کر ڈرائیور کو بلایا۔ اور اُسے گاڑی دفتر کے قریب لانے کو کہا۔ پھر وہ تھوڑی دیر کے لئے مہمان سے معذرت کر کے اپنے دفتر میں گئی۔ اور کچھ کاغذات اور پرس لئے نمودار ہوئی۔

نیچے اتر کر گاڑی کے انتظار میں مس ہارون مہمان سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی ۔ موسٹی ان سے دور کھڑا سوچتا رہا۔ کہ آج کی شام غارت ہوگئی ۔ وہ اپنے دوست کے پاگل پن سے محظوظ نہ ہوسکیگا

یہ ایک امریکن گاڑی تھی جس میں ڈرائیور سمیت بارہ آدمی آرام سے سما سکتے تھے۔ مہمان ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر آگے بیٹھ گیا۔ درمیانی نشست پر مس ہارون اور سب سے آخری نشست پر موسٹی بیٹھ گیا۔ گو مس ہارون کی نشست پر ایک چھوڑ دو آدمیوں کی گنجائش اور بھی تھی۔ لیکن مس ہارون کی نگاہوں کی خاموش خواہش کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ آپ ہی آپ پچھلی نشست پر بیٹھ گیا تھا۔

"اس میں کیا قباحت ہے" وہ سوچنے لگا۔" بیٹھنا ہی تو ہے آگے یا پیچھے۔ فرق ہی کیا پڑتا ہے۔ یہ تو ایک ڈھونگ ہے۔ احساس برتری کا ایک بھونڈا اظہار۔ ایسا کرنے سے کسی کی عزت گھٹتی ہے نہ بڑھتی ہے۔ خواہ مخواہ کا ایک دکھاوا ہے۔ خصوصاً بڑے گھرانوں کی عورتیں اپنی بڑائی جتانے کیلئے ایسی ہی تنگ نظری سے کام لیا کرتی ہیں ۔۔۔ مس ہارون کے بالوں کا لمبا جوڑا اس کی نشست کے پیچھے جھول رہا تھا۔ وہ سر سے ننگی تھی۔ اس کے بالوں میں جابجا اڑسی ہوئی سنہری پنیں بھلی لگ رہی تھیں۔

وہ اپنی بیوی کیلئے بھی ایسی ہی پنیں خریدے گا۔ وہ سوچنے لگا اُس کی نگاہیں بدستور سنہری پنوں کو تک رہی تھیں۔ لیکن اس کی

بیوی کے بال سنہرے تھے۔ جانے سنہرے بالوں میں سنہری پنیں اچھی بھی لگینگی یا نہیں۔

گاڑی مختلف سڑکیں اور موڑ پیچھے چھوڑتی تیز رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔ مہمان کبھی کبھی گردن موڑ کر مس ہارون کی جانب دیکھ کر کوئی بات کر لیتا۔ اور پھر سامنے دیکھنے لگتا۔

مس ہارون نے اس سفر میں صرف ایک مرتبہ موسٰی کیطرف خوابیدہ نگاہوں سے دیکھا۔ اور کوئی بات بھی کی۔ جو انجن کے شور اور پاس سے گذرنے والی ایک گاڑی کے زور زور سے ہارن بجانے کی آواز میں دب کر رہ گئی۔ موسٰی نے کچھ نہ سنا اب کی مرتبہ مس ہارون نے تقریباً چیختے ہوئے موسٰی سے پوچھا۔

"میں کہتی ہوں فرنیچر کی فہرست کہاں ہے؟"

"مجھے معلوم نہیں" موسٰی نے بجھے بجھے دل سے جواب دیا۔ "ہر وقت رعب جمانے پر کونشان" اس نے اپنے دل میں بیزاری سے سوچا۔ "یہ بھی کوئی تک ہے!"

مس ہارون نے اس کیطرف خشمگین نگاہوں سے دیکھا۔ اور موسٰی جل کر ہی تو رہ گیا۔ لیکن مہمان نے یہ مشکل حل کر دی۔ انہوں نے گردن موڑ کر مس ہارون کی تسلی کر دی۔ کہ فرنیچر کی فہرست کی ایک نقل اس کے پاس دفتر میں موجود ہے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اور موسٰی پھر مس ہارون کے جوڑے میں کھو گیا۔ جو جھولتا

ہوا برابر اس کا منہ چڑا رہا تھا۔

"آخر وہ اسے سنبھال کر کیوں نہیں رکھتی:" موسٰی جھنجھلایا ہوا تھا اور مس ہاردن کی ہتک پر تلا ہوا تھا۔ لیکن موقع نہیں مل رہا تھا۔ سانپ اس کے سامنے برابر پھن پھیلائے جھوم رہا تھا۔ کاش! اسے کہیں سے قینچی مل جاتی۔ تو وہ اس جوڑے کو جڑ سے کاٹ دیتا۔ لیکن اسکے بالوں میں اٹکی ہوئی سنہری پنیں کتنی اچھی لگ رہی تھیں! اس کا سارا غصّہ کافور ہو گیا۔ اور وہ انہماک سے پنوں میں کھو گیا۔ اس کی تصوراتی دنیا بھی کتنی انوکھی تھی۔ اپنی بیوی کی سادگی، اس کے خلوص اور جذبہ ایثار سے وہ قطعاً متاثر نہ ہوتا تھا۔ وہ اپنی بیوی کو ہر وقت بنا ٹھنا دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے برعکس اس کی بیوی کے سنہرے بال ہر وقت دھول سے اٹے ہوئے ہوتے۔ اور وہ ہفتوں بالوں میں کنگھا نہ کرتی صبح و شام میلے کچیلے لباس میں بچوں کو کھلاتی یا کنبے بھر کے لئے کھانا پکانے کے چھوٹے موٹے کاموں میں تندہی سے جٹی ہوئی رہتی۔ آنگن میں جھاڑو لگانا۔ کمروں کی جھاڑ پونچھ اور ڈھیروں کپڑے دھونا۔ یہ بھی کوئی کام ہے! ۔ وہ اپنی بیوی کے چہرے پر اڑتی ہوئی دھول دیکھ کر ابکائیاں لینے لگتا۔

یہ بال نزلے کی بدولت سفید ہوئے ہیں۔ وہ سوچنے لگتا۔ ورنہ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ یہی پینتیس ۳۵۔ چھتیس ۳۶ برس۔

اور نہیں تو کیا"۔ کیا میں واقعی بوڑھا ہو گیا ہوں"؟ وہ اپنے دل سے پوچھتا۔ اس کے دل کا چور اچانک کہیں پیچھے سے آ کر اس کے کان میں "ہاں" کی ایک لمبی ہونک لگاتا۔ اور وہ کانپ اٹھتا۔ "نہیں نہیں" وہ اپنی ڈھارس آپ بندھاتا۔ وہ ابھی بوڑھا نہیں ہوا۔ وہ ابھی بوڑھا نہیں ہوا۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ جب وہ اپنی گلی میں سے گذرتا تو کھیلتے ہوئے شریر بچے اسے بڑے ادب سے "بابا" کہکر سلام کرتے۔ اور وہ تلملا کر رہ جاتا۔

پھر ایک پچھتاوے نے اس کے دل و دماغ میں ہلچل مچا دی۔ اگر وہ اس دفتر میں ملازمت اختیار کرنے سے پیشتر اپنی کنپٹیوں کے سفید بالوں پر خضاب لگا کر آیا ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ ملازمت بھر اس کا بھرم قائم رہتا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی نہیں اس نے بجھے بجھے دل سے سوچا۔ اور آنکھیں موند لیں۔ پھر اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پیوست کر کے گھٹنوں میں سر دبا کر گہری سوچوں میں ڈوب گیا۔

کاش! وہ یہاں پہلے آیا ہوتا۔ پہلے۔ بہت پہلے۔ اس وقت سے بھی پہلے جب کہ وہ بھرتی کے دفتر کے سامنے قمیص اتارے سینہ پھلائے کھڑا تھا۔ اور قصائی اس کے چوڑے چکلے سینے بازوؤں کی مچھلیوں اور کسرتی بدن کو جانچ رہے تھے۔ اور اس کے کمزور ساتھی اپنی جھینپ چھپانے، اس کی طرف نہیں، اِدھر اُدھر دیکھ دیکھ

کر دل ہی دل میں کُڑھ رہے تھے۔

"وہ زمانہ اب لوٹ کر کہاں آئیگا۔" آنکھیں میچے، گھٹنوں میں سر دئے۔ وہ نہ جانے کب تک ایسی ہی اوٹ پٹانگ باتیں سوچتا رہا۔ اچانک اُسے محسوس ہوا۔ گاڑی کھڑی ہے۔ اور وہ گاڑی میں بالکل تنہا بیٹھا ہوا ہے۔ اس نے سامنے دیکھا۔ مسٹر شکور اور مس ہارون فرنیچر کی دکان میں کھڑے فرنیچر کا معائنہ کر رہے تھے۔ اس نے بادلِ ناخواستہ دروازہ کھولا۔ اور بوجھل قدموں سے دکان میں داخل ہوا۔

"یہ گھومنے والی کرسی ہے۔ اس کے سپرنگ بڑے پائیدار اور مضبوط ہیں۔ گدیلے کو ہاتھ لگا کر دیکھئے۔" شکور صاحب مس ہارون کو بتا رہے تھے۔ "اس میں خاص قسم کا مسالہ بھرا ہوا ہے۔ جو ہم نے خصوصی آرڈر سے باہر سے منگوایا ہے۔" شکور صاحب اپنی فرم کے بنائے ہوئے فرنیچر کی خصوصیات بڑھ چڑھ کر بیان کر رہے تھے۔ اور اپنے کاریگروں کے کام کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہے تھے۔ مس ہارون فرنیچر کے ایک ایک نمونے کو یوں ٹھونک بجا بجا کر دیکھ رہی تھی۔ جیسے فرنیچر، فرنیچر نہ ہوا تربوز ہوا۔ اور موسیٰ اڑتا ہوا اپنے گاؤں کے ٹھنڈے میٹھے چشموں کے قریب پہنچ گیا۔ جہاں تربوز کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ اور گرمیوں میں لوگ۔۔۔۔۔ ٹھونک بجا بجا کر تربوز خریدتے اور نہانے سے پیشتر کھاتے۔

مس ہارون نے لوہے کی ایک میز کی درازیں کھولتے اور بند کرتے ہوئے موسٰی کو مخاطب کیا تو وہ چونک اٹھا۔

"میں آپ سے مخاطب ہوں مسٹر موسٰی! ۔ آپ کہاں کھو گئے ہیں؟" مس ہارون نے اپنی دانست میں موسٰی پر چوٹ کی۔

"سوچ رہا تھا مس ہارون! اس اسراف کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ہمارا دفتر فرنیچر سے اٹا پڑا ہے۔ گو فرنیچر پرانی طرز کا ہے۔ مگر اب بھی کئی سال تک کام دے سکتا ہے۔" موسٰی نے اپنی مدافعت میں زبان کھولی۔

"یہ باتیں آپ کے سوچنے کی نہیں ہیں مسٹر! اپنے کام سے کام رکھو" مس ہارون نے بُرا مانتے ہوئے جواب دیا۔ "میں آپ کو یہ بتا رہی تھی کہ ہر میز کی پلیٹ پر اس کا نمبر کندہ ہے۔ اور اُسی نمبر کی آپ کو دو دو چابیاں ملیں گی۔ درازیں دو ہیں۔ اس لئے ہر میز کی چار چابیاں ہوئیں دو چابیاں آپ کے پاس رہیں گی۔ اور دو چابیاں آپ اس افسر کو دینگے جسے میز ملے گی۔ اس کے علاوہ ہر افسر کو ایک گھومنے والی کرسی اور دو نائیلون کے بید والی کرسیاں مہیا کی جائیں گی۔ یہ نہیں ہوگا کہ ایک افسر تو چار چار کرسیوں پر قبضہ کر لے۔ اور باقیوں کے حصے میں ایک ایک کرسی بھی نہ آئے۔" مس ہارون شکور پر رعب جما نے موسٰی کو ہدایات دے رہی تھیں۔ جیسے وہ اس کا نجی ملازم ہو۔ موسٰی زچ ہو کر پھر کہیں کھو گیا۔ اور بڑی بے دھیانی اور خالی نظروں سے مس ہارون کو تکتا ہاں

ہوں کرتا رہا۔

"بیکار! بیکار!!" وہ اپنے دماغ کو جھٹکنے لگا۔ انسان کا وقار اس ظاہری نمود و نمائش سے کبھی نہیں بڑھ سکتا۔ اعلیٰ کردار، اونچی قدریں اور اعلیٰ مقاصد ہی انسان کو اونچا کرتے ہیں خصوصاً تحقیق اور چھان بین کے لئے تو یہ از بس ضروری ہے۔ نئے فرنیچر، نئے ڈیزائن کے قیمتی پردوں اور رنگ برنگی لپائیوں سے دفتروں کو سجا کر کبھی کسی کا رتبہ اور وقار بلند نہیں ہو سکتا۔ یہ سب ڈھونگ ہے۔ اپنے عیوب اور کمزوریاں چھپانے اور دوسروں پر رعب گانٹھنے سے کبھی معراج حاصل نہیں ہو سکتی۔"

مِس ہارون شکور صاحب کے ساتھ چائے پینے اس کے کیبن میں داخل ہوئیں۔ اور موسیٰ نمائشی کمرہ میں کھڑا کافی دیر تک یہی کچھ سوچتا رہا۔ نمائشی کمرہ کے بڑے بڑے شیشوں والی دیوار کو دیکھ موسیٰ نے اپنی دونوں مٹھیاں بھینچ لیں۔

"بس ایک کاری ضرب کی ضرورت ہے۔ بھاری پتھر کی ایک ضرب شیشے کی اس دیوار کو چکنا چور کر سکتی ہے۔ کہیں سے ایک پتھر مل جاتا۔ تو۔ تو۔" اس نے بھینچی ہوئی دونوں مٹھیاں ہوا میں لہراتے ہوئے سوچا۔ پھر جیسے اس کا جنون آپ ہی آپ سرد پڑ گیا۔

پتھر مل بھی جاتا۔ تو اس میں جرأت اور ہمّت کی کمی تھی۔ وہ ...

نہیں لگا سکتا تھا۔ اُس کی تنی ہوئی مٹھیاں آپ ہی آپ ڈھیلی پڑ گئیں اور وہ شیشے کی دیوار پر ناک سے لکیریں کھینچتا۔ اُس پار سڑک پر بڑھتے ہوئے بے پناہ ہجوم میں کھو گیا۔ موٹریں، سکوٹر، رکشا اور بسیں چوڑی، کھلی اور شفاف سڑک پر ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ دوڑ رہی تھیں۔

شکور صاحب اپنے کیبن سے نکل کر موسیٰ کو آوازیں دینے لگا۔ اور وہ چونک کر کیبن کی جانب بڑھا۔

" آئیے موسیٰ صاحب! چائے پیجئے!" شکور صاحب نے اسے ایک کرسی پیش کرتے انکساری دکھائی۔ کرسی پر بیٹھتے موسیٰ نے مس ہارون کو دیکھا۔ جو اپنی پیالی میں بڑی بے نیازی سے چمچہ ہلا رہی تھی۔

" یہ تو اس کا فرض تھا" موسیٰ نے مس ہارون کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔" جو اسے اپنے ساتھ لائی تھی"

موسیٰ ہڑبڑا کر کرسی سے یوں اچھلا جیسے اسے لیسوڑوں نے کاٹ کھایا ہو۔

" معاف کیجئے! میں ابھی حاضر ہوا" موسیٰ نے شکور صاحب سے معذرت کی۔ اور نمائشی کمرے سے ہوتا ہوا پختہ فرش کو اپنے جوتوں سے ٹھک ٹھکاتا باہر آگیا۔

" وہ اس ہتک کو برداشت نہیں کر سکتا" باہر آکر سڑک پر بڑھتے ہوئے ہجوم کو بے مقصد گھورتے سوچنے لگا۔ پھر وہ گاڑی

کے پاس چلا گیا۔ اور ڈرائیور سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔
"ڈرائیوروں کی بھی کیا زندگی ہے"! اُسے اپنے ڈرائیور پر ترس آیا" بے چارے گھنٹوں انتظار میں کھڑے رہتے ہیں۔ بارش ہو، جاڑا ہو یا گرمیاں! — وہ سٹیرنگ پر بیٹھے بیٹھے جمائیاں لیتے ہیں یا اپنے مالکوں کو کوستے ہیں۔ جو اندر جاکر نہ جانے کیا کرتے رہتے ہیں!"
ایک گھنٹے کے مسلسل اذیت ناک انتظار کے بعد کہیں جاکر مس ہارون شکور صاحب کے ساتھ نمودار ہوئی۔

"یہ سارا فرنیچر کب تک بن جائے گا شکور صاحب!" مِس ہارون نے گاڑی میں بیٹھتے شکور سے دریافت کیا۔
"کم و بیش ایک مہینہ اور لگیگا مِس!" شکور نے جواب میں کہا" میری یہ کوشش ہے۔ کہ فرنیچر اچھا اور پائیدار ہو۔ اسلئے کچھ وقت اور چاہونگا۔ دراصل ہمارے ملک میں اچھے کاریگروں کا قحط ہے۔ اچھا کاریگر اول تو ملتا نہیں، مل جائے تو اُسے کوئی نہ کوئی بیماری یا روگ لگا ہوا ہوگا۔ اور ہفتے میں تین چار دن تو ضرور غیر حاضری کرے گا۔ اس پر طرہ یہ کہ اشیائے ضرورت بھی وقت پر نہیں ملتیں۔ ورنہ آپ کے حکم کی تعمیل کب کی ہوگئی ہوتی۔"

"اچھا دس، پندرہ[۱۵] روز بعد ایک چکر اور لگاؤنگی۔ اگر میں خود نہ آسکی تو اپنے محاسب کو بھیجدونگی۔ سلام علیکم — چلو۔ ڈرائیور" مس ہارون نے موسٰی کے دل میں ایک اور نشتر چبھویا۔ اور موسٰی تلملا

کر رہ گیا۔

"اپنا محاسب! اپنا محاسب! ہونہہ! جیسے میں اس کا زر خرید غلام ہی تو ٹھہرا۔" موسیٰ نے جھنجھلا کر سوچا۔ اور کڑھتا ہوا اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

چلتی گاڑی میں مس ہارون نے ایک مرتبہ اپنے بالوں کے جوڑے کو انگلیوں سے مس کیا اور پھر پیچھے گردن موڑ کر موسیٰ کو تکنے لگی۔ جیسے اس کی موجودگی کا اُسے اچانک احساس ہو گیا ہو۔

"آپ کی چائے پڑی پڑی ٹھنڈی ہو گئی تھی۔" مس ہارون نے مربیانہ انداز اختیار کیا۔ لیکن اس کی آنکھوں سے امڈتی ہوئی بے اعتنائی اور غرور کو موسیٰ پھر بھی نظر انداز نہ کر سکا۔

"آپ کہاں چلے گئے تھے؟"

"مجھے ایک ضروری کام یاد آ گیا تھا۔" موسیٰ نے کھڑکی سے باہر جھانکتے بے رُخی سے جواب دیا۔ چند لمحے مس ہارون اسے ایک ٹک دیکھتی رہی۔ اور پھر نگاہیں موڑ کر سامنے دیکھنے لگی۔

"کیا آپ نے پلاننگ کمیشن کے دفتر نہیں جانا؟" موسیٰ نے جیسے مفاہمت کی صورت پیدا کرتے ہوئے مس ہارون سے دریافت کیا۔ یہ سانپ اسے ضرور ڈسے گا۔ اس نے مس ہارون کے جوڑے پر نگاہیں جمائے سوچا۔ "بہتر ہے وہ حالات کے سامنے ہتھیار ڈال دے۔"

"ارے میں تو بھول ہی گئی تھی۔ ڈرائیور! — پلاننگ کمیشن کے دفتر سے ہوتے چلو۔" مس ہارون نے ڈرائیور کو ہدایت کی اور پھر موسیٰ کی طرف

متشکرانہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

"لیکن اس وقت وہاں کون ملے گا؟ شام ہو چکی ہے۔ سب لوگ چھٹی کر چکے ہوں گے۔" موسیٰ نے کوئی جواب نہ دیا نہ اس کی طرف دیکھا۔ لاتعلق سا بیٹھا شیشوں سے باہر دیکھتا رہا۔

خلافِ توقع پلاننگ کمیشن کا دفتر ابھی تک کھلا تھا۔ مس ہاردن گاڑی سے اُتر کر دفتر میں داخل ہوئی اور پھر تھوڑی دیر بعد ایک خوبصورت سی لڑکی کے ساتھ باہر آئی۔ دونوں بڑی گھُل مل کر باتیں کر رہی تھیں۔ جیسے پرانی سہیلیاں ہوں موسیٰ نے گاڑی میں بیٹھے کھڑکی کے شیشے سے جھانک کر دیکھا وہ لڑکی اسے بڑی پیاری اور خوبصورت دکھائی دی۔ قریب آنے پر تو وہ اور بھی بھلی لگی۔ اس کے گال ٹماٹر ایسے سُرخ تھے۔ بدن چھریرا تھا۔ اور ترشی ترشائی اس کی لمبی گردن یونان کے مجسّمے سے مشابہت رکھتی تھی۔ موٹی موٹی غلافی آنکھیں جیسے ان میں بے شمار قندیلیں روشن ہوں۔ بناؤ سنگھار کے بغیر بھی وہ ہر طرح سے مکمل تھی۔

"یہ کیا عذاب ہے!" وہ سوچنے لگا۔ "قدم قدم پر حسن نے جال بچھا رکھے ہیں۔ اس کا ایمان خطرے میں تھا۔ دو ہی دنوں میں وہ اپنے آپ کو پھر سے جوان محسوس کرنے لگا تھا۔ باتیں کرتی ہوئی وہ لڑکی بار بار جھینپ رہی تھی۔ جیسے دونوں میں راز و نیاز کی باتیں ہو رہی ہوں۔

"اچھا تو میں جمعہ کو تمہارے دفتر آؤں گی" گاڑی کے قریب پہنچ کر اس کی سہیلی نے مس ہاردن کو مخاطب کیا۔

"پکا وعدہ کرو تسنیم! نہ آئی تو تیری خیر نہیں۔"

"نہیں نہیں۔ ضرور آؤں گی۔ جانتی ہو، ہوسٹل میں لڑکیاں کیا کہہ رہی تھیں؟ مس ہارون کی سہیلی بات کرتے کرتے اچانک رُک گئی۔ اور گاڑی میں بیٹھے ہوئے موسیٰ کو دیکھ کر شرماتے ہوئے نگاہیں جھکا لیں۔ "شام کو جب ہوسٹل آؤ گی تو بتاؤں گی" پھر اس نے محجوب نگاہوں سے مس ہارون کے کان میں ایک بات کہی۔ اور مس ہارون نے موسیٰ کی طرف دیکھا۔ پھر دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

"چل ہٹ!" مس ہارون نے پیار سے اُسے گھُرکا۔ "اچھا بھئی!۔ اب میں چلتی ہوں۔ ہاں۔ ایمان سے صبح سے ادھر ادھر ماری ماری پھر رہی ہوں۔ سارا دن بیکار گذر گیا۔ ذرا وہ ماہر معاشیات کو صبح یاد دلا دینا۔ ناظم نے تو میرے کان کھا لئے ہیں"

اور یوں دونوں سہیلیاں رخصت ہوگئیں۔ مس ہارون نے گاڑی میں بیٹھ کر اپنی سہیلی کو ہاتھ ہلا کر سلام کیا۔ اور گاڑی پلاننگ کمیشن کے احاطے سے نکل کر شاہراہ پر بڑھنے لگی جسے شیشم کی دورویہ قطاروں نے ڈھک رکھا تھا۔ مس ہارون نے گردن موڑی اور مسکرا کر موسیٰ کی جانب دیکھا۔

"آپ بنگالی ہیں؟"

"جی نہیں"

"پنجابی ہیں؟"

"جی نہیں"

"تو پھر پٹھان ہونگے؟"

"جی نہیں۔ پٹھان بھی نہیں"

"تو پھر آپ کون ہیں؟" مس ہارون اپنی نشست کی پشت پہ ٹھوڑی جما کر موسی کو ٹکر ٹکر دیکھتی سوالات کر رہی تھی۔ "اب مزہ آیا" موسیٰ نے سوچا پہلے تو وہ اس کی حیثیت ایک ملازم سے زیادہ نہیں سمجھتی تھی۔ لیکن یہ اچانک اسے کیا ہو گیا تھا کہ وہ اس کی ذات میں دلچسپی لینے لگی تھی۔

"کہتے ہیں۔ ہمارے آباؤ اجداد عرب نژاد تھے۔ محمد بن قاسم کے زمانے میں ہمارے جدِ امجد نے اس ملک میں مستقل طور پر اقامت اختیار کر لی تھی۔ اور تب سے ہم یہاں رہ رہے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں آج تک اس علاقائی تقسیم کا قائل نہ ہو سکا" موسیٰ نے ہنستے ہوئے بڑ ہانکی۔ اور مس ہارون کو مرعوب کرنے میں ایک گونہ خوشی محسوس کرنے لگا۔

"میری سہیلی آپ کو بنگالی سمجھ رہی تھی۔ اس نے بچپن بنگال میں گذارا ہے۔ اس لئے اسے بنگالی اچھے لگتے ہیں" مس ہارون نے پشت سے ٹھوڑی ہٹا کر نگاہ سامنے، ناک کی سیدھ میں پھیلی ہوئی سڑک پہ جماتے بات ختم کی۔ اور موسیٰ سوچنے لگا۔ کاش! وہ کہہ دیتا کہ وہ بنگالی ہے۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ وہ تو بیت گیا تھا۔

"کیا آپ ہوسٹل میں رہتی ہیں۔؟" موسیٰ نے دوبارہ گفتگو کا آغاز کیا۔ اپنی ذات میں کون دلچسپی نہیں لیتا۔ موسیٰ اپنی کمزوری سے واقف تھا۔ اس لئے وہ الٹ پھیر کر پھر اسی موضوع کی طرف مس ہارون کو لانا چاہتا

تھا۔ لیکن مس ہارڈن نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خاموش بیٹھی برابر آگے تکتی رہی جیسے موسیٰ سے نچی قسم کی گفتگو کر کے اس نے بھاری غلطی کا ارتکاب کیا ہو۔ اور موسیٰ کے دل میں ٹیسیں اٹھنے لگیں۔

"اُف! یہ نام نہاد اخلاقی قدریں!"۔ موسیٰ کے جی میں آئی۔ ہاتھ بڑھا کر مس ہارڈن کو چوٹی سے پکڑ کر ایسا جھنجھوڑے کہ اسے دن کو تارے نظر آنے لگیں۔

گاڑی ایک جھٹکے سے دفتر کے قریب رک گئی اور برآمدے میں ناظم صاحب ٹہل رہے تھے۔ مس ہارڈن اوپر جا کر اس سے باتیں کرنے لگی اور موسیٰ اپنے کمرے میں داخل ہو کر کاغذات اور مثلوں کے ڈھیر ترتیب سے لگانے لگا۔ شام کے سائے پھیل چکے تھے۔ دفتر کا دیگر عملہ کب کا رخصت ہو چکا تھا۔ اس نے مثلیں اور کاغذات سمیٹ کر الماری میں رکھے اور تالا لگا کر باہر آگیا۔

مس ہارڈن ناظم صاحب سے فرنیچر کے متعلق باتیں کر رہی تھی۔ موسیٰ کو دیکھ کر ناظم نے اسے آواز دی۔ اور وہ بوجھل قدموں سے اُن کی جانب بڑھنے لگا۔

"آپ گھر جا رہے ہیں موسیٰ صاحب؟" ناظم نے اپنے سگریٹ کے بچے کھچے ٹکڑے سے نئی سگریٹ سلگاتے اُسے مخاطب کیا۔

"جی ہاں"۔ موسیٰ نے ان کے قریب آتے ہوئے جواب دیا۔

"ہم بھی جا رہے ہیں۔ راستے میں آپ کو اتار دیں گے۔ آئیے!

حساب کتاب کی جانچ پڑتال ہو گئی یا نہیں ؟ کوئی گڑبڑ والی بات تو نہیں؟"

"نہیں ناظم صاحب! ایسی کوئی نہیں۔ سابق محاسب نے کافی کام ادھورا چھوڑا ہے، جسے میں مکمل کر رہا ہوں۔۔ جمع تفریق ہو رہی ہے۔ کل نقدی بھی گن لوں گا۔ توقع ہے کام ٹھیک سے چلنے لگا۔ لیکن ایک تکلیف ہے ناظم صاحب!"

"وہ کیا ؟"

"آپ نے خزانہ لائبریری میں رکھوایا ہوا ہے اور لائبریری کی چابیاں مس ہارون کے پاس رہتی ہیں۔ مجھے بار بار انہیں زحمت دینی پڑتی ہے۔ اگر اجازت ہو تو خزانہ اپنے کمرے میں اٹھوا دوں۔"

"مجھے کوئی زحمت نہیں ہوتی مسٹر موسیٰ!" ناظم کی جگہ مس ہارون نے جواب دیا۔ "اس سے خزانے کی دُہری حفاظت ہوتی ہے چاہے آپ دن میں ہزار مرتبہ میرے پاس آکر چابیاں مانگیں مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ ہمارا مقصد خزانے کی حفاظت کرنا ہے۔"

"دقت یہ ہے مسٹر موسیٰ!" ناظم صاحب نے بھی مس ہارون کی تائید میں بات کی "کہ آپ کے دفتر میں طرح طرح کے لوگ آتے رہتے ہیں اور یہ ممکن ہے کسی دن خزانہ کھلا رہ جائے اور کوئی ہاتھ کی صفائی دکھا دے۔"

"اس دوہری غلامی سے چھٹکارا ناممکن ہے" موسیٰ نے مایوس ہو کر سوچا اور بغلیں جھانکنے لگا۔

"مس ہارون! کل صبح میں سیدھے صدر دفتر جاؤں گا۔ شاید آپ کو لینے ہوسٹل نہ آسکوں۔ آپ مہربانی کرکے بس ہی میں چلی آئیے گا۔ کوئی تکلیف تو نہ ہوگی؟ دقت یہ ہے کہ گاڑی ایک ہے اور مسافر دو! ہاہاہا۔"
ناظم صاحب نے مس ہارون کی طرف دیکھا! وہ ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

"آپ میری فکر نہ کریں" مس ہارون نے جل کر کہا۔ "میں دفتر صحیح وقت پر پہنچ جاؤں گی۔ آپ کو تو یہ بھی یاد نہیں رہا کہ کل سنڈے ہے اور دفتر بند رہے گا۔"

"اوہو۔ ہاہاہا۔ اگر آپ یاد نہ دلاتیں تو کل صبح میں ٹھیک وقت پر صدر دفتر پہنچ کر اُن لوگوں کو گالیاں دے رہا ہوتا! — اور — اور ہاہاہا۔"

"چلیئے ناظم صاحب! — اب دیر ہو رہی ہے۔" مس ہارون نے اپنی نازک کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھتے ناظم کی بات کاٹی۔ ناظم صاحب قہقہے کا گلا گھونٹ کر بولے۔

"ہاں ہاں۔ چلو۔ دیر ہو رہی ہے۔ میں بھی جلدی میں ہوں۔ بچیوں نے فلم دیکھنے کا پروگرام بنا رکھا ہے اور وہ میرا بے صبری سے انتظار کر رہی ہوں گی۔ آپ کو فلم دیکھنا ہو تو شوق سے ہمارے ساتھ دیکھ سکتی ہیں۔"

"جی نہیں۔ شکریہ! ناظم صاحب! مجھے آج مس تسنیم کے ساتھ شاپنگ کرنی ہے۔"

موسیٰ دونوں کے پیچھے پیچھے چلتا ہُوا سوچ رہا تھا کہ یہ کیا معمہ ہے اس دفتر میں لڑکیوں کی کمی نہیں۔ لیکن ایک مس ہارون ہے جو ناظم کے

ساتھ اس کی گاڑی میں جاتی ہے۔ باقی سب لڑکیاں اپنے اپنے بندوبست پر گھروں کو جاتی ہیں۔ کہیں وہ طرح طرح کی افواہیں صداقت پر مبنی تو نہیں؟ شاید اسی لئے اعجاز نے موسیٰ کو خبردار بھی کیا تھا کہ وہ مس ہارون سے بچ کر رہے۔

ناظم صاحب نے گاڑی میں اگلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اپنی عینک کے شیشے رومال سے صاف کئے اور پھر جیب سے سگریٹ نکال کر سلگانے لگا۔ درمیانی نشست پر مس ہارون بیٹھ گئی تھی۔ ناظم صاحب بار بار گردن موڑ کر مس ہارون کی طرف دیکھ کر مسکراتے لیکن مس ہارون خاموش بیٹھی ایک جانب دیکھتی رہی۔ پچھلی نشست پر بیٹھا موسیٰ اس معمے کو حل کرتا ہوا اور اُلجھ گیا تھا۔

گھرگھر کرتی گاڑی چل پڑی اور ابھی موسیٰ کسی نتیجے پر پہنچ بھی نہ پایا تھا کہ گاڑی ہوسٹل کے پھاٹک کے سامنے آکر رُک گئی اور مس ہارون نگاہیں جھکائے گاڑی سے اتر کر دھیمے لہجے میں سلام جھاڑ کر پھاٹک میں داخل ہو گئیں۔ ناظم صاحب اس کی طرف دیکھتے برابر مسکرائے جا رہے تھے۔ پھر اچانک انہوں نے گردن موڑ کر موسیٰ کی طرف دیکھا اور سنجیدہ ہو کر سامنے دیکھنے لگے۔

"آپ کو کہاں اتاروں موسیٰ صاحب!" ناظم صاحب نے گردن موڑے بغیر موسیٰ کو مخاطب کیا۔

"مجھے کسی بھی بس سٹاپ پر اتار دیجئے ناظم صاحب!"

ناظم صاحب نے ڈرائیور کی طرف دیکھا اور ڈرائیور نے گاڑی سٹارٹ کر دی۔

جب شام کے سائے اچھی طرح ڈھل گئے تو موسیٰ لوکل بس میں جہانگیر آباد پہنچا۔ جہانگیر آباد کی بستی میں قمقمے جل اٹھے تھے لوگ ادھر اُدھر ٹولیوں میں بے سیر کر رہے تھے۔ سامنے اس کا دوست بخت جمال ایک سبزی فروش کی دکان پر کھڑا دکھائی دیا۔ دن بھر کے گھومنے پھرنے سے موسیٰ کی ٹانگیں دُکھنے لگی تھیں اور سر میں درد ہو رہا تھا۔ موسیٰ بوجھل قدموں سے اپنے دوست کی جانب بڑھا۔

"سوچا آج پالک کا ساگ پکایا جائے" بخت جمال موسیٰ کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ "بڑی دیر کر دی آپ نے۔ کہاں چلے گئے تھے؟"

"سیدھا دفتر سے آ رہا ہوں" موسیٰ نے تھکے تھکے لہجے میں جواب دیا۔ "تھوڑے سے آلو بھی خرید لو۔ ساگ میں آلو اچھے لگتے ہیں۔"

سبزی خرید کر دونوں دوست اپنے گھر کی جانب چل پڑے۔ موسیٰ کی ٹانگوں میں ٹیسیں اور بڑھ گئی تھیں اور وہ چاہتا تھا کہ گھر جلد سے جلد پہنچ جائے۔ مگر بخت جمال راستے میں ایک کریانہ فروش کی دکان پر ٹھہر گیا۔ یہ دکاندار ایک سرکاری ملازم تھا جو اپنے فالتو وقت میں بیٹے کا ہاتھ بٹانے دکان پر بیٹھ جایا کرتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا۔ بخت جمال کے اس کے ساتھ گہرے مراسم تھے۔ جبھی تو چھوٹتے ہی بخت جمال نے دکاندار سے پُر مذاق انداز میں دریافت کیا۔

"ہاں تو اخلاق صاحب! لڑکی کو پھنسانے کے کیا کیا گُر ہیں؟ اور یہ کیا بات ہے کہ یہاں کی ایک بھی لڑکی نے آج تک مجھے لفٹ نہیں دی۔

کیا میں بدصورت ہوں۔؟"

"کون کہتا ہے آپ بدصورت ہیں؟ آپ تو بہت خوبصورت ہیں۔ وجیہہ اور دراز قد ہیں۔ کوئی بھی لڑکی آپ کو پسند کر سکتی ہے۔ بشرطیکہ ـــ" دکاندار نے اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اور بخت جمال کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔

"بشرطیکہ؟" بخت جمال نے لقمہ دے کر اُسے اپنی بات مکمل کرنے کی شہہ دی۔

"بشرطیکہ ـــ آپ غسلخانے میں صابن کم استعمال کیا کریں۔ آپ کی آنکھوں میں جو زردی تیر رہی ہے اسی نے سب کام بگاڑ دیا ہے۔" اور بخت جمال یہ سن کر جھینپتا ہُوا بغلیں جھانکنے لگا۔ ایک قہقہہ لگا کر اس نے ایک لمحہ کے لئے چُپ سادھ لی اور پھر کہنے لگا۔

"دراصل میں ایک ایسے حسین پیکر کا عاشق ہوں جو میرے لاشعور میں بسی ہوئی ہے کئی سال ہوئے وہ مجھے اس جیتی جاگتی دنیا میں ایک دن اور ایک رات کے لئے ملی تھی پھر بچھڑ گئی۔ جب میں اپنا تجزیہ کرتا ہوں تو اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ مجھے بے راہ و گمراہ کرنے والی صرف وہی ایک صورت ہے جس کا ہیولا ہر وقت میری نگاہوں میں گھومتا رہتا ہے اور پھر میں بے قابو ہو جاتا ہوں۔"

"اسی لئے تو میں کہتا ہوں تصوراتی دنیا سے نکل آؤ۔ تمہاری آنکھوں کی یہ زردی خود بخود زائل ہو جائے گی۔"

"اس بحث کو چھوڑو بخت جمال! میں تھکا ہوا ہوں۔ چلو گھر چلیں" موسیٰ نے اکتا کر بحث کو وہیں ٹھپ کر دیا۔ اور دکان سے باہر نکل آیا۔ تھوڑی دیر بعد بخت جمال اُس سے مل گیا اور پھر دونوں نے اپنے مکان کی راہ لی۔

"بھٹیارن کی بیٹی مان گئی ہے" جب وہ دونوں گلی کے نکڑ پر پہنچے جہاں سے بھٹیارن کا جھونپڑی نما چھپر صاف دکھائی دے رہا تھا تو بخت جمال نے موسیٰ کو آگاہ کیا۔

"کیا مان گئی ہے؟" موسیٰ نے تعجب کا اظہار کیا۔

"یہی کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے" بخت جمال نے فخریہ انداز میں کہا۔

"بخت جمال! ـــ خدا کے لئے ایک غریب لڑکی کے جذبات سے مت کھیلو۔ بیچاری کی زندگی دوبھر ہو جائے گی" موسیٰ نے اسے خبردار کیا مگر اس کا بخت جمال پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اپنی بڑ ہانکتا رہا۔

"چھوڑو یار! میں تھوڑا ہی اس کے جذبات سے کھیل رہا ہوں۔ وہ خود ہی ایک پکے پھل کی طرح میری گود میں گرنے کے لئے بے چین ہے میں پیچھے ہٹ گیا تو یہ پھل کسی اور کی گود میں گر پڑیگا۔ میں نے اسے تھوڑے ہی اکسایا ہے۔ تم کیا جانو میرے دوست! لاشعوری طور پر ہر لڑکی مجھے وہی فرانسیسی سیاح عورت دکھائی دیتی ہے جسے کسی زمانے میں میں گاؤں کا پہاڑی ڈاک بنگلہ دکھانے لے گیا تھا۔

میلوں مسافت اور دشوار گذار گھاٹیاں عبور کرکے جب ہم ڈاک بنگلہ پہنچے تھے تو رات نے اپنی سیاہ ترین چادر بچھاکر ہم دونوں کو نگل لیا تھا۔ وہ تاریک ترین رات کتنی حسین تھی۔ آج بھی سوچتا ہوں تو کلیجے پر برچھیاں چلنے لگتی ہیں۔ وہ رات میری زندگی میں پھر کبھی نہیں آئے گی۔ اور اسی رات نے اپنی تاریکی کا فسوں پھونک کر میری زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ اسی رات میں نے بلوغت کی سرحد پار کی تھی۔ اور آج تک مارا مارا پھر رہا ہوں۔ میرے اخلاق کی گراوٹ کی ذمہ دار وہی فرانسیسی عورت ہے جس کی شفاف بلوریں آنکھیں۔ سڈول جسم، گداز مرمریں سینہ اور شانوں پر بکھرے ہوئے سنہرے بال۔۔۔ جیسے میری نگاہوں میں رچے ہوئے ہیں۔ میں ہر لڑکی میں اس کا کوئی نہ کوئی پرتو پاتا ہوں۔ اور میرے جذبات میں طوفان امڈ آتا ہے۔ اور میں پاگلوں ایسی حرکتیں کرنے لگتا ہوں کئی بار ایسا بھی ہوا کہ میں راہ چلتی کسی لڑکی پر جھپٹنے کو تیار ہو گیا ہوں۔ پھر جیسے اچانک میں خواب سے بیدار ہو جاتا ہوں اور اپنے آپ پر لعنت بھیجتا ہوا بال بال بچ جاتا ہوں۔ لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر منائیگی۔ معلوم ہوتا ہے۔ ایک نہ ایک دن جیل کی ہوا کھانی ہی پڑیگی۔ جٹیا سن کی بیٹی ہو یا وہ بس سٹاپ والی طالبہ اب تو مجھے ہر لڑکی میں اُس فرانسیسی عورت کی صورت دکھائی دیتی ہے۔ تبھی تو میں انہیں دیکھ کر بے قابو ہو جاتا ہوں۔ اپنی گارڈن والی محبوبہ ہی کو لو۔ وہ اتنی خوبصورت تو نہ تھی لیکن اس کی آنکھیں بھی تو ویسی ہی شفاف

چمکتی تھیں۔ اور قد و قامت میں بھی وہ فرانسیسی عورت جتنی لگتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں اسے دیوانہ وار چاہنے لگا تھا اور اس کی خاطر آج میں اپنے شاندار مستقبل سے ہاتھ دھو بیٹھا ہوں۔ آج میں شراب پیتا ہوں۔ اس کا مزہ میں نے صنوبر کے گھنے درخت کے سائے میں چکھا تھا۔ اور اس فرانسیسی عورت نے مجھے اپنے ہاتھوں سے پلائی تھی۔ تب میں نہیں جانتا تھا۔ کہ میری تھکاوٹ اور درماندگی دور کر دینے والی دوا۔ دراصل شیمپین کے چند گھونٹ تھے اس کا ہلکا ہلکا سرور آج بھی محسوس کرتا ہوں۔ جب میں تھکاوٹ سے چور چور ڈاک بنگلے کے مخملیں فرش پر لیٹ گیا تھا۔ تو وہ فرانسیسی عورت میرے پہلو میں بیٹھ گئی تھی۔ اور اس نے اپنے مرمریں ہاتھوں سے وہ دوا میرے حلق میں انڈیلی تھی۔ میری آنکھوں پر آہستہ آہستہ سرور چھانے لگا تھا۔ اور ہر چیز دھندلا گئی تھی۔ اس دھندلاہٹ میں میں نے نقرئی قہقہے سنے تھے۔ اور کوئی مجھے سہارا دیئے کہیں لے جا رہا تھا۔ کھٹ کھٹ کی آواز کہیں دور سے آرہی تھی اور میرے سامنے زینے کے لاانتہا تختے نہ جانے کتنی دور تک پھیلتے چلے گئے تھے۔ اونچے اونچے۔ بہت اونچے۔ جیسے آسمان کی بلندیوں کو چھو رہے تھے پھر مجھے یوں محسوس ہوا تھا۔ جیسے میں ایک خوابوں کے جزیرے میں کسی حور کے پہلو میں لیٹا ہوا ہوں۔ میری ذلالت میں میرا اپنا کوئی ہاتھ نہیں۔ جاؤ! اس فرانسیسی عورت کی گردن ناپو جس نے ایک دن اور ایک رات کے لئے میری رہبری قبول کی تھی اور آج میں خود اپنا راستہ بھول گیا ہوں۔ ہائے! وہ مرمریں اور گداز سینہ!"

رات کو کھانے سے فارغ ہو کر نجت جمال نے غمِ دوراں کا تذکرہ چھیڑ دیا۔

"ایک سال پہلے جب میں اس شہر میں وارد ہوا تو میری جیب بھری ہوئی تھی۔ شہر کے بہترین ہوٹلوں میں کھانا کھایا کرتا تھا۔ اور اچھے سے اچھا لباس پہنتا تھا۔ لیکن کچھ ابن الوقت قسم کے لوگ میرے ارد گرد جمع ہو گئے اور میری دوستی کا دم بھرنے لگے۔ میں ان کے نام نہاد خلوص سے دھوکہ کھا گیا۔ رفتہ رفتہ میری پونجی کو دیمک کی طرح چاٹنے لگے اور پھر ایک دن مجھے قلاش کر کے غائب ہو گئے۔ یار لوگوں نے میرے کپڑوں پر بھی ہاتھ صاف کر دیا تھا۔ اور پھر میں ملازمت کی تلاش میں مارا مارا پھرنے لگا۔ میرے پاس کوئی ہنر تو تھا نہیں۔ کوئی مجھے کلرک کی حیثیت سے بھی بھرتی کرنے کو تیار نہ ہوا۔

کنگال ہونے سے پیشتر جس محلے میں میں مقیم تھا۔ وہاں اپنے کمرے کے سامنے کھلتی ہوئی ایک کھڑکی میں روز ایک سانولی سلونی سی لڑکی کھڑی دیکھا کرتا تھا۔ آنکھوں کے خاموش اشاروں کے بعد مسکراہٹوں کا تبادلہ ہونے لگا۔ اور پھر ایک دن کھڑکی پھلانگ کر میں اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ اب میں دن رات اپنے کمرے میں پڑا رہتا اور جب بھی موقع ملتا اس لڑکی کے گھر چلا جاتا۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ وہ ستار بہت اچھا بجاتی تھی یہ فن اس نے اپنے باپ سے سیکھا تھا۔ جو کسی فلم کمپنی میں ملازم تھا۔ اور دن رات کا بیشتر حصہ گھر سے غائب رہتا تھا۔ کبھی کبھی وہ لڑکی میری فرمائش

پر گا بھی لیا کرتی۔ لیکن ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس میں ایک عیب بھی تھا۔ وہ مجھ سے محبت کرنے لگی تھی کسی روز جب میں ملازمت کی تلاش میں کہیں باہر چلا جاتا اور تھکا ہارا شام کو لوٹ آتا تو وہ کھڑکی کے پٹ کھول لیتی۔ کچھ دیر آنسو بہاتی اور پھر کھڑکی بند کر کے ستار پر ایک غمگین نغمہ چھیڑ دیتی۔ مگر میں مجبور تھا۔ میں اُسے محبت نہ دے سکتا تھا۔ میں نے لاکھ کوشش کی کہ اس لڑکی میں فرانسیسی عورت سے مشابہت کا کوئی پہلو ڈھونڈ نکالوں لیکن ناکام رہا۔ اس کے جذباتی انداز پر مسکرانے کے سوا اور کر بھی کیا سکتا تھا۔

پھر جب میں بھوکا رہنے لگا۔ تو وہ مجھے اور بھی کریہہ المنظر دکھائی دینے لگی۔ جب وہ اپنی کھڑکی کے پٹ کھول کر آنسو بہاتی مجھے اپنی جانب متوجہ کرنا چاہتی تو میں جھٹ سے اپنی کھڑکی بند کر لیتا۔ میرے ذہن میں نفرت کا لاوا اُبلنے لگتا اور جی چاہتا کہ اس کے منہ پر تھوک دوں۔ چڑیل کہیں کی! میں دل ہی دل میں اسے کوسنے لگتا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ محبت اور پیار ایک ذہنی عیاشی ہے۔ بھوک بڑی قوت ہے۔ میرا ذہن ویران ویران رہنے لگا۔ اور آنکھوں سے وحشت ٹپکنے لگی۔ میں نے اپنی صورت آئینے میں دیکھی تو بھونچکا رہ گیا۔ یہ میں نہیں ہو سکتا ہیں جو اپنے آپ کو گلفام سمجھتا تھا۔ مجھے اپنی صورت پر ترس آ رہا تھا۔ چند ہی دنوں کی بھوک اور فاقے نے میرے کس بل نکال دیئے تھے۔ پچھتاوے اور طرح طرح کے وسوسوں نے مجھے گھیر لیا اور گھر لوٹ جانے

کے متعلق سنجیدگی سے سوچنے لگا۔ لیکن گھر لوٹتا بھی تو کس منہ سے؟۔ اب میرا اس گھر سے کیا واسطہ رہ گیا تھا۔ ماں باپ کے ہزاروں روپے اپنی عیاشی کی بھینٹ چڑھا کر انہیں منہ دکھانے کے قابل رہا تھا؟ یہی کچھ سوچتا ہوا میں مختلف ہوٹلوں کے طواف کیا کرتا شاید کوئی شناسا مل جائے۔ ہوٹلوں میں طرح طرح کے پکوان کی خوشبو سونگھتا اور لوگوں کو کھانے پر ڈٹا ہوا دیکھتا تو میں رگ رگ میں زہر میں بجھی ہوئی سوئیاں چبھتی محسوس کرتا اور دل چاہتا پکوان کے برتنوں کو لات مار کر الٹ کر دوں۔

ایسے ہی ایک شام جبکہ لوگ شب برات کا تہوار منا رہے تھے۔ گلیوں میں بچے شور مچاتے پھلجھڑیاں اور پٹاخے چھوڑ رہے تھے۔ میں بھوک سے نڈھال خستہ و بے حال گلیوں کے چکر لگا رہا تھا۔ دن بھر کی آوارہ گردی سے جوتے نے ایڑی پر کاٹ کھایا تھا جس سے خون رسنے لگا تھا۔ اور مارے ٹیسوں کے میرے آنسو نکل نکل آتے۔ میں اسی حالتِ زار پر کڑھتا بھنتا یا ہوا ایک جان پہچان والے ہوٹل میں داخل ہوا۔

ہوٹل کا مالک میری فیاضی اور سخاوت سے پہلے ہی کا سے متاثر تھا مجھے دیکھتے ہی اس نے نوکر کو آواز دی اور پھر اپنے اکاؤنٹر کے قریب کرسی بچھا کر مجھے بڑی عزت سے بٹھایا۔ میں نے دیکھا تمام میزوں کے اردگرد لوگ بیٹھے طعام میں مصروف تھے۔ پکوان کی بھینی بھینی خوشبو چڑھتے چڑھتے میرے دماغ تک پہنچ گئی اور مارے غصے کے میری

مٹھیاں بھینچ کر رہ گئیں۔

"آخر اُس نے مجھے سمجھا کیا ہے؟" میں نے ہوٹل کے مالک کو گھور کر دیکھا اور نفرت سے زمین پر تھوک دیا۔

"میں کوئی بھیک منگا تو نہیں!" میں بڑبڑایا۔ یکبارگی میرے ذہن نے ان تمام لوگوں کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر دیا۔ جو اس وقت بڑے اطمینان اور سکون سے کھانے پر ڈٹے ہوئے تھے۔

"سنو! اے لوگو!!" میں انہیں مخاطب کرنا چاہتا تھا۔ لیکن میری آواز حلق ہی میں دب کر رہ گئی۔ اور ایک لفظ منہ سے نہ نکل سکا۔ ہوٹل کا مالک گاہک کا نوٹ بھنا رہا تھا

"باپ کا مال سمجھ رکھا ہے۔" میری کنپٹی کی رگیں پھڑکنے لگیں اور میں ہونٹ کاٹنے لگا۔

"صاحب کے لئے کھانا لاؤ۔" ہوٹل کے مالک نے نوکر کو حکم دیا۔

"ذلت کی انتہا!" میں نے دل میں سوچا۔ اب مجھ سے اور برداشت نہ ہو سکا۔ کرسی پیچھے دھکیل کر میں ہوٹل کے مالک کے روبرو کھڑے ہو کر واہی تباہی بکنے لگا۔

"تم مجھے کھانے کا کیا لالچ دے رہے ہو؟ میں جانتا ہوں تم مجھے ٹھگنا چاہتے ہو۔ یہ انگوٹھی سونے کی ہے۔ کوئی پیتل کا چھلا نہیں۔ سمجھے!" میں نے اپنے ہاتھ کی چھنگلی انگلی میں پہنی ہوئی انگوٹھی ہوٹل کے مالک کو دکھاتے ہوئے کہا "اس پر میرا نام کندہ ہے اور میں اپنا نام نہیں بیچ سکتا۔ تم نے مجھے سمجھا

کیا ہے۔ دھوکے باز! فریبی!! کیا تم سمجھتے ہو میں تمہارے ہتھکنڈوں سے واقف نہیں؟"

میں کھڑا کھڑا ڈول رہا تھا میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا رہا تھا۔ اور معدے میں مسلسل اینٹھن اور مروڑ سے اٹھ رہے تھے مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے چاروں طرف بھاپ ہی بھاپ اٹھ رہی ہو اور میں اس میں تحلیل ہو رہا ہوں۔ میں اپنے محلے، اپنی گلی اور پھر اپنے کمرے تک کیسے پہنچا، مجھے کچھ یاد نہیں لیکن جب میں اپنے کمرے کا دروازہ کھولنا چاہتا تھا تو وہ آپ ہی آپ کھل گیا اور میں بتی جلائے بغیر چارپائی پر گر کر زار و قطار رونے لگا۔ رات بھر مجھے نیند نہ آئی۔ کروٹیں بدلتا رہا اور خالی پیٹ کی آگ، پانی پی پی کر بجھاتا رہا صبح صادق سے کچھ پہلے میری آنکھ لگ گئی اور جب جاگا تو سورج کی تیز لکیریں سی میرے کمرے کے اندھیرے کو چیر رہی تھیں۔ یہ دیکھ کر میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ میز پر پلاؤ سے بھری ہوئی پلیٹ پڑی تھی اور پاس ہی جما ہوا مرغ کا شوربہ ایک تھالی میں زعفران ایسا جگمگا رہا تھا۔ ٹھنڈے چاول جوں جوں میرے پیٹ میں اُتر رہے تھے۔ توں توں میری آنکھیں کُھلتی جا رہی تھیں۔ اُن کی بینائی لوٹ رہی تھی۔ اور آخری لقمہ نگل کر میرے حواس مکمل ٹھکانے آگئے۔ اپنے آپ سے نفرت کے ایک شدید جذبے نے میرے اندر سر اٹھایا۔

"میں زندگی بھر اس کا احسان نہ چکا سکوں گا۔" میں نے اپنے دل میں سوچا پھر میں نے جلدی جلدی سامان سمیٹنا شروع کیا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ

کھڑکی کھول کر مجھے دیکھتی، میں اپنے واحد کمبل میں سامان لپیٹ کر، دروازہ بند کر کے باہر نکل آیا اور ریلوے سٹیشن کے ایک پلیٹ فارم پہ آ کر ڈیرے جما لئے۔ اب میرا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ یہاں تک کہ کچھ عرصہ بعد مجھے یہ نوکری مل گئی اور زندگی معمول پہ آ گئی۔ فاقوں سے کم از کم اتنا تو ہوا کہ میں نے اپنے آپ کو پہچان لیا۔ اب میں اعتدال سے آگے نہیں بڑھتا۔ جتنا کماتا ہوں اسی میں گزر اوقات کرتا ہوں۔ پیٹ بھر کھانا ملنے لگا ہے۔ شاید اسی لئے محبت کی طلب مجھے پھر سے پریشان کرنے لگی ہے۔

"اس لڑکی سے پھر کبھی ملاقات ہوئی ہے؟" موسیٰ نے بخت جمال کو ٹٹولا۔

"نہیں" بخت جمال نے جواب دیا۔ "میں اس سے ملاقات تو کیا، آنکھ ملانے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ جب بھی اس کے متعلق سوچتا ہوں شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہوں۔ میں اسے مزید دھوکہ میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ اس لئے اس کی گلی کا پھیرا پھر کبھی نہ لگایا۔"

اب بخت جمال نے سگریٹ کے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکالا اور اسے انگلیوں میں دباتا اس کا تمباکو باہر نکالنے لگا۔ پھر اس نے اپنے سرہانے سے چرس کی ایک کالے رنگ کی چھوٹی سی گولی لی اور اسے ماچس کی تیلی میں پرو کر آگ پر گرم کرنے لگا۔ پھر تمباکو اور چرس کی گولی کو ہتھیلی پر رکھ کر پیسنے لگا۔ جب چرس اور تمباکو آپس میں اچھی طرح گھل مل گئے تو خالی کھوکھے میں چرس بھر کر اسے آگ دکھا دی۔ ایک کش لگا کر اس نے آنکھیں میچ لیں۔

اور ایک غزل گنگنانے لگا۔

کیسی ہے یہ تکلیف رفع کیوں نہیں ہوتی
کس رنگ کے ہیں زخم یہ بھر کیوں نہیں جاتے

پھر اس پر کھانسی کا شدید دورہ پڑا اور وہ کافی دیر تک گالوں اور پیشانی کو سہلاتا آنکھوں کھوں کھانستا رہا۔ کھانسی کا دورہ کچھ تھما تو وہ دوسرا شعر گنگنانے لگا۔

شب ختم ہوئی تو غمِ دوراں نے پکارا
اے اہلِ خرابات بکھر کیوں نہیں جاتے

لیکن اب کی بار جب کھانسی اٹھی تو بخت جمال کے رونگٹے رونگٹے کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس کی آنکھیں باہر کو ابل پڑیں اور چہرہ زعفران کی طرح زرد پڑ گیا کھانستے کھانستے وہ بے حال ہو گیا اور اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ اپنی زرد زرد و ویران آنکھوں سے موسیٰ کی طرف دیکھتا۔ اس نے رک رک کر کہا۔

"بھاگ کر چوک سے ترش مالٹے یا لیموں جو کچھ بھی ملے لے آؤ۔ جلدی کرو میں مر رہا ہوں۔" بخت جمال جیسے کسی گہرے کنوئیں سے بول رہا تھا۔ موسیٰ اس کے چہرے پر کھنڈی ہوئی زردی دیکھ کر گھبرا گیا۔ اس نے جیب میں کچھ پیسے ڈالے اور چوک تک بھاگتا ہوا گیا۔ موسیٰ کا سانس پھول گیا اور ہونٹ لٹک آئے۔ جونہی وہ میوہ فروش کی دکان پر پہنچا، دکاندار تنبو کا موٹا کپڑا اپنی دکان کے سامنے لٹکا کر گھر جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔

ایک درجن باسی مالٹے جھولی میں ڈال کر موسٰی الٹے قدموں اپنے گھر کی سمت سرپٹ بھاگنے لگا۔ چارپائی پر پڑا بخت جمال ادھر ادھر سر پٹخ رہا تھا موسٰی نے جلدی جلدی چاقو سے چند مالٹے کاٹے اور ان کا رس بخت جمال کے منہ میں ٹپکانے لگا۔

"چھ مالٹوں کا رس اس کے منہ میں ٹپکا کر اس نے بخت جمال سے پوچھا "کچھ افاقہ ہوا؟"

اور بخت جمال تکیہ پر غشی میں بدستور سر پٹختا رہا۔ اب موسٰی اور بھی گھبرا گیا۔

"کہیں یہ مر نہ جائے!" موسٰی کا دل ڈوبنے لگا۔ یہ انوکھا مرض اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

وہ بھاگتا ہوا دوبارہ گھر سے باہر آیا اور چوک پر پہنچ کر ایک راہگیر سے ڈاکٹر کا پتہ معلوم کرکے، اس کے مکان پر پہنچا۔ دو منزلہ مکان کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے چیخ چیخ کر ڈاکٹر کو آوازیں دینی شروع کیں۔

کچھ دیر بعد ڈاکٹر بالکنی میں نمودار ہوا لیکن اتنی رات گئے اس نے موسٰی کے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا۔

"مریض کو صبح مطب میں لے آئیں۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں" ڈاکٹر نے اوپر بالکنی سے جھانکتے موسٰی کو جواب دیا۔ اور موسٰی کا گلا رندھ گیا۔ اس کی آواز کانپنے لگی۔

"میرے دوست کی زندگی اور موت کا معاملہ ہے ڈاکٹر صاحب!

موسیٰ روہانسا ہوا۔

"مہربانی ہوگی ڈاکٹر صاحب! جلدی کریں۔ خدا کے لئے ڈاکٹر صاحب! میرے دوست کی زندگی بچا لیجئے۔!"

ڈاکٹر نے بالآخر ہامی بھری اور اس کے ساتھ جانے پر آمادہ ہوا۔ موسیٰ بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ رہ رہ کر اسے بخت جمال کا خیال آنے لگا۔ کھٹ کھٹ کرتا ڈاکٹر تنگ سی سیڑھیوں پر نمودار ہوا۔ لپک کر موسیٰ نے اس کے ہاتھ سے چرمی تھیلا سنبھالا اور ڈاکٹر کے آگے آگے تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ راستے میں بار بار اسے ڈاکٹر کے لئے رکنا پڑتا۔ اُسے ڈاکٹر پر بے طرح غصہ آرہا تھا۔ جو نہایت سست رفتاری سے اس کے پیچھے ٹہلتے آرہا تھا۔

"بڑے بے حس ہوتے ہیں یہ ڈاکٹر" موسیٰ نے جھنجھلا کر سوچا۔ اور چاہا کہ ڈاکٹر کا چرمی تھیلا زمین پر پٹخ دے "بے حسی کی انتہا!"

موسیٰ اپنے مکان میں بھاگتا ہوا داخل ہوا۔ اور یہ جان کر اس کی جان میں جان آئی کہ بخت جمال ابھی زندہ تھا۔ سانس لے رہا تھا۔ ڈاکٹر کو اس نے راستے ہی میں مرض کی تھوڑی بہت تفصیل بیان کر دی تھی۔ لیکن یہ نہ بتایا تھا کہ اس کا دوست چرس پینے کا عادی ہے۔ بلکہ یہ بہانہ تراشا کہ بخت جمال کے کچھ دوست ملنے آئے تھے اور انہوں نے دھوکے میں اُسے چرس کا بھرا ہوا سگریٹ پلا دیا تھا۔

ٹیکہ لگا کر ڈاکٹر اپنا تھیلا بند کرتے ہوئے موسیٰ سے مخاطب ہوا۔

"تعلیم یافتہ ہو کر اگر آپ لوگ ایسی مذموم حرکتیں کرتے ہیں تو جاہلوں سے اچھائی کی کیا توقع رکھی جا سکتی ہے"

"یہ بات نہیں ڈاکٹر صاحب! انہیں دھوکہ سے چرس پلائی گئی ہے"

"خیر اب صبح تک اگر ان کی حالت درست نہ ہوئی تو مطب میں آکر دوا لے لینا۔ ویسے میرا خیال ہے اس انجکشن سے انہیں آرام آجائے گا۔"

"شکریہ ڈاکٹر صاحب! بہت بہت شکریہ" موسٰی کی جان میں جان آگئی تھی۔

"یہ رہی آپ کی فیس!" موسٰی نے جھکتے ہوئے ڈاکٹر کو مخاطب کیا۔ موسٰی کے پاس کل بیس روپے تھے جو اس نے ڈاکٹر کو پیش کر دیئے۔ یہی اس کی کل پونجی تھی۔ اور ابھی تنخواہ ملنے کا فی دن باقی تھے۔ "بھاڑ میں جائیں روپے!" اس نے مسرور سوچا۔ اس کے دوست کی زندگی تو بچ گئی۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد موسٰی نے بخت جمال کے پاؤں سے جوتے اتارے اور انہیں چارپائی پر سیدھا لٹا کر اسے چادر اوڑھا دی۔ بخت جمال کی حالت اب پہلے سے بہتر تھی۔ اس کا سانس پرسکون آ جا رہا تھا۔ اور چہرے سے زردی زائل ہو کر رنگ معمول پر آ رہا تھا۔

صبح اتوار تھا۔ دفتروں میں چھٹی تھی۔ موسٰی نے بتی بجھا دی اور اپنے کمرے میں آکر کپڑے تبدیل کر کے لمبی تان کر سو گیا۔

"اٹھو! مجھے نئی زندگی بخشنے والے اٹھو! چلئے پیدو۔" دن چڑھے موسٰی نے آنکھیں کھولیں تو اپنے سامنے بخت جمال کو مسکراتا ہوا پایا۔ موسٰی اسے ٹکر ٹکر دیکھنے لگا۔ پھر وہ چارپائی سے اچھلا اور بخت جمال کے گلے لگ گیا۔ دونوں کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اور

وہ ایک دوسرے کیلئے ہمدردی کے جذبات سے سرشار الگ ہو گئے۔

"مجھے یہ فکر نہ تھی کہ میں مر جاؤں گا۔ موت برحق ہے۔۔ میں تو تمہارے لئے پریشان ہو رہا تھا۔ ان نامساعد حالات میں تم میری لاش کیوں کر گاؤں تک پہنچا سکتے!" بخت جمال نے موسیٰ کے پائینتی بیٹھے ہنستے ہوئے کہا۔ اور موسیٰ نے قہقہہ لگا کر بخت جمال کے کندھے کو تھپتھپایا۔

حوائجِ ضروریات سے فارغ ہو کر موسیٰ نے ہاتھ منہ دھویا اور پھر پھر دونوں نے ایک ساتھ ناشتہ کیا۔

"آج میں تمہیں اپنے ایک ایڈیٹر دوست سے ملانے لے جاؤں گا۔ تقریباً پچاس سال کی عمر کے اس دوست نے ابھی تک شادی نہیں کی۔ اس کی باتیں بڑی دلچسپ ہوتی ہیں۔ اس کے نظریات عجیب ہیں۔ دوپہر وہیں گذاریں گے اور کھانا بھی وہیں کھائیں گے۔"

بخت جمال نے چہک کر موسیٰ کو آگاہ کیا۔ اور پھر دونوں کپڑے تبدیل کر کے باہر نکل آئے۔

"ایک بات بتا دوں!" موسیٰ نے مکان کو تالا لگاتے جھجکتے ہوئے بخت جمال سے کہا "تمہارے دوست کا ٹھکانہ کہیں دور تو نہیں۔ میری جیب میں صرف ایک روپیہ ہے"

"فکر نہ کرو میرے دوست!" بخت جمال نے سامنے ایک مکان کی چاردیواری پر نگاہیں جماتے جواب دیا "پانچ روپے میرے پاس بھی ہیں کام چل جائے گا۔ کل ہی دفتر سے جتنے روپے کہو لے آؤں گا۔ محاسب میرا دوست ہے۔ حسب ضرورت جتنی رقم چاہوں لے لیا کرتا ہوں اور تنخواہ ملنے پہ لوٹا دیا کرتا ہوں۔" مکان کو تالا لگا کر دونوں دوست بس سٹاپ کی طرف چل پڑے۔

صبح ہی صبح موسیٰ کے دفتر میں ایک مجمع لگ گیا تھا۔ اور باتوں باتوں میں علم دست شناسی کا ذکر چل نکلا تھا۔ موسیٰ نے اس علم کا تھوڑا بہت مطالعہ کر رکھا تھا۔ اور چند ایک گرانڈ بک کر رکھے تھے۔ جن کی وساطت سے وہ دست شناسی پہ بحث کر سکتا تھا۔

اعجاز کی زندگی میں ایسے کوئی غیر معمولی واقعات نہ تھے جن کی طرف موسیٰ اشارہ کر سکتا۔ اور یہ جان کر تو اعجاز کو اور بھی مایوسی ہوئی کہ وہ دوبارہ سمندر پار کا کوئی ملک نہ دیکھ سکے گا۔ سفر کی صرف ایک ہی لکیر زندگی کی لکیر پہ گر رہی تھی جس سے اعجاز پہلے ہی سے استفادہ کر چکا تھا۔ اعجاز کا ہاتھ دیکھ کر مس برکت مسیح نے بڑے شوق اور اشتیاق سے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

اور ابھی مس برکت مسیح کا ہاتھ موسیٰ دیکھ رہا تھا کہ دروازہ کھول کر اچانک مس ہارڈن موسیٰ کے دفتر میں آدھمکیں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" اس نے مجمع پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور موسیٰ سے دریافت کیا۔

"بتائیے نا موسیٰ صاحب! میری قسمت میں کیا لکھا ہے؟" مس برکت نے مس ہارڈن کو گھور کر دیکھا اور موسیٰ سے سوال کیا۔

موسیٰ کے لئے یہ ایک انوکھا تجربہ تھا۔ کتنی عجیب بات تھی موسیٰ سوچنے لگا کہ یہ پڑھی لکھی لڑکیاں علمِ دست شناسی میں اتنی دلچسپی لے رہی تھیں۔ موسیٰ مس برکت مسیح کا ہاتھ، ہاتھ میں لیئے سوچتا رہا اچانک زندگی کی لکیر پر اس کی نگاہیں جم کر رہ گئیں۔ انگوٹھے کے نیچے ابھار پر زندگی کی لکیر شکستہ تھی اور آگے چل کر ایک مقام پر ٹوٹ گئی تھی۔ اس نے بڑے دُکھ سے مس برکت کی طرف دیکھا لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اُسے اس مہلک حادثے کی پیشن گوئی کر کے اُسے کسی وہم میں مبتلا کرے اور پھر یہ حادثہ پینتیس ۳۵ برس کی عمر سے پہلے پیش آنے والا نہیں تھا۔ اس لیئے موسیٰ حادثے کا ذکر گول کر گیا۔

شادی کی لکیر کے ساتھ ساتھ دو باریک لکیریں، دل کی لکیر کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔ یہ لڑکی ہرجائی اور رومان پسند واقع ہوئی ہے۔ موسیٰ نے دل میں سوچا اور پھر اسے بتایا کہ اس کی شادی پچیس ۲۵ برس سے پیشتر نہیں ہوگی۔ مس برکت مسیح کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

اور اس نے شرما کر منہ دوسری جانب پھیرتے کہا۔

"میں تو شادی کے جنجال میں پڑنا ہی نہیں چاہتی۔" اور دھیرے سے اس نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔

"اب آپ میرا ہاتھ دیکھیں موسیٰ صاحب! اور مجھے بتائیں کہ میرے پاس دولت کی ریل پیل ہوگی۔ یا نہیں؟ مس شہلا نے پُراشتیاق نگاہوں سے موسیٰ کی طرف دیکھا اور اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ مس شہلا کے انگوٹھے کی ساخت دیکھ کر موسیٰ نے اندازہ لگایا کہ وہ بڑی تنگ نظر لالچی اور کنجوس ہے۔ قسمت کی لکیر شروع میں بڑی واضح اور صاف کلائی سے ہوتی ہوئی ہتھیلی کے درمیانی حصے میں پہنچ کر اچانک غائب ہوگئی تھی۔

"جب تک والدین کا سایہ آپ کے سر پہ رہا آپ آسودہ حال اور خوشحال زندگی بسر کرتی رہیں۔" موسیٰ نے مس شہلا کو بتایا۔

"اب آپ کے لئے صرف ایک دروازہ کھلا ہے اور وہ ہے تعلیم کا دروازہ ۔۔ اگر آپ ملازمت کے چکر میں نہ پڑتیں تو کامیابی یقینی تھی۔"

"مگر میں کیا کرتی۔ والد کی وفات کے بعد میرے لئے تعلیم جاری رکھنا ناممکن تھا۔" مس شہلا کے چہرے پہ حزن کا سایہ تیرنے لگا۔ اور اس کی آنکھیں بھیگ بھیگ گئیں۔

"پامسٹری فراڈ ہے۔ محض فراڈ!" مس ہلدن نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

شاید وہ اُکتا گئی تھی اور چاہتی تھی کہ موسیٰ اس کھیل کو جلد ختم کر دے۔

"میں نے کب کہا مس ہارون! کہ آپ علم دست شناسی پر اعتقاد رکھیں"، موسیٰ نے جل کر جواب دیا۔ "لیکن اتنا ضرور کہوں گا مس ہارون! کہ اس علم کا مستقبل اتنا ہی درخشاں ہے جتنا کسی بھی علم کا مستقبل ہو سکتا ہے۔ علم ابنات، نفسیات، روحانیات اور ستاروں کا علم، یہ سب علوم بھی قیاسی دلائل پر مبنی ہیں۔ چاند، مشتری اور زہرہ وغیرہ تک کون پہنچا ہے لیکن ان کے متعلق دلائل ہی سے ہم کوئی نہ کوئی نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ اور یہی دلائل اور قیاس آرائیاں آج ہمارے سامنے مختلف علوم کی صورت میں رونما ہو گئی ہیں۔ اب ہم ان علوم پر صدقِ دل سے ایمان لے آئے ہیں۔ اور جو بعض لوگ منکر ہیں۔ انہیں اکثر لوگ جاہل، بے وقوف اور تنگ نظر سمجھتے ہیں۔ انہی علوم میں ہم مزید دلائل شامل کر کے دوسروں کے لئے مشعلیں روشن کر رہے ہیں۔ اسی طرح علم دست شناسی پر بھی تحقیق ہوئی ہے۔ اور کچھ قابل فہم نتائج بر آمد ہوئے ہیں۔ اور وہ دن دور نہیں جب لوگ اس علم کو بھی تسلیم کر لیں گے۔"

بحث کے دوران موسیٰ نے محسوس کیا کہ مس ہارون خواہ مخواہ بنتی ہے۔ اس کی افسری کا چھلکا اتار دیا جائے تو اندر سے کھوکھلی، غبی اور بجوں ایسی باتیں کرنے والی عورت نکل آئے گی۔ جو بار بار "وہم" "لڑکیاں" ایسے جملے استعمال کر کے اپنے آپ کو مسلسل دھوکہ دے رہی تھی حالانکہ

سب جانتے تھے کہ اس کی عمر بتیس ۳۲ برس سے تجاوز کر چکی تھی اور اب وہ لڑکی ہرگز نہیں رہی تھی۔ اب تک اپنے آپ کو لڑکی سمجھنا، محض اس کی کوتاہ نظری تھی۔ آخر وہ اپنے لئے "عورت چلو جوان عورت ہی کہہ لو" کا لفظ کیوں نہیں استعمال کرتی تھی۔ طرفہ یہ کہ بار بار اپنے کندھوں کو یوں جھٹکے دیتی جیسے افلاطون کی شاگرد رہ چکی ہو سا ور کسی کو خاطر میں لانا اپنی توہین سمجھتی ہو۔ موسیٰ سوچنے لگا۔ عورت کی فطرت بے حد پُراسرار ہوتی ہے۔ مس ہارون ایک طرف تو اپنے آپ کو لڑکی ثابت کرنے پر کمربستہ تھی اور دوسری طرف طفلانہ حرکتوں سے لوگوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی تھی۔ چبا چبا کر اور ہونٹوں کو عجیب انداز سے کاٹتی یوں باتیں کرتی جیسے اس کی ہر دلیل سولہ آنے کھری ہو اور اس کی ہر بات سو فیصد درست ہو۔ کسی موضوع پر بھی بجز ادب کے موضوع کے، لاعلمی کا اظہار تو اس نے سیکھا ہی نہ تھا۔

"ہاں تو۔ مسٹر موسیٰ! ۔ یہ بحث کبھی ختم ہو ہی نہیں سکتی۔ مجھے یہ روئیداد ٹائیپ کرانی ہے۔ اور دوسرے ٹائیپسٹ مصروف ہیں۔ آپ سب کام چھوڑ کر پہلے میرا کام کیجئے!" مس ہارون نے بحث میں لاجواب ہو کر اپنی برتری کا احساس یوں دلایا۔ پھر اس نے مس برکت اور شہلا پر رعب جمایا۔

"لڑکیو! ۔ جاؤ ۔ اپنا کام کرو سبے چارے محاسب کا وقت ضائع نہ کرو" مس برکت اور مس شہلا جز بز ہو کر رہ گئیں۔ ان کے ہونٹ لٹک آئے

"چلو بھئی! اب یہاں اپنی دال نہیں گل سکتی"، مس شہلا نے مس ہارون پہ چوٹ کی۔ اور پھر دونوں ٹھک ٹھک کرتے جوتوں سے باہر نکل گئیں جب

وہ دونوں لڑکیاں باہر نکل گئیں تو مس ہارون نے دوبارہ موسیٰ کو یاد دلایا۔
"تو آپ میرا کام کب شروع کریں گے؟"
"ایک گھنٹے کی مہلت چاہتا ہوں مس ہارون!" موسیٰ نے بادلِ ناخواستہ جواب دیا۔ "میں نے پچھلے دو برسوں کا تخمینہ لگانا ہے۔ اور یہ کام اشد ضروری ہے۔"
"یہ کام اتنا ضروری نہیں مسٹر موسیٰ! جتنا میرا کام ضروری ہے۔"
جیسے آپ کی مرضی مس ہارون! کام ہی تو کرنا ہے۔ اپنا ہو چاہے آپ کا"
"اس کا مطلب تو یہ ہوا آپ میرے کام کو اپنا کام نہیں سمجھتے"
"معاف کیجئے مس ہارون! یہاں مجھے آپ سے اختلاف ہے۔ جیسے آپ اپنے کام کے لئے جواب دہ ہیں۔ ویسے ہی میں بھی اپنے کام کے لئے جواب دہ ہوں۔ بہر کیف چونکہ آپ کے خیال میں آپ کا کام اشد ضروری ہے۔ لہٰذا میں اپنا کام بعد میں کر لوں گا۔ لائیے۔ کاغذات میرے حوالے کیجئے۔ میں ٹائپ کرنا شروع کرتا ہوں"
"دیکھنا ٹائپ اتنا خوبصورت ہو کہ دیکھنے والے دیکھتے رہ جائیں۔"
بے چاری عورت ہی تو ہے۔ صدیوں سے مردوں کی غلامی سہتے سہتے لاشعوری طور پر مردوں سے انتقام لینے پر اُتر آئی ہے۔ اور یہ ملازمت بھی اس کے لاشعور کی مردوں سے ایک کھلم کھلا بغاوت کی نشانی ہے۔ موسیٰ نے ٹائپ کی مشین پہ کاغذ چڑھاتے سوچا۔
"جہاں جہاں سمجھ میں نہ آئے مجھ سے پوچھ لیا کریں۔ میرا خط کچھ ٹیڑھا میڑھا

اور شکستہ ہے۔" مس ہارون نے پھر رُعب گانٹھنے کی کوشش کی۔

چاہے کچھ بھی ہو، عورت کو مرد کا سہارا بہرحال قبول کرنا ہی ہوگا۔ اس سے مفر نہیں۔ گھر کی چار دیواری ہو یا دفتر، ہر مقام پہ عورت کو مرد کا سہارا لینا ہی پڑیگا عورت ایک ایسی گاڑی ہے جسے صرف مرد ہی کھینچ سکتا ہے۔ ازل سے یہ سلسلہ یونہی چلا آرہا ہے اور ابد تک اسی ڈھب اور نہج پر استوار رہے گا۔ مرد کم بخت کولہو کا وہ بیل ہے جس کی آنکھوں پہ عورت نے پٹی باندھ رکھی ہے اور وہ رُوں رُوں کرتا برابر اس گاڑی کو کھینچ رہا ہے۔ آخر وہ اسے پٹخ کیوں نہیں دیتا؟ سوچتے سوچتے موسیٰ سے ایک لفظ غلط ٹائپ ہوگیا اور اسے مٹانے کے لئے ربڑ استعمال کرنا ہی پڑا۔

"دھیان سے مسٹر موسیٰ!" مس ہارون نے مشین پر جھک کر کاغذ پر غلط لفظ ٹائپ ہُوا دیکھ کر کہا۔ "میں نے کہا نہ تھا دھیان سے ٹائپ کریں۔ ٹائپ کرتے میں ربڑ کے استعمال سے مجھے سخت نفرت ہے۔ بہتر ہے نئے کاغذ چڑھا دیں" موسیٰ نے اسے گھور کر دیکھا۔ پھر جیسے ضبط سے کام لے کر اس نے مس ہارون کی نکتہ چینی کو برداشت کرلیا۔ اور ظرافت پہ اُتر آیا۔

"دیکھ لیجئے! مس ہارون! غلط لفظ کا نشان تک مٹا دیا ہے۔ فنکار ہوں فنکار"

"ہاں فن کار تو آپ ہیں لیکن باتوں کے۔ کام کے نہیں" مس ہارون مٹے ہوئے لفظ پہ اطمینان کا اظہار کرتے مسکرائی۔

"کاش! میں فن کار ہوتا اور بھوکوں مرتا۔"

"کیا آپ کے خیال میں فنکار بھوکوں مرتے ہیں؟"

"اگر بھوکوں نہیں مرتے تو انہیں مرنا چاہیئے!" مس ہارون!۔ اعلیٰ فن در اصل بھوکا پیٹ ہی تخلیق کر سکتا ہے۔ جس کا پیٹ بھر جاتا ہے، وہ دن رات خرّاٹے بھرتا ہے اور فن اپنی موت آپ مرجاتا ہے۔"

"ایک تجریدی آرٹ والے فن کار کو تو میں بھی جانتی ہوں۔ وہ بھوکوں مرتا ہے اور نہ دُبلا پتلا ہے۔"

"جس فنکار کو آپ جانتی ہیں مس ہارون۔ وہ یقیناً کوئی غیر معروف فنکار ہوگا!" موسلی نے ٹائیپ کرتے کرتے اچانک گردن موڑ کر مس ہارون کی طرف دیکھا اور چوٹ کی۔ لیکن مس ہارون اسے نہ سمجھ سکی۔ اس کا سپاٹ چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔

"اجازت ہو تو ایک سگریٹ پی لوں"، موسلی نے ہاتھ روک کر جیب سے سگریٹ کی ڈبیہ نکالتے ہوئے مس ہارون سے اجازت طلب کی۔ اور پھر ایک سگریٹ سلگا کر اس کے لمبے لمبے کش لینے لگا۔

"ٹائیپ کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی وزنی لوہا کوٹ رہا ہو۔ آپ جانتی ہیں۔ اکثر کلرک تپ دق میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ وزنی لوہا براہِ راست اُن کے پھیپھڑوں اور پسلیوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔"

"اور سگریٹ؟" مس ہارون نے کڑوے دھوئیں سے بچنے کے لئے کرسی سے اٹھ کر کہا۔

"سگریٹ اس مشین کے مقابلے میں زیادہ نقصان دہ ہے، مسٹر موسلی!

آپ کو سگریٹ پینے سے اجتناب کرنا چاہیئے۔ اچھا تو آپ سگریٹ پئیں۔ میں آپ کے لئے چائے بھیجتی ہوں۔" مس ہاردن دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔

"یہ عورت خاصی مہذب ہے"، موسیٰ نے دل میں سوچا۔ اور اس کے متعلق اپنی رائے میں ایک عجیب قسم کی تبدیلی محسوس کرنے لگا۔

"شکریہ! مس ہاردن! ۔ آپ تکلیف نہ کریں" موسیٰ نے تکلف برتا لیکن مس ہاردن مسکرائی دروازہ کھولتے کھولتے اچانک پلٹیں اور موسیٰ پر چوٹ کی۔

"ہاں ہاں۔ آپ تو کنٹین میں بیٹھ کر چائے پینے کے عادی ہیں۔ وہاں چائے پینے میں شاید زیادہ لطف آتا ہے" مس ہاردن کھل اٹھیں اور پھر دروازہ کھول کر باہر نکل گئیں۔ موسیٰ کنٹین والا واقعہ یاد کرکے جھینپ گیا۔

تھوڑی دیر بعد چپڑاسی ہاتھ میں چائے کا پیالہ لئے موسیٰ کے کمرے میں داخل ہوا۔ موسیٰ نے چائے کی دو ایک چسکیاں بھریں اور دوبارہ ٹائپ کرنے میں منہمک ہو گیا۔ موسیٰ آخری صفحہ ٹائپ کر رہا تھا کہ مس لخلخہ یعنی مس مخدوم خلجی موسیٰ کے کمرے میں داخل ہوئیں۔

"ہیلو!"

"صبح کا سلام مس مخدوم!"

مس مخدوم امریکہ سے ہو کر کیا آئی تھیں کہ ان کے طور طریقے اور رکھ رکھاؤ سب امریکنوں جیسا ہو گیا تھا۔ بالوں کی تراش، لباس، لہجہ اور نامکمل طریقے پر ادائیگی کا اندازِ گفتگو سب امریکنوں سے مستعار لے کر

اپنے ملک لوٹی تھیں۔ اور چاہتی تھیں کہ اپنے ملک میں بھی ویسے ہی طور طریقے رائج ہو جائیں لیکن چند ہی دنوں کے کھچاؤ اور طعن و تشنیع نے اس کے کس بل نکال دیئے تھے اور اس کے تمام ولولے اور جوش ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ غالباً جب سے وہ مس مخدوم خلجی کے بجائے مس لخلخہ مشہور ہوئی تھیں، وہ کوشش کر رہی تھی کہ اپنے دیسی طور طریقے آزمائے اس لئے وہ کچھ بجھی بجھی اور مایوس سی دکھائی دیتیں۔

"ناظم صاحب مجھے صدر دفتر میں ملے تھے" مس مخدوم نے موسیٰ سے کہا۔ "آپ کے پاس جو عبرآباد پناہ گزینوں والی مثل ہے۔ ناظم صاحب کو اس کی اشد ضرورت پڑ گئی ہے۔ آپ وہ مثل لے کر میرے ساتھ صدر دفتر چلیں"

"کیا مصیبت ہے!" موسیٰ نے جھنجھلا کر سوچا۔ "ایک بیگار سے چھٹکارا ابھی ملا نہیں کہ دوسری بیگار سر پہ آن پڑی۔ کام کیسے چلے گا۔؟"

پھر اس نے مشین کے قریب بکھرے ہوئے کاغذات کو سمیٹا اور مطلوبہ مثل بغل میں داب کر مس مخدوم کے ساتھ دفتر سے باہر آیا۔

مس مخدوم کی کار بڑی شاندار تھی۔ امریکہ سے لوٹتے سمے یہی ایک سوغات وہ اپنے ساتھ لے کر آئی تھی اور شاید اسی کار نے اس کا دماغ کچھ بگاڑ بھی دیا تھا۔ جس ناظم کے ماتحت وہ کام کر رہی تھی اس کے پاس بھی اپنی ذاتی کار کوئی نہیں تھی یہاں تک کہ مس امتیاز کی کار بھی اس کی اپنی ملکیت نہ تھی۔ بھلا اس کے چچا کا جو دورے پہ جاتا تو اپنی کار مس امتیاز کی تحویل میں

دیدیتا۔ ورنہ وہ اکثر مقامی بسوں میں سفر کرتی دکھائی دیتی۔ ان لڑکیوں کے اتنے سادہ سے نجی حالات موسیٰ کو کچھ اعجاز کی زبانی معلوم ہوئے تھے۔ اور باقی رہی سہی کسر اب مس مخدوم پوری کر رہی تھی۔ موسیٰ سوچنے لگا۔ یہ عورتوں میں رقابت اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا اتنا شدید جذبہ کیوں کار فرما ہوتا ہے۔ اسی ایک بات کو لیجئے کہ مس مخدوم نے راستے میں مس ہارورن کے متعلق ایسی مخرب اخلاق قسم کی طویل گفتگو کی کہ خود موسیٰ کو اپنے وجود سے شرم آنے لگی۔

"زندگی کی اعلیٰ قدریں پامال ہو رہی ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے۔ کہ ہم اپنے معاشرے کی از سرِ نو تنظیم کریں۔ بات صرف اتنی ہے کہ ہمیں اپنی تہذیب، اپنے تمدن اور اپنے قدیم رسم و رواج کی ایسی ہی حفاظت کرنا ہے جیسے صدیوں سے ہم نے آثارِ قدیمہ کو سنبھال رکھا ہے۔"

مس مخدوم کے پہلو میں بیٹھے ہوئے موسیٰ سوچنے لگا کہ یہ عورت امریکہ سے کیا سیکھ کر آئی ہے؟ اگر کسی کی پیٹھ پیچھے بُرائی کرنا عورت کی فطرتِ ثانیہ بن چکی ہے۔ تو اس اعلیٰ تعلیم، ہزاروں میل کی مسافت اور صعوبتیں اٹھانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ کتنا اچھا ہوتا کہ یہ عورتیں اصیل گائے کی طرح اپنے کھونٹے پہ بندھی جگالی کرتیں اور اپنے خالص دودھ سے تنومند بچے پیدا کرتیں کہ فی الحقیقت وہ اسی قابل ہیں۔"

"آپ نے محسوس کیا ہے مس مخدوم! کہ ہماری روحیں برہنہ ہو رہی ہیں۔ انسان جان بوجھ کر زندگی کے اس ڈھانچے کو تباہی و بربادی

کی اور لیے جا رہا ہے۔ زندگی ہے کہ دُہائی مچا رہی ہے مگر کوئی اس کی آہوں اور فریادوں پر توجہ نہیں کرتا۔

سب نے اس کی جانب سے آنکھیں موند رکھی ہیں اور کانوں میں انگلیاں ٹھونس رکھی ہیں۔ قصور کس کا ہے؟"

موسیٰ اپنی دانست میں فلسفہ بگھار رہا تھا لیکن مس مخدوم قطعاً اس کی طرف توجہ نہیں دے رہی تھی۔ وہ بدستور سامنے والے شیشے کے اس پار پیچھے کی طرف بھاگتی ہوئی کالی سیاہ سڑک پر نگاہیں جمائے ہوئے نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ اس کے کٹے ہوئے بال تیز ہوا میں اس کی پیشانی اور گال پر لہرا رہے تھے۔ اس کے پپوٹے سُوجے ہوئے تھے جیسے وہ شب بیداری کی عادی ہو اور اس کی آنکھیں سُرخ انگاروں ایسی دہک رہی تھیں۔

ٹھوڑی کے نیچے لٹکے ہوئے فالتو گوشت نے اس کی عمر میں دس سال کا اضافہ کر رکھا تھا۔ جس کا شاید اُسے خود بھی شدت سے احساس ہو چکا تھا تب ہی تو وہ بناؤ سنگھار سے گریز کرتی تھی۔ موسیٰ سوچنے لگا۔ عمر کا ایک دور ہوتا ہے۔ جب انسان طوفان اور آندھی کو بھی خاطر میں نہیں لاتا لیکن جوں جوں اس کی عمر ڈھلتی چلی جاتی ہے۔ وہ ہوا کے ایک ہلکے سے جھونکے کا متحمل بھی نہیں ہو سکتا۔ عورت کے بدترین دشمن غرور اور تکبر ہیں۔

کار سڑک پر تیز رفتاری سے بھاگ رہی تھی۔ یہاں تک کہ صدر دفتر آگیا۔ اور موسیٰ خیالوں کی دنیا سے لوٹ آیا۔ چونک کر اس نے احاطے

میں جمع طلباء کے ہجوم کی طرف دیکھا جو احتجاجی جلسہ کر رہے تھے۔ کئی طلباء کے ہاتھوں میں مختلف تختیاں تھیں۔ جن کی عبارت موسٰی دور سے نہیں پڑھ سکتا تھا۔ پھر طلباء کا ایک رہنما چبوترے پر کھڑا ہوگیا اور تقریر جھاڑنے لگا مس مخدوم نے جو اپنی کار ایک درخت کے سائے میں کھڑی کرنا چاہتی تھی۔ گھبرا کر موسٰی کی جانب دیکھا طلباء کا رہنما چلا چلا کر ہجوم کو اشتعال دلا رہا تھا۔

"انہیں ہمارے مطالبات ماننے ہی پڑیں گے۔ نااہل مشیر کی برطرفی کا فوراً اعلان کر دیا جائے۔ کورس کی میعاد میں تخفیف کی جائے اور ان سب قوانین کو کالعدم قرار دیا جائے جنہوں نے ہماری شخصی آزادی کا گلا گھونٹ رکھا ہے۔ ہم اپنے مطالبات منوانے کے لئے ہڑتال کریں گے۔ اور اپنی جدوجہد آخری دم تک جاری رکھیں گے۔"

"بھائیو! — میری ایک تجویز ہے" ایک اور رہنما چبوترے پر کھڑا ہو کر تقریر کرنے لگا لیکن اس کی آواز نعروں اور شور میں دب کر رہ گئی۔

"موسٰی صاحب! ہمیں کار یہاں نہیں کھڑی کرنا چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کوئی ہنگامہ ہو جائے"

مس مخدوم نے ہجوم کی طرف خوفزدہ نگاہوں سے دیکھتے موسٰی سے کہا۔ اور کار دوبارہ سٹارٹ کر کے صدر دفتر کے عقبی دروازے کی جانب بڑھی۔

"ایسے وقت میں طلباء توڑ پھوڑ کو اپنا جائز حق سمجھتے ہیں۔ اور جو بھی سامنے آجائے پتھراؤ شروع کر دیتے ہیں" راستے میں مس مخدوم

اپنے طالب علمی کے دور کی باتیں کرنے لگی۔ "وہ بھی کیا زمانہ تھا!" مس مخدوم نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ اور اپنا ماضی کریدنے لگی۔ اس نے تعلیم زیادہ تر انگریزی سکولوں اور کالجوں میں حاصل کی تھی۔ اس لیئے وہ مخلوط تعلیم کی شدومد سے حامی تھی۔ لیکن امریکہ سے وطن لوٹ کر اس کے خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے۔ اور اب وہ اپنے شکستہ خوابوں کے کھنڈر پہ کھڑی ویرانیوں اور اور تنہائیوں کی شکار ہو کر رہ گئی تھی۔

"اعلیٰ تعلیم کا یہ مقصد نہیں کہ کوئی اپنے ہم وطنوں سے کُلی طور پر کٹ کر رہ جائے اور کسی کو خاطر میں نہ لائے۔ آخر زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پہ ضرور مس مخدوم کو ساتھی ملا ہو گا۔ اس نے موقع سے فائدہ کیوں نہ اٹھایا؟" موسیٰ نے مس مخدوم کے متعلق سوچا جو یقیناً کبھی خوبصورت اور جاذب نظر رہی ہو گی۔ لیکن اب تو نسوانی حسن سے قریب قریب محروم ہو چکی تھی اور یہ نامحرمی اس کے چہرے پر دُھول ایسی جم گئی تھی۔

کتنے دکھ کی بات ہے کہ علم حسن کو کھا جاتا ہے۔ شہر کے چند روزہ قیام کے دوران اور خصوصی طور پہ جامعہ میں اس نے یہ بات شدت سے محسوس کی تھی۔ چند ایک طالبات کو چھوڑ کر زیادہ تر لڑکیاں بناؤ سنگھار سے یہ کمی پوری کرنے کی سعی کر رہی تھیں اور اس کوشش میں انہوں نے اپنی صورتیں اور بھی بگاڑ لی تھیں لیکن نہیں۔ یہ بات غلط ہے۔ موسیٰ نے اپنی دلیل کی آپ تردید کی۔ ترقی پذیر ممالک کی تاریخ شاہد ہے۔ کہ اُن پر ترقی کے دروازے تب کھلے جب انہوں نے تعلیم عام کر دی۔ جن اقوام کے مرد و زن نے تعلیم سے فائدہ اٹھایا ہے۔ آج

وہی ممالک ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔ حسن فانی ہے مگر علم لافانی ہے۔ علم کے لئے حسن کو قربان کرنا ہی ہوگا۔ ہو سکتا ہے ہمارے طریقہ کار ہی کوئی خامی ہو۔ اساتذہ کو چاہیئے کہ نصاب اور تربیت پر نظرثانی کریں۔ بھاری اور ضخیم کتابوں نے بے چاری لڑکیوں کی نظر کمزور کر دی ہے۔ اور انہوں نے بے وقت عینک کا استعمال شروع کر دیا ہے۔ جس سے وہ وقت سے پہلے بوڑھی نظر آنے لگی ہیں۔ مس امتیاز ہی کو لیجیئے۔ تاریخ اور جغرافیہ کے بعد اب وہ معاشیات میں ایم اے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ اب وہ بے چاری عینک نہ لگائے تو اور کیا کرے! کسی نفسیات کے ماہر نے غالباً مس امتیاز جیسی لڑکی ہی کو مدنظر رکھا تھا جب اس نے یہ بات کہی تھی کہ بعض لڑکیاں اپنی جنس کا رُخ حصولِ تعلیم کی طرف اس لئے موڑ لیتی ہیں کہ انہیں موزوں وقت پر موزوں مرد کا قرب حاصل نہیں ہوتا۔

سوچتے سوچتے موسیٰ کا دماغ پک گیا۔ کیسی اوٹ پٹانگ باتیں آج اس کے ذہن میں چکر لگا رہی تھیں۔ آخر ان بے ہودہ خیالات کا محرک کون ہو سکتا ہے۔

"ہاں یاد آیا۔ میں دراصل مس مخدوم کے بارے میں سوچ رہا تھا۔" موسیٰ اپنے آپ سے مخاطب ہُوا۔

مس مخدوم؟ لیکن وہ کہاں ہیں؟ موسیٰ نے حیرت سے ادھر ادھر دیکھا اور یہ جان کر اُسے اور بھی حیرت ہوئی کہ کار صدر دفتر کے عقبی دروازے کے قریب کھڑی ہے اور وہ اس میں تنہا بیٹھا ہُوا ہے۔ وہ یہاں کب پہنچا اور کب مس مخدوم کہیں چلی گئیں۔ اُسے کچھ یاد نہیں آرہا تھا۔ پھر اس نے کار کا دروازہ کھولا اور باہر نکل کر سگریٹ سلگا کر مس مخدوم کا انتظار کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد مس مخدوم بالوں کو جھٹکتی ہوئی نمودار ہوئی۔

"ایک بے وقوف اور ہونق انسان سے واسطہ پڑا ہے۔" موسیٰ کے قریب آکر مس مخدوم نے ناظم پر اپنا غصہ اتارنا شروع کیا۔

"اتنی دور سے میں اس کے لئے فائل لائی اور آنجناب اُلٹے برہم ہوئے کہ میں نے بہت دیر کردی۔ اب فائل کی ضرورت نہیں رہی۔ ہونہہ۔ خود کام کرتا ہے نہ دوسروں کو کرنے دیتا ہے۔ سارا سارا دن دفتر میں لڑکیوں کو بٹھا کر ڈینگیں مارتا ہے یا گپیں ہانکتا ہے اور پھر کہتا ہے۔ وقت یہ ہے کہ مجھے دن رات کام کرنا پڑتا ہے۔" مس مخدوم نے ناظم کی نقل اتارتے ہوئے صلواتوں کا سلسلہ جاری رکھا۔

"اُف! میرے تو سر میں درد ہونے لگا ہے۔ چلو۔ موسیٰ صاحب! کنٹین میں چل کر چائے پئیں۔"

کنٹین میں ایک میز پر بیٹھتے ہوئے مس مخدوم نے دوبارہ ناظم کی بات چھیڑی۔ "ایک دن میں اپنے کام کے سلسلے میں ان سے مشورہ لینے اُن کے دفتر گئی تو کہنے لگے۔ دفتر میں مجھے فرصت نہیں ملتی۔ آپ گھر پر آئیں۔ ہونہہ۔ میں اور اس کے گھر جاؤں گی۔ مجھے بھی انہوں نے مس ہارون سمجھ رکھا ہے!"

مرمر کی چوکور میز کے کنارے پر انگلیاں پھیرتے مس ہارون نے اچانک موسیٰ سے سوال کیا۔

"آپ یہاں کیسے پھنس گئے موسیٰ صاحب؟"

"جیسے آپ!" موسیٰ نے جواب دیا، میرا مطلب ہے۔ تلاشِ معاش

مجھے یہاں کھینچ لائی۔ میرے لئے اس ادارے میں ملازمت ایک معجزہ سے کم نہیں۔ ورنہ میں یہاں بالکل اجنبی ہوں۔ کسی کو نہیں جانتا۔ اور آپ تو جانتی ہیں آج کل اثر ورسوخ کے بغیر کام نہیں چلتا۔"

اسی وقت سفید وردی میں ملبوس بیرا ان کی میز پر آیا اور مس مخدوم سے آرڈر لیکر چلا گیا۔

"ہاں تو میں کہہ رہی تھی۔" مس مخدوم نے موسیٰ کی بات سنی ان سنی کرتے کہنا شروع کیا۔

"جب میں سٹیٹس (امریکہ) سے اپنے وطن لوٹی تھی تو میرا دل اس جذبے سے معمور تھا کہ میں اپنے وطن کی تن من دھن سے خدمت کرونگی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ ایسے گھن چکر اور پاجی قسم کے ناظم سے واسطہ پڑیگا جو نہ خود کام کرتا ہے اور نہ دوسروں کو کرنے دیتا ہے۔ ٹھیک ہے۔ میں خود یہ چاہتی ہوں کہ میری بہنیں زندگی کے ہر شعبے میں مردوں کے دوش بدوش کام کریں لیکن اپنی عزت بیچ کر نہیں۔ مشرقی عورت کا سب سے قیمتی زیور اس کی عزت اور ناموس ہے آپ نے بڑی غلطی کی جو فوجی ملازمت چھوڑ کر یہاں دھکے کھانے چلے آئے۔ میں سمجھتی ہوں اگر کوئی صحیح معنوں میں وطن کی خدمت کرتا ہے تو وہ فوجی ہی ہے۔ امریکہ میں فوجی ملازمت کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔"

"بدقسمتی سے میں فوجی زندگی کے آخری ایام میں کچھ خوش نہیں تھا مجھے مجبوراً گھر جانے کا انتخاب کرنا پڑا۔ فوج کے قوانین پتھر کی لکیر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک بار ایک قانون نافذ ہو جائے۔ آپ لاکھ سر پٹخیں، قانون میں

ترمیم نہیں ہو سکتی ہے۔ بس کچھ ایسے ہی حالات سے دوچار ہو گیا تھا کہ مجھے مجبوراً فوجی زندگی کو خیر باد کہنا پڑا۔ اگر ترقی کے راستے آپ پر بند کر دیئے جائیں۔ تو آپ کیا فیصلہ کریں گی؟"

"اوہو۔ تو آپ نے قصور کیا کیا تھا؟"

"قصور! میرا قصور صرف اتنا تھا۔ کہ میں اپنے عزیز ترین ملک کے ایک خاص علاقے اور ایک خاص قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ تعلق چاہے برائے نام ہی کیوں نہ ہو اور آپ اس کے قائل ہوں یا نہ ہوں آپ کی شناخت اس مٹی سے ہوتی ہے جس سے اتفاقاً آپ کا خمیر اٹھتا ہے۔ فوج کے جس شعبے سے میں منسلک تھا۔ اس میں علاقائی اور قومیت کے لحاظ سے ترقی کا قانون اس وقت رائج ہوا جب میرے ترقی کے کاغذات فوجی ہیڈ کوارٹر میں پہنچ چکے تھے۔ جانچ پڑتال سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ میں جس علاقے سے تعلق رکھتا ہوں، نسبت کے لحاظ سے اس علاقے کے لئے ایک بھی آسامی خالی نہیں ہے بلکہ چند عہدیداران فالتو بھی ہیں۔ لہٰذا میری ترقی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ میری سب اپیلیں اور احتجاج رائیگان گئے۔ میں نے پورے پانچ سال انتظار کیا۔ کندھوں پر لگانے والے پیتل کے چمکدار خصوصی ستارے میرے صندوق میں پڑے پڑے زنگ آلود ہو گئے۔ لیکن میری باری نہ آئی۔ دوسرے طبقوں میں ایسے عہدیداروں کو بھی ترقی مل گئی تھی جنہوں نے میرے ماتحت کام کیا تھا۔ اب ان کے ماتحت کام کرنا میں نے اپنی توہین سمجھا اور آج میں آپ کے سامنے بیٹھا ہوں۔ لیکن مس مخدوم! آپ کا یہ نظام تو میرے لئے

اور بھی انوکھا تجربہ ثابت ہو رہا ہے۔ میں لاکھ کوشش کرتا ہوں۔ مگر اپنے آپ کو اس نئے نظام میں ڈھال نہیں سکتا۔ گو مجھے ہر طرح کی آزادی حاصل ہے۔ دفتر کے اوقات کے بعد، میری مرضی پر منحصر ہوتا ہے کہ میں جہاں چاہوں، جاؤں لیکن فوج میں ایسا نہیں ہوتا۔ فوجی ماحول میں رہتے ہوئے ہم شہری زندگی کی رنگینی اور چاشنی کے لئے ترس ترس جاتے ہیں۔

ہمارے تصورات پر فوجی قوانین کا اس قدر کڑا پہرہ لگا رہتا ہے کہ جب ہم دو یا چار سال بعد مہینے بھر کی مختصر رخصت لے کر اپنے گھروں کو جاتے ہیں تو اپنے عزیز و اقارب کے چہرے مہرے ہمیں اجنبی اور غیر مانوس سے دکھائی دیتے ہیں۔ اپنے خاندان کی نئی پود ہمیں دیکھ کر سہم سہم جاتی ہے یہاں تک کہ بعض اوقات بیوی بھی اپنے فوجی خاوند سے کچھ حجاب سا محسوس کرنے لگتی ہے۔ اور پہلی ملاقات میں اس کا سامنا کرنے سے بوکھلا کر یا تو اپنے کمرے میں گھس جاتی ہے اور یا باورچی خانے سے چھپ چھپ کر شرماتی لجاتی جھانکنے لگتی ہے۔ ایسی زندگی سے دو چار فوجیوں پر اگر ترقی کی راہیں بند کر دی جائیں تو فوجی زندگی سے کنارہ کشی کے سوا ان کے پاس چارہ ہی کیا رہ جاتا ہے؟"

"آپ کی پیالی پر مکھی بیٹھ گئی ہے بیرے سے کہیں پیالی بدل دیں۔" مس مخدوم موسیٰ کے لئے دوسری پیالی بنانے کے ارادے سے منمنائی۔ موسیٰ مسکرا کر رہ گیا۔

"کوئی ہرج نہیں مس مخدوم!" موسیٰ اپنی پیالی آپ بناتے ہوئے کہنے لگا۔ "مجھ پر تو ایسا وقت بھی آیا ہے کہ جب مجھے کھانے میں دال کے ساتھ ساتھ

مٹی بھی نگلنی پڑی ہے۔ مٹی میرے دانتوں میں کچکچاتی، کچ کچ کرتی رہتی اور میں تو اسے نگلتا چلا جاتا۔ مکھیوں کی بھنبھناہٹ خصوصاً جنگ کے زمانے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی اُن دنوں اگر کسی چیز کو بھی ہم نے اہمیت دی ہے۔ تو وہ ہیں دال اور چپاتیاں! یہ ہلکی پُھلکی روٹیاں جنہیں فوجی اصطلاح میں چپاتیاں کہتے ہیں، بڑی اہم ہیں۔ ہفتے عشرے میں ایک آدھ مرتبہ زردہ یا پلاؤ پکتی تو ہم وقت سے بہت پہلے لنگر کے سامنے ڈٹ جاتے اور ٹلتے تب جب ہمارے راشن ٹین پلاؤ زردے سے لبالب بھر دیئے جاتے۔ سپاہی گوشت کی ایک ایک "بوٹی" کے لئے لانگری سے گھنٹوں سر کھپاتے یہاں تک کہ ہاتھا پائی سے بھی نہ چوکتے دراصل لاشعوری طور پر وہ راشن بندی کی مخالفت کرتے ہیں۔"

"جنگ کے معرکوں کا ذکر بے سود ہے مس مخدوم!۔ آپ نے جنگ کی تباہیوں، ہولناکیوں اور سٹرانڈ کے متعلق بہت کچھ سُنا اور پڑھا ہوگا۔ اس موضوع پر متعدد فلمیں بھی دیکھی ہوں گی۔ میں جنگ کی بات نہیں کرتا۔ میں اُن جیالوں کی بات کرتا ہوں جو جنگ میں حصہ لیتے ہیں۔ اور وطن کے محافظ کہلاتے ہیں۔ یہی جیالے جب آپ کے شہروں میں کبھی کبھار آنکلتے ہیں تو آپ کے شہری انہیں دل کھول کر لوٹتے ہیں۔ انہیں بے وقوف سمجھ کر ہر چیز کے دُگنے دام وصول کرتے ہیں بے چارے سپاہیوں کے پاس اتنا وقت کہاں ہوتا ہے۔ کہ وہ کوئی چیز خریدنے سے پیشتر دوسرے دکاندار سے اپنی تسلی کر سکیں۔ اور آپ کے شہروں کے یہ دکاندار سپاہیوں

کے سروں پر طرۂ بے وقوفی باندھ کر بعد میں ان کی نادانی اور بھولپن کا مذاق اڑاتے ہیں۔ آپ نے کبھی محسوس کیا ہے کہ ہر اتوار کی صبح یہ دکاندار کس خوشی میں چہکتے ہیں؟"

یہی وہ صلہ ہے جو آپ کے شہری ان تارک الدنیا سپاہیوں محافظانِ وطن کو عطا کرتے رہیں۔ چالیس پچاس یا اسی روپیہ آپ کے ایک دن کا خرچ ہو سکتا ہے لیکن یہی خطیر رقم ہمارے سپاہی کی مہینے بھر کی کمائی ہوتی ہے۔ اور اس کی خاطر وہ جان ہتھیلی پر لئے مارا مارا پھرتا ہے اور جب کبھی آپ پر نازک وقت آتا ہے۔ یہی سپاہی آپ کی حفاظت پر کمربستہ ہو جاتا ہے اور اپنا فراخ سینہ گولیوں کی باڑھ کے سامنے ڈھال بنا کر پیش کرتا ہے۔"

اُس دن مس ہارون نے بڑے تعجب کا اظہار کیا تھا۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ میں سابق سپاہی ہوں۔ اس کا طنز میرے دل کی گہرائیوں میں اُتر گیا تھا لیکن میں آپ کو بتاؤں مس مخدوم! مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں نے فوج میں اٹھارہ سال گذارے ہیں۔ ان اٹھارہ سالوں ہی میں میں پیتل سے فولاد میں ڈھلا ہوں۔ اب زمانے کی گرم سرد ہوا میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ اور وہ لوگ جو سپاہیوں کو بیوقوف سمجھتے ہیں یا انہیں حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ میری نگاہ میں انتہائی ذلیل قسم کے لوگ ہیں۔ وہ سپاہیوں کی قدر تب پہچانیں گے۔ جب ان کی آزادی، ان کا ناموس اور ان کا مال و متاع خطرے میں پڑے گا۔ دشمن جب کسی ملک یا کسی شہر پر قبضہ کرتا ہے۔ تو وہ یہ نہیں دیکھتا کہ کوئی نوخیز کلی ہے، جوان عورت ہے کسی کی بہن

ہے۔پالیسی کی ماں ہے۔ دشمن اسے جانور کی طرح جھنجھوڑتا ہے اور دم تب لیتا ہے جب اس کا شکار آدھ مُوا ہو جاتا ہے یا دم توڑ دیتا ہے خدا وہ دن نہ لائے جب ہم پر بھی کوئی ایسی مصیبت نازل ہو جائے۔ لیکن کم از کم ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنے ضمیر کا محاسبہ کریں اور ہر انسان کو اس کے جائز حقوق اور مرتبہ دیں۔ کوئی بھی کام یا کوئی بھی پیشہ بذات خود بُرا نہیں ہوتا یہ تمیز ہمارے فرسودہ معاشرے کی پیداوار ہے۔ اسی لئے میں معاشرہ کی از سرِ نو تنظیم کا خواہاں ہوں۔ ممکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ ہم اپنے مذہب سے بیگانہ ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اگر ہم اپنے مذہب کی جڑ دل میں اُتر جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنے معاشرے کی یہ چھوٹی چھوٹی خامیاں دور نہ کر سکیں۔ کیا ہمارے مذہب کی بنیادیں رکھنے والے ہی جاں نثار مجاہد اور سپاہی نہ تھے؟۔ وہ کون تھے؟۔ ایسے ہی تارک الدنیا سپاہی۔ جنہوں نے اپنے آپ کو مذہب کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ اور آج انہی کی بدولت دنیا کا بیشتر حصہ ہمارے ہی مذہب کا پیروکار ہے۔ لیکن خیر — مذہب کی باتیں چھوڑیئے!۔ جب کبھی مذہب کا ذکر چھڑتا ہے ہم میں سے اکثر ناک بھوں چڑھانے لگتے ہیں۔"

"قطع کلامی معاف مسٹر موسٰی!۔ آپ کی باتیں بڑی دلچسپ اور معلوماتی ہیں۔ میں آپ کے خیالات کی قدر کرتی ہوں۔ لیکن یہ بھی تو سوچیئے ہمیں یہاں بیٹھے بیٹھے ایک گھنٹہ سے زیادہ گذر چکا ہے اور دفتر میں بہت سے کام ہیں جو ادھورے پڑے ہمارے منتظر ہیں۔"

مس مخدوم نے پرس کھول کر بل ادا کرنے کے لئے نوٹ نکالتے کہا۔

"یہ نہیں ہو سکتا مس مخدوم!" موسئی نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتے اصرار کیا۔ "یہ بل میں ادا کروں گا۔"

لیکن اسی اثناء میں بیرا مس مخدوم کا نوٹ پلیٹ سمیت اٹھا کر چلا چکا تھا۔

"پھر سہی مسٹر موسئی!" مس مخدوم مسکرائی "ایک ہی دفتر میں تو کام کرتے ہیں یہ موقع آپ کو ضرور دیا جائے گا۔"

بیرا بقایا ریزگاری لے آیا اور مس مخدوم چار آنے بطور ٹپ چھوڑ کر باقیماندہ ریزگاری لے کر کرسی سے اٹھیں اور کنٹین سے باہر نکلیں موسئی بھی سر جھکائے اس کے پیچھے پیچھے باہر آگیا۔ اور پھر وہ دونوں کالج کی سمت بڑھے۔

"آپ کہاں چلے گئے تھے مسٹر موسئی؟"

ابھی موسئی اپنے کمرے میں بیٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ مس ہارون آن وارد ہوئیں۔ اور موسئی کو آنکھیں دکھلانے لگیں۔ "میں نے آپ سے کہا نہ تھا کہ میرا کام اشد ضروری ہے کم از کم مجھے بتا کر جاتے میں ٹائیپ کا کام کسی اور کو سونپ دیتی۔"

"مس ہارون!۔ میں آپ کا کام مکمل کر کے گیا تھا۔ اور پھر جس کام کے لئے میں دفتر سے باہر گیا تھا۔ وہ بھی کوئی غیر سرکاری نہیں تھا۔ مجھے مس مخدوم اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔ ناظم صاحب نے غیر آباد پناہ گزینوں والی مثل طلب کی تھی۔

موسیٰ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

دیکھنے میں کتنی بھولی اور معصوم لگتی ہے جیسے اللہ میاں کی گائے ہو۔ لوگ جو اس کے متعلق طرح طرح کی افواہیں پھیلاتے ہیں آخر ان میں تھوڑی بہت سچائی تو ضرور ہو گی۔ موسیٰ کھڑے کھڑے مس ہارون کے متعلق سوچتا رہا۔

"خیر! کوئی بات نہیں۔ آئندہ خیال رکھیں" مس ہارون آپ ہی آپ مَن گئیں۔ اور اس کے ماتھے کی ہلکی ہلکی شکنیں بھی صاف ہو گئیں۔ اب وہ بشاشت سے چہکنے لگیں۔

"جب میں مس امتیاز کے ساتھ چائے پی کر آئی تو دیکھا آپ غائب ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا مس مخدوم آپ کو اغوا کر کے لے گئی ہیں۔ تو آپ نے مس مخدوم کے ساتھ سیر کر لی؟ وہ تو بڑی باتونی لڑکی ہے۔ راستے میں آپ کا دماغ خوب چاٹا ہو گا۔

اچھا یہ تو بتائیے۔ مس مخدوم سے کیا کیا باتیں ہوئیں؟ ایک نمبر کی کائیاں ہے وہ اگر امریکہ نہ جاتی تو اس کا دماغ کبھی اتنا خراب نہ ہوتا۔ اب وہ نہ تو تیتر ہے اور نہ بٹیر۔ واشنگٹن میں ابراہیم لنکن کا مجسمہ کیا دیکھ کر آئی ہے اپنا دماغی توازن ہی کھو بیٹھی ہے۔ میں جانتی ہوں آپ اس کے متعلق کچھ نہ بتائیں گے۔ جادوگرنی ہے جادوگرنی۔ کچھ معلوم ہوا جلسہ کب ختم ہو رہا ہے؟ اور ناظم صاحب کب تشریف لا رہے ہیں؟"

"جی نہیں" موسیٰ نے کرسی پر بیٹھتے مردہ دلی سے جواب دیا۔ اس کی

توجہ بٹ گئی تھی۔ اب وہ دلجمعی سے کام نہیں کر سکتا تھا۔ کبھی ایک کاغذ اٹھا کر پڑھتا اور کبھی دوسرا پھر اس کی کنپٹی کی رگیں پھڑکنے لگیں اور دماغ کھولنے لگا۔

"وہی جلن، وہی حسد، وہی رقابت! ایک عورت، دوسری عورت سے بالکل مختلف نہیں۔ دونوں کے خیالات یکساں ہیں۔ دونوں ایک ہی نہج پر سوچتی۔ اور ایک دوسری کے خلاف زہر اگلنے پر کمربستہ ہیں۔ عفو درگذر تو انہوں نے سیکھا ہی نہیں۔ قرونِ وسطیٰ سے لے کر آج کے دور تک عورت نے صرف اتنا کیا ہے کہ اپنے جسم کی زیبائش و آرائش میں نئے نئے ڈھنگ اور طریقے ایجاد کر لئے ہیں ورنہ ان کی روحیں آج بھی ویسی ہی ننگی ہیں۔ نام نہاد تہذیب کا ایک خول ہے جو انہوں نے اپنے اوپر چڑھا رکھا ہے۔ عورت ایک گندہ اخروٹ ہے جس کا صرف چھلکا ہی دیدہ زیب دکھائی دیتا ہے ورنہ اندر کا گودا گل سڑ چکا ہے اس گندے اخروٹ کا چھلکا اتار دیا جائے تو گودے سے کراہت اور متلی محسوس ہونے لگے گی۔"

اچانک مس ہارون کی طرف دیکھ کر موسیٰ کو یوں لگا جیسے وہ اس کے سامنے ننگی کھڑی ہو۔ یہ جدید لباس کی تراش خراش۔ اُف!۔ ماہرِ نفسیات کا وہ قول کس قدر سچائی پر مبنی ہے جب وہ کہتا ہے کہ زمانہ قدیم میں عورتیں اپنے جسم کے ہر ہر عضو کو طرح طرح کے نقش و نگار سے مزین رکھتی تھیں تاکہ مردوں کو اپنی جانب راغب کر سکیں۔ سوچا جائے تو لاشعوری

طور پر آج بھی جدید عورت میں یہی جذبہ کارفرما ہے محض ڈھنگ اور طریقہ بدل گیا ہے۔ عورت چاہتی ہے کہ ہمیشہ مرد کی توجہ کا دائرہ اسی کے گرد گھومتا رہے مس ہارون نے جب محسوس کیا کہ موسیٰ بے توجہی سے اپنے کام میں مصروف ہو گیا ہے۔ وہ اونچے ایڑی کے جوتے چٹخاتی باہر نکل گئی اور اس کا احساس موسیٰ کو جب ہوا۔ جب مس ہارون جا چکی تھی۔

"کہیں ناراض نہ ہو گئی ہو" موسیٰ کے دل میں ایک موہوم وسوسے نے سر اٹھایا۔ "وہ ہوتی رہے" اس کے دل نے آپ ہی آپ اپنے اگلے خدشے کا جواب بھی دے دیا۔ سورج کب کا غروب ہو چکا تھا۔ اور شام دبے پاؤں موسیٰ کے کمرے میں داخل ہو کر اسے ورغلا رہی تھی۔ کاغذ پر ٹائپ کے حروف ایک کے دو دکھائی دینے لگے تو موسیٰ نے محسوس کیا۔ اس کی نظر کمزور پڑ گئی ہے۔ وہ بار بار آنکھیں جھپکاتا اور ٹائپ کرتا چلا جاتا۔ اچانک اسے بتی کا خیال آگیا۔ بتی جلا کر اس نے اطمینان کا سانس لیا کہ یہ دھندلاہٹ اس کی کمزوری کی دلیل نہیں تھی بلکہ اندھیرا واقعی پھیل رہا تھا۔ اب وہ ایک نئے عزم کے ساتھ ٹائپ کی مشین پر جھک گیا اور مشین کے حروف تڑاتڑ پٹاخے چھوڑنے لگے۔

"آپ گئے نہیں مسٹر موسیٰ؟" مس امتیاز نے اچانک اس کے دفتر کا دروازہ کھول لیا۔ اور موسیٰ اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ لڑکی اب تک یہاں کیا کر رہی تھی؟۔ موسیٰ اس کے متعلق سوچنے لگا۔

"آپ کے کمرے میں روشنی دیکھ کر چلی آئی۔ ورنہ میں سیدھے

گھر جا رہی تھی"مس امتیاز کرسی پر بیٹھتے گویا ہوئیں۔

"جنگل کی اس سحر کن جھنکار سے جی نہیں بھرتا۔ چاہتی ہوں یونہی چپ چاپ کھڑی پہروں پرندوں کی چیں چیں کی آوازیں سنتی رہوں اور پھر مجھے نیند آجائے۔ لیکن جوں جوں اندھیرا پھیلتا چلا جاتا ہے، پرندے بھی جیسے سہم جاتے ہیں اور مارے خوف کے چہچہانا بند کر دیتے ہیں اچانک پورے جنگل پر اتنی گمبھیر خاموشی اور سکوت طاری ہو جاتا ہے کہ مجھے خود اپنے آپ سے ڈر لگنے لگتا ہے۔ پھر میں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتی ہوں اور بار بار پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتی ہوں کہ کہیں خاموشی کا عفریت میرا تعاقب تو نہیں کر رہا۔ آج بھی اسی خوف سے بھاگی جا رہی تھی کہ آپ کے کمرے میں روشنی دیکھ کر میری جان میں جان آئی۔ آپ چھٹی نہیں کریں گے موسیٰ صاحب؟"

"بس میں جا ہی رہا تھا مس امتیاز!۔ کام قریب قریب ختم ہو چکا ہے" موسیٰ نے آخری صفحہ ادھورا چھوڑا اور کاغذات سمیٹنے لگا۔

"جنگلوں اور بیابانوں کی یہ تنہائی اور سناٹا مجھے بھی اچھا لگتا ہے۔ مس امتیاز! لیکن آج کل کام دھندے سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ کبھی وہ دن تھے کہ میں چاندنی راتوں میں اپنے گاؤں سے باہر لہلہاتے کھیتوں میں نکل جایا کرتا تھا اور گھومتا پھرتا قبرستان تک چلا جاتا تھا۔ ایسی ہی ایک رات چاندنی خوب چٹکی ہوئی تھی میں قبرستان پہنچا اور ایک سنگ مرمر کی سفید دودھیا قبر کے سرہانے بیٹھ کر چاندنی کی عجیب و غریب مہک سے لطف اندوز ہونے لگا۔ اچانک میرے پاؤں کے نیچے سے ایک پتھر لڑھک گیا اور کھلی

زمین میں دھنس گیا۔ میں نے چونک کر دیکھا تو مجھے احساس ہوا کہ بے خبری میں میں نے کسی معصوم بچے کی کچی قبر پر پاؤں رکھا ہوا تھا۔ میں بڑا متاسف ہوا اور ہاتھ بڑھا کر زمین میں دھنسا ہوا پتھر نکالنے لگا۔ پتھر اٹھا کر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک معصوم مردہ بچے کے سر سے خون بہہ رہا ہے۔ کیا آپ یقین کریں گی مس امتیاز!۔ کہ مردہ بچے کے سر سے خون بہہ سکتا ہے؟۔ لیکن میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے مردہ بچے کے ماتھے سے خون ٹپکتے دیکھا۔ شاید وہ بچہ اسی روز دفنایا گیا تھا اور کیا معلوم وہ بے ہوش ہو گیا ہو اور اس کے لواحقین نے اسے مردہ سمجھ کر دفنا دیا ہو۔"

"ہائے ہائے!۔ موسیٰ صاحب!۔ آپ نے تو مجھے اور بھی ڈرا دیا۔ ایسی باتیں نہ کریں۔ مجھ پر کپکپی طاری ہو گئی ہے۔ توبہ!۔ توبہ!!۔ اب تو آپ میرے ساتھ گھر تک چلیں گے۔ میری کار پارک میں کھڑی ہے۔ مجھے گھر پہنچا کر آپ کوئی بس پکڑ لیجیئے گا۔ بسیں رات گئے تک چلتی رہتی ہیں۔" مس امتیاز کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا اور مارے خوف کے وہ تھر تھر کانپ رہی تھیں۔

"واہ۔ عجیب لڑکی ہے ایک طرف تو پہروں کھڑی جنگل کے ہیبت ناک سناٹے میں چڑیوں کی چہکار سے محظوظ ہوتی رہتی ہے اور دوسری طرف ایک معمولی واقعے سے اس پر کپکپی طاری ہو گئی ہے!"

مس امتیاز کے ساتھ کار پر بیٹھ کر موسیٰ سوچنے لگا۔ سڑک پر روشنی اور اکا دکا راہگیروں کو دیکھ کر مس امتیاز خواہ مخواہ ہنسنے لگیں۔ "میں تو مذاق کر رہی تھی موسیٰ صاحب!!"

مس امتیاز نے ایک قہقہہ لگایا "آپ کا بہت بہت شکریہ!۔ اب آپ بنک یہیں اتر جائیں۔ اور وہ دیکھئے۔ سامنے بس آرہی ہے۔ یہ بس آپ کو سیدھے ریلوے سٹیشن لے جائیگی۔ اچھا۔ شب بخیر!"

موسیٰ نے اسے حیران نظروں سے دیکھا اور پھر کار سے اتر کر سڑک پر بھاگنے لگا تاکہ بس کو سٹاپ پر پکڑ سکے۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا، مس امتیاز کی کار زناٹے بھرتی موڑ پر مڑ رہی تھی۔

رات گئے موسیٰ جہانگیر آباد پہنچا اور اپنے مکان میں داخل ہو کر اپنے پیچھے کنڈی چڑھالی۔ بخت جمال کے کمرے سے روشنی کی ہلکی سی لکیر برآمدے کو دو حصوں میں تقسیم کر رہی تھی۔ جس سے موسیٰ نے اندازہ لگایا کہ اس کا دوست ابھی تک جاگ رہا ہے۔ موسیٰ نے دروازے کو ہاتھ لگایا تو وہ آپ ہی آپ کھل گیا۔

"تم ابھی تک سوئے نہیں بخت جمال؟" موسیٰ نے اپنے دوست کے کمرے میں جھانک کر سوال کیا۔

"ہاں۔ مجھے نیند نہیں آرہی۔" بخت جمال چادر لپیٹے کسمسایا اور پھر اٹھ بیٹھا۔

"تم کہو۔ اتنی رات گئے کہاں سے آرہے ہو؟ کیا دفتر کی حسیناؤں سے جی نہیں بھرتا یا بسوں میں سفر کرتے دل بہلاتے رہے ہو؟؟۔ یار! میں تو آج دن بھر ملول رہا۔ ڈاکٹر نے آج مجھے بتایا کہ مجھ پر یرقان کا حملہ ہو رہا ہے۔ میری آنکھوں اور چہرے کی زردی مجھے موت کے بھیانک غار کی طرف دھکیل رہی ہے،

اور میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔ ابھی تو میں بھرپور قسم کا ایک اور عشق کرنا چاہتا ہوں ہمارے مالکِ مکان کی چھوٹی صاحبزادی بڑی الھڑ اور نوخیز ہے۔ شروع شروع میں اس کی مجھ پر خاص نظرِ کرم تھی۔ کبھی اوپر کی منزل سے پانی پھینکتی، کبھی ملٹے کے چھلکے اور کبھی کوڑا کرکٹ۔ ظاہر ہے مجھ پر ریجھ گئی تھی اور میں اس کی ان حرکات کو اپنی توہین سمجھ بیٹھا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ وہ مجھ سے کچھ کھچی کھچی رہنے لگی۔ اور جانتے ہو آج کیا ہوا؟ آج اس کی ماں نے مجھے بلایا تھا۔ اور یہ مژدہ سنایا کہ اس کی چھوٹی صاحبزادی کی شادی ہو رہی ہے۔ اور ہم دونوں کو شادی کے انتظامات میں ان کا ہاتھ بٹانا ہے۔ لیکن میں تو مر رہا ہوں یار! ابھی لیٹے لیٹے یہی سوچ رہا تھا کہ اپنی موت پر خود ہی ایک مرثیہ لکھ ڈالوں۔ جانے مرنے کے بعد کوئی مجھے یاد بھی کرے یا نہ کرے!"

"اچھا بخت جمال! اب لیٹ جاؤ۔ آرام کرو۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔" موسیٰ نے دروازے کی طرف بڑھتے کہا۔ "اور یہ وہم دل سے نکال دو کہ تم بیمار ہو۔ اول تو تمہیں یرقان نہیں اور اگر ہے بھی تو اس کا علاج موجود ہے۔ کل ہم کسی ماہر ڈاکٹر سے مشورہ لیں گے۔ تب تک کے لئے بے فکر سو جاؤ۔ شب بخیر!"

موسیٰ نے کمرے سے نکل کر اپنے پیچھے دروازہ بھیڑ لیا۔ اور پھر اپنے کمرے میں آکر بتی جلائی، کپڑے تبدیل کئے اور لیٹ گیا۔ دن بھر کے واقعات و مصروفیتیں ایک ایک کر کے اس کے ذہن کے پردے پر دوڑنے لگیں۔ ہر دوسرے تیسرے لمحے میں مس ہارون کی تصویر اُبھرتی اور اس کے ذہن

کو چولہا جو نکا دیتی۔ پریشان ہو کر اس نے ایک جست بھری اور اٹھ کر بتی بجھا دی۔ پھر وہ ٹٹولتا ٹٹولتا اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتا پلنگ تک آیا اور چادر دو شانے چت لیٹ گیا۔

دسمبر خاموشی سے آیا اور دبے پاؤں گزرنے لگا۔ موسیٰ کی محنت ٹھکانے لگ گئی تھی۔ ناظم کے علاوہ دفتر کا دیگر عملہ بھی اس کی کارگزاری اور انتھک محنت کو سراہنے لگا۔ اب ناظم اور مس ہارون اہم فیصلوں میں اس کی رائے کو خاص اہمیت دینے لگے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ شعبے کا نوجوان طبقہ موسیٰ کی سلجھی ہوئی طبیعت، رکھ رکھاؤ اور عادات و اطوار اور سخاوت کی بدولت اُسے پسند کرنے لگا تھا۔ موسیٰ کے ذہن میں یہ بات سما چکی تھی۔ کہ جب تک اپنے پلّے سے کچھ خرچ نہ کیا جائے کسی کا دل جیتنا آسان نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ کینٹین کے بلوں کی ادائیگی میں ہمیشہ پیش پیش رہتا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کا اندازِ تکلم پُراثر اور الفاظ کی ادائیگی میں ایک جدت تھی۔ اس کی گمبھیر آواز میں سحر کھو جاتا۔ کوئی بھی موضوع ہوتا وہ اُسے افسانوی رنگ میں بیان کرتا۔ رفتہ رفتہ وہ عملے میں مقبول ہوتا گیا۔ وہ بے تکلفی سے لڑکیوں کی محفلوں میں شرکت کرتا اور بحث مباحثوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا۔ اپنے تجربات کا نچوڑ دل اس انداز سے پیش کرتا کہ لڑکیاں ٹکر ٹکر اس کا منہ دیکھتی رہ جاتیں۔ وہ ہمیشہ ایسا موضوع چھیڑتا جو ان لڑکیوں کے لئے بالکل نیا اور انوکھا تجربہ ثابت ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ لڑکیاں یہ اعلیٰ تعلیمیافتہ لڑکیاں، اس کی دلیلوں کو بے کم و کاست مان لیتیں اور پھر انہیں بطور سند دوسروں کے سامنے پیش کرتیں۔!

دسمبر کے آخری دنوں میں جب عیسائی کرسمس کی تیاریوں میں مصروف تھے ایک صبح موسیٰ اپنے ساتھ دو خوبصورت مناظر کے فریم لے آیا۔ اور مس برکت مسیح کو کرسمس کا تحفہ پیش کیا۔ یہ مناظر موسیٰ کو گلگت کی سیاحت کے دوران دستیاب ہوئے تھے۔ تصویریں اتنی بے نظیر اور دلکش تھیں کہ مس برکت کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں فرطِ حیرت و مسرت سے چمک اٹھیں۔ اور وہ اپنے پتلے پتلے سانولے ہونٹوں کو دانتوں سے کاٹنے لگی۔ اس کے قریب کھڑی مس شہلا اپنے گھنیرے بالوں کو کھجلانے لگی۔

"ہائے کتنا خوبصورت منظر ہے" ایک فریم اپنے ہاتھوں میں لیکر مس شہلا عش عش کر اٹھی۔ پھر اس نے للچائی نگاہوں سے مس برکت کی جانب دیکھا

"ہائے!۔ یہ تو میرے ڈرائنگ روم کے لئے بے حد موزوں ہیں۔۔ موسیٰ صاحب!۔ ایک عدد جوڑا میرے لئے بھی ہو جائے!" مس شہلا منظر میں کھوئی کھوئی گویا ہوئی۔

"ہونہہ!۔ تمہارے لئے بھی ہو جائے!" مس برکت مسیح نے شہلا پر طنز کیا۔ مجھے تو کرسمس کا تحفہ ملا ہے۔ تمہاری عید آجائے تو تمہیں بھی کوئی نہ کوئی تحفہ مل ہی جائے گا۔ کیوں موسیٰ صاحب؟"

"لیکن ہماری عید تو ابھی دور ہے۔ اتنا انتظار کون کرے۔ موسیٰ صاحب! دو فریم میرے لئے بھی بنوا دیجئے نا" مس شہلا نے موسیٰ سے التجا کی "قسم لے لو جو ہمارے ڈرائینگ روم میں ایک بھی تصویر موجود ہو"

موسیٰ نے مس شہلا کی طرف دیکھا اور مسکرا کر ہامی بھرلی۔ شعبے بھر میں

ہوسٹی کے اس اقدام کا اتنا چرچا ہوا کہ جب دوپہر کے وقت وہ کسی کام کے سلسلے میں مس ہارڈن کے کمرے میں داخل ہوا تو سب سے پہلا سوال جو اس نے کیا انہی فریموں کے متعلق تھا۔

"گلگت کی سیاحت کے دوران میں اپنے ساتھ کیمرہ بھی لے گیا تھا۔ یہ مناظر میں نے اپنے کیمرے سے اتارے ہیں" ہوسٹی نے مس ہارڈن کے سوال کا جواب دیا۔

"اچھا تحفہ ہے" مس ہارڈن نے اُسے کنکھیوں سے دیکھتے اور میز کے کاغذات کو الٹتے پلٹتے ہوئے کہا پھر وہ آپ ہی آپ مسکرا دی۔

"لیکن اس کے لئے آپ نے مس برکت کا ہی انتخاب کیوں کیا۔ اس دفتر میں نو اور بھی بے شمار لڑکیاں کام کر رہی ہیں"

"انتخاب!۔ آپ نے مجھے غلط سمجھا مس ہارڈن!۔ میں نے کسی قسم کا انتخاب نہیں کیا۔ یہ محض اتفاق ہے" ہوسٹی نے اس کی چوٹ پہ جھنجھلاتے ہوئے جواب دیا۔

"اب اگر میں آپ کو ایک بات بتا دوں تو شائد آپ یقین نہ کریں۔ لیکن یہ حقیقت ہے مس ہارڈن!۔ میں نے مس برکت کے ایک احسان کا بدلہ چکایا ہے۔ اس ادارے کی ملازمت کے پہلے ہی روز جب میں جامعہ کی بس میں بیٹھا تو میرے پاس ٹکٹ موجود نہیں تھا۔ اور میرا خیال تھا کہ میں قیمت دے کر بس کا ٹکٹ خرید لوں گا۔ لیکن کنڈکٹر کے بجائے بس کے ٹکٹ صدر دفتر میں ملتے تھے جس کا علم مجھے بعد میں

ہُوا۔ تو اس روز بس کنڈیکٹر مجھے بس سے اتارنے لگا تھا۔ عین موقع پر مس برکت نے اپنا ایک فالتو ٹکٹ پیش کر کے مجھے بے عزتی سے بچا یا۔ مرتے دم تک میں اس کا یہ احسان نہیں بھولوں گا۔ مجھ میں یہی تو سب سے بڑی خامی ہے کہ میں طوطا چشم نہیں۔ کبھی کسی کا احسان بھولتا نہیں۔ اور اپنے آپ پر کسی کا دھیلے کا خرچ بھی یاد رکھتا ہوں۔ اور نہ بدلہ چکانے کی تلاش میں رہتا ہوں۔ اب اگر آپ مجھ سے پوچھیں تو میں آپ کو بتاؤں کہ آپ نے مجھے آج تک پندرہ دفعہ چائے پلائی ہے۔ اور میں نے آپ کو صرف بارہ مرتبہ۔ اس لحاظ سے میں اب بھی آپ کا مقروض ہوں۔ اگر آپ بُرا نہ مانیں تو اجازت دیں اسی وقت آپ کے کمرے میں چائے منگوائی جائے کچھ تو میرا بار ہلکا ہو!"

مس ہارون موسیٰ کے اس انکشاف سے بھونچکا رہ گئی اور اسے ٹکر ٹکر دیکھنے لگی۔

"آپ تو بڑے خطرناک ہیں!" مس ہارون مسکرائی۔ "یہ عادت ایک دن آپ کو لے ڈوبے گی۔"

"کوئی بات نہیں مس ہارون!۔ یہ عادت مجھے بہت پیاری ہے کہ یہ مجھے ورثہ میں ملی ہے۔ جہاں تک ممکن ہو سکے گا۔ میں اس کی بجا آوری میں کوتاہی نہیں کروں گا۔ کیا آپ نے میری صورت سے اندازہ نہیں لگایا کہ میری رگوں میں عرب خون دوڑ رہا ہے؟" موسیٰ ابھی کچھ اور بھی کہتا اگر جبّار اسی اچانک دروازہ کھول کر کمرے میں نہ آجاتا۔

موسیٰ نے چپڑاسی کے باہر چلے جانے کا انتظار کیا۔ اس نے میز پر سے شیشے والا گول پتھر اٹھایا اور اسے میز پر چکر دینے لگا۔

چپڑاسی مس ہارون کے لئے کنٹین سے کھانا لایا تھا۔ اس نے ٹرے ایک تپائی پر رکھی اور پھر پانی لینے کے لئے باہر نکل گیا۔

"اچھا تو آپ کھانا کھائیے مس ہارون! میں بعد میں آجاؤں گا۔ لائبریری کے کاغذات اور بلوں کے متعلق مجھے بے حد تشویش ہے۔ مجھے ڈر ہے کہیں ایک ایک بل کی دو دو دفعہ ادائیگی نہ ہوگئی ہو۔ آپ جب کھانے سے فارغ ہو جائیں تو مجھے بلا لیجئے گا۔" موسیٰ نے کرسی سے اٹھ کر دروازے کی طرف قدم بڑھاتے کہا۔

"کہاں چلے موسیٰ صاحب! — بیٹھئے نا۔ میں آپ کی موجودگی میں بھی کھانا کھا سکتی ہوں۔ ایک تو آپ جب بھی آتے ہیں لائبریری کی کتابوں کے متعلق ہی باتیں کرتے ہیں۔ ہاں تو آپ کیا کہہ رہے تھے میں نے آپ کو کتنی مرتبہ چائے پلائی ہے؟ — پندرہ دفعہ؟ یہی بتایا تھا نا آپ نے؟ — اچھا۔ تو جب تک میں کھانے سے فارغ ہوتی ہوں آپ سولھویں بار بھی میری گرہ سے چائے پیئیں اور پھر اس کا حساب آپ خود ہی رکھیں۔ تحقیقاتی کام کرتے کرتے میرا حافظہ کچھ کمزور ہو گیا ہے۔ آج تو آپ نے عجیب انکشاف کیا ہے۔ مس امتیاز آئیں تو انہیں بھی آپ کے اس عجیب حساب کتاب کے بارے میں بتاؤں گی۔ ویسے مس امتیاز نے آپ کو کتنی مرتبہ چائے پلائی ہوگی پورے عملے کا حساب آپ کیسے رکھ لیتے ہیں۔ یہ تو بڑا مشکل کام ہے۔"

موسیٰ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ دروازے کے شیشوں سے باہر جھانکتا اپنی خفت مٹانے لگا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آتا اور دوسرا جاتا۔ وہ مس ہارون کی طرف دیکھنے کی جرأت نہ کر سکا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ باہر بھی نہیں نکل سکتا تھا کہ مس ہارون نے اسے مزید کچھ دیر بیٹھنے کو کہا تھا۔

"کب تک کھڑے رہیں گا موسیٰ صاحب!۔ بیٹھیے نا۔ اور پھر سوچتے رہیے کہ آپ یہ بے شمار ساتھیوں کا قرض کیسے چکائیں گے" مس ہارون نے کھانا کھاتے کھاتے نگاہ اوپر اٹھائی اور موسیٰ پر چوٹ کی۔ موسیٰ نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اور احتجاجاً خاموش کرسی پر بیٹھ گیا۔

"میں تو سمجھتی ہوں موسیٰ صاحب! یہ سب کنجوسی کی دلیل ہے۔ سخی لوگ کبھی یہ چھوٹا موٹا حساب یاد نہیں رکھا کرتے۔ اب معلوم ہوا ایک میں ہی نہیں آپ مجھ سے بھی زیادہ کنجوس ہیں" مس ہارون ہنسی دبائے اس پر چوٹ کرتی رہی۔ اور ساتھ ہی ساتھ چھوٹے چھوٹے لقمے اپنی مخروطی انگلیوں سے منہ میں ڈال نگلتی گئی۔ موسیٰ نے اس کی طرف خشمگیں نگاہوں سے دیکھا اور پھر سر جھکا کر میز پر انگلی سے بے مقصد لکیریں کھینچنے لگا۔

"آپ نے میری باتوں کا برا تو نہیں مانا؟" مس ہارون نے آخری نوالے نگلتے، کھانے سے ہاتھ کھینچتے مسکرا کر موسیٰ کو مخاطب کیا۔ "اور اس چپڑاسی کو دیکھو۔ میں کھا بھی چکی اور یہ حضرت اب تک پانی نہیں لائے" مس ہارون دروازے کی طرف بڑھتے جیسے اپنے آپ سے مخاطب ہوئیں۔ پھر انہوں نے دروازہ کھولا اور باہر جھانک کر چپڑاسی کو آوازیں دینے لگیں۔

تھوڑی دیر بعد وہ اندر آئیں اور اپنی کرسی پر بیٹھ کر رومال سے داہنے ہاتھ صاف کرتے موسیٰ کو کچھ عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگیں۔ جیسے وہ کچھ یاد کر رہی ہوں اور یاد نہ آ رہا ہو۔

"میری ایک سہیلی ہے۔ یہاں شعبۂ نباتات میں تحقیقی کام پر مامور ہے کئی دنوں سے میرے پیچھے پڑی ہے کہ آپ سے اس کی سفارش کر دوں اسے اپنی قسمت کا حال جاننے کا بڑا شوق ہے۔ اور کسی نے اسے بتایا ہے کہ آپ علمِ دست شناسی کے ماہر ہیں۔ چھٹی کے وقت سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگیں نہیں۔ آپ کو میری سہیلی کا ہاتھ دیکھنا ہے۔ میرے بس میں ہوتا تو اپنی سہیلی کو بتاتی کہ علم دست شناسی محض ایک ڈھونگ ہے اور ہمارے موسیٰ صاحب تو اس علم میں بالکل کورے ہیں (یہاں مس ہارون کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی اور ساتھ ہی ساتھ اس نے اپنی آنکھوں کو قدرے سکیڑا بھی)

لیکن وہ میری باتوں پر کان ہی نہیں دھرتی۔ اور مصر ہے کہ وہ آپ کو اپنا ہاتھ دکھا کر رہیگی۔ ویسے میں اب بھی کہتی ہوں۔ کہ آپ یہ ہاتھ دیکھنے کا دھندا چھوڑ دیں۔ خصوصاً عورتوں کے ہاتھ تو آپ کو کبھی نہیں دیکھنے چاہئیں"

موسیٰ نے اس کی طرف گھور کر دیکھا اور پھر اچھا جا اٹھ کر کہنے لگا۔

"درست فرمایا آپ نے! میں آپ سے کُلی طور پر اتفاق کرتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی کسی عورت کا ہاتھ نہیں دیکھوں گا"

"یہ تو میں پہلے ہی جانتی تھی آپ اپنی ذات پر تنقید برداشت ہی نہیں

کہ سکتے۔ بندۂ خدا! آج تو آپ کو میری سہیلی کا ہاتھ دیکھنا ہی پڑے گا۔ میں ان سے وعدہ کر چکی ہوں۔ کل سے آپ بے شک لڑکیوں کا ہاتھ نہ دیکھا کریں۔" مس ہارون ہنسنے لگیں اور موسیٰ اس کے جسم کے دلفریب ہچکولوں میں کھو گیا۔

"اب میں جاؤں؟" موسیٰ نے نظریں چراتے اجازت طلب کی۔

"اچھا تو ہو بیٹے گا نہیں۔ چھٹی کے وقت سیدھے میرے دفتر آجائیے گا۔"

تین بج کر پندرہ منٹ پر مس ہارون موسیٰ کے کمرے میں داخل ہوئیں۔

"موسیٰ صاحب! میری سہیلی آگئی ہیں۔ ذرا شرماتی ہیں مگر ہیں پرلے درجے کی بے وقوف آپ جو کچھ الٹے سیدھے حالات اس کی زندگی کے متعلق بتائیں گے۔ وہ صدق دل سے ان پر ایمان لے آئیں گی۔ ہم چار سال ایک ساتھ کالج میں پڑھتی رہی ہیں۔ میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔ سیدھی سادی لڑکی ہے بس ذرا ذہنی طبیعت پائی ہے۔ آپ میرے ساتھ آئیں تاکہ میں آپ کا تعارف کرا دوں۔ پھر میں کلاس میں لینے چلی جاؤں گی۔ اب بھی پندرہ منٹ لیٹ ہوں۔"

اس تمہید کے بعد مس ہارون مسکراتی باہر نکل گئیں۔ موسیٰ نے بادل ناخواستہ اپنا دفتر بند کیا اور مس ہارون کے دفتر کی طرف چل پڑا۔ وہ سوچنے لگا۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مس ہارون بھی عجیب عورت ہے ایک جانب تو خود علم دست شناسی پر اعتقاد نہیں رکھتیں اور دوسری جانب وہ اُسے اپنی سہیلیوں کا ہاتھ دیکھنے پر مجبور کرتی ہیں۔

مس ہارون کی سہیلی بے حد حسین تھی۔ چھریرا بدن، غلافی آنکھیں، پتلے پتلے شہد آگیں ہونٹ سرخ گال اور چہرہ وہ بار بار شرم وحجاب سے لچک

لچک جاتیں۔ جیسے بید مجنوں کی شاخ ہو جو ہوا کے ہلکے سے تھپیڑے کی تاب بھی نہ لا سکتی ہو۔ اس نے محض ایک مرتبہ نگاہ اٹھا کر موسیٰ کی طرف دیکھا سلام کیا اور پھر جب تک وہ وہاں بیٹھی رہیں، اس نے اپنی غلافی آنکھوں کو جنبش نہ دی۔

"دراصل آپ کو کسی نے غلط اطلاع دی ہے۔ کہ میں علم دست شناسی کا ماہر ہوں۔ مس ہارون جانتی ہیں کہ میرا علم ناقص ہے اور پھر مس ہارون تو مجھ سے زیادہ جانتی ہیں۔ بہتر ہوتا اگر آپ اپنا ہاتھ میرے بجائے مس ہارون کو دکھاتیں۔"

موسیٰ نے مہمان خاتون کو مخاطب کیا اور پھر مس ہارون کی طرف دیکھنے لگا جیسے اپنی بات کی تصدیق چاہتا ہو!

بس اب بنیئے نہیں موسیٰ صاحب! میری سہیلی آپ کی تعریف ہی سن کر تو آئی ہے ورنہ نجومی تو گلی گلی گھومتے پھرتے ہیں،" مس ہارون اپنے طنزیہ نشتر چبھونے سے اب بھی باز نہ آئی۔ اور موسیٰ تلملا کر رہ گیا۔

"اچھا، تو موسیٰ صاحب! اب میں جاتی ہوں۔ خاصی دیر ہو گئی ہے آپ میری سہیلی کا ہاتھ دیکھیں اور اسے یہ ضرور بتائیں کہ وہ امریکہ کب جائیگی۔ بے چاری کی بس ایک تمنا ہے اور وہ یہ کہ وہ مس مخدوم کی طرح واشنگٹن میں نصب ابراہیم لنکن کا مجسمہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے"۔

مس ہارون نے موسیٰ کی ناراضگی کو نظر انداز کرتے اپنا کلام جاری رکھا۔ پھر

وہ اپنی سہیلی سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔

"گڈو، گھبرانا نہیں۔ موسیٰ صاحب نہایت شریف النفس انسان ہیں۔ بے جھجک، اپنا ہاتھ اُن کے ہاتھ پر رکھ دو۔ مجھے ان پر مکمل اعتماد ہے۔ میرا لیکچر ساڑھے چار بجے ختم ہوگا۔ تمہیں اپنی قسمت کا حال بتا کر موسیٰ صاحب تو چلے جائیں گے اور تم میرا انتظار کروگی۔ ایک ساتھ چلیں گے سمجھیں بھاگ نہ جانا کہیں۔"

موسیٰ کے لئے یہ ایک بالکل ہی انوکھا تجربہ تھا۔ جب وہ دونوں تنہا رہ گئے۔ تو موسیٰ کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ گرم حمام میں بیٹھا ہو۔ اس کا جسم تپنے لگا تھا آنکھیں جیسے بخار کی شدت سے جلنے لگی تھیں۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے حواس پر قابو پایا اور کانپتی آواز سے خاتون کو مخاطب کیا۔ کہ وہ اپنا ہاتھ آگے بڑھائے۔ لڑکی نے قدرے لجا کر اپنا ہاتھ سیدھا کر کے موسیٰ کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ایک برقی رو سی موسیٰ کے بدن میں دوڑنے لگی تھی۔ گداز اور بھری بھری ہتھیلی سے جیسے مقناطیسی قوت خارج ہو رہی تھی۔ اور موسیٰ کے رگ و پے میں سرایت کرتی سیدھے اس کے دل میں اتر رہی تھی۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے ہاتھ اس کے پاؤں، اس کا دماغ اور اس کا دل کسی انجانی طاقت کے زیر اثر مفلوج ہو رہے ہوں۔ جیسے اس کے انگ انگ پر غنودگی طاری ہونے لگی ہو۔ اس نے لڑکی کا ہاتھ آہستہ سے میز پر رکھ دیا اور پھر اسے چھوئے بغیر لکیروں کا مطالعہ کرنے لگا۔

لڑکی قسمت کی دھنی تھی اور علم کی دولت سے بھی مالامال تھی۔ سنجیدہ متین اور خوش اخلاق تھی مضبوط ارادے کی مالک تھی اور دُھن کی پکی تھی۔ بچپن سے لے کر جوانی تک بے فکری اور خوش حالی کے دور سے گذر رہی تھی۔ حال ہی میں کسی ناخوشگوار حادثے کا شکار ہو گئی تھی۔ تب سے وہ پریشان رہنے لگی تھی۔ شادی کی لکیر پر ایک کانٹا سا دکھائی دے رہا تھا اور اسی کانٹے نے اس کی زندگی میں الجھنوں اور پریشانیوں کے دروازے کھول دیئے تھے۔ لوگ اسے شادی شدہ سمجھتے تھے لیکن وہ اب بھی کنواری تھی اور اسی غم میں وہ گھُل رہی تھی۔

"اسی کانٹے نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔ موسیٰ صاحب! کیا یہ کانٹا کبھی نہ نکلے گا؟"

"وقت کا انتظار کیجیے۔"

"وقت ہی نے تو میرا ساتھ نہیں دیا موسیٰ صاحب۔ تبھی تو میں چاہتی ہوں کہ اس ملک سے کہیں دور چلی جاؤں جہاں وقت سیلاب کی طرح بہہ رہا ہو۔ اور جہاں سے میں لَوٹ کر نہ آسکوں۔"

اب موسیٰ نے سفر کی لکیروں کے لئے انگوٹھے کے ابھار کا مطالعہ شروع کیا اور اس نتیجے پہ پہنچا کہ وہ سمندر پار کے کسی ملک کی سیاحت ضرور کرے گی لیکن پینتیس (۳۵) برس کی عمر کے بعد ـــــ

"تو گویا مجھے چھ برس اور یہ دُکھ جھیلنے ہونگے۔ یہ تو بڑی لمبی مدت

ہے موسٰی صاحب! آپ ذرا غور سے دیکھیں۔ میرا پاسپورٹ بن چکا ہے۔ میرا خیال ہے اگلے سال کے شروع میں شاید کہیں باہر چلی جاؤں گی۔"

"کچھ کہہ نہیں سکتا مس ا۔"

"مسز ارشاد کہیئے موسٰی صاحب! ۔۔۔ یہی میری زندگی کی سب سے بڑی ٹریجڈی ہے۔"

"یہ دیکھئے مسز ارشاد! یہ سفر کی لکیر۔ آپ کی زندگی کی لکیر کو درمیان سے کاٹ رہی ہے اور پامسٹری کے اصول کے مطابق یہ درمیانی فاصلہ پینتیس ۳۵ برس ظاہر کر رہا ہے خدا کرے میری پیشن گوئی غلط ثابت ہو اور آپ اگلے ہی سال سفر پہ روانہ ہو جائیں۔"

مسز ارشاد کی آنکھوں میں نمی دیکھ کر موسٰی کو بے حد افسوس ہوا لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اب وہ بالکل بے بس تھا مسز ارشاد کی زندگی کی لکیر کو اور غور سے دیکھنے پر موسٰی کو یوں محسوس ہوا جیسے خود اس کی زندگی اچانک ٹوٹ رہی ہو۔ اس نے بڑی حسرت سے مسز ارشاد کی طرف دیکھا۔ اتنی حسین صورت اور ایسا جانکاہ حادثہ! موسٰی نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اب وہ کسی کا ہاتھ نہیں دیکھے گا۔ خصوصاً ایسی حسین لڑکیوں کا ہاتھ تو وہ پھر کبھی نہ دیکھے گا۔

"میں آپ سے ایک بات کہہ دوں مسز ارشاد! اگر کبھی سفر کی ضرورت پیش آئی بھی تو بجائے ہوائی جہاز، بحری جہاز کا سفر اختیار کریں

آپ کے لئے ہوائی جہاز کا سفر موزوں نہیں۔"

"اوہ آپ نے تو میرے دل کی بات کہہ دی موسی صاحب!" لڑکی نے چہک کر کہا۔ "میں تو خود یہ چاہتی ہوں کہ میرا سفر بے حد طویل ہو۔ میں اپنے ابا سے کہوں گی کہ وہ میرے لئے بحری سفر کا انتظام کر دے۔ تاکہ راستے میں مختلف مقامات کی سیر بھی کر سکوں۔"

مسز ارشاد کا چہرہ پھول ایسا کھل اٹھا تھا۔ اسے مسرور دیکھ کر موسی کی باچھیں بھی کھل گئیں۔ اسے لگا جیسے اس کے ذہن سے منوں بوجھ اتر گیا ہو۔ مسز ارشاد کی گذشتہ زندگی اور آئندہ زندگی پر ایک طویل لیکچر دے کر موسی نے مسز ارشاد سے اجازت طلب کی اور پھر اسے مس ہارون کے دفتر میں چھوڑ کر باہر نکل آیا۔ اتفاق سے جامعہ کے بس سٹاپ پر ایک بس گھرر گھرر کرتی تیار کھڑی تھی۔ جونہی وہ سٹاپ پر پہنچا بس نے دو ایک ہارن بجائے اور سڑک کے کنارے کنارے رینگنے لگی۔ موسی نے اُچک کر فٹ بورڈ پر پاؤں جمائے اور پھر بس میں داخل ہو کر ایک خالی نشست پر بیٹھ کر مسز ارشاد کے متعلق سوچنے لگا

محلے میں بڑی گہما گہمی اور رونق تھی۔ زرق برق لباس میں ملبوس عورتیں اور لڑکیاں اور بچیاں مالک کے مکان میں آ جا رہی تھیں جن کے وہ کرایہ دار تھے۔ معلوم ہوا مالک مکان کی چھوٹی صاحبزادی کی شادی ہو رہی ہے۔ بوڑھا مالک اپنی جھکی ہوئی کمر پہ ہاتھ رکھے بے حد مصروف اور تھکا تھکا سا دکھائی دے رہا تھا۔ آج دوپہر بارات آ رہی تھی۔ اس لئے مہمانوں کا

تانا بندھا ہوا تھا۔

بخت جمال اور موسٰی نے مہمانوں کے لئے اپنے اپنے کمرے خالی کر دیئے تھے۔ انہوں نے اپنے بستر اور دیگر سامان گودام میں بھر کر تالا لگا دیا تھا۔ گو مالک مکان سے بخت جمال نے وعدہ تو کیا تھا کہ وہ اس شادی میں اس کا پورا پورا ہاتھ بٹائے گا۔ لیکن اب بارات آنے کا وقت ہو رہا تھا اور بخت جمال کا دُور دُور تک پتہ نہ چلتا تھا۔ مالک مکان اور اس کی بیگم کئی مرتبہ بخت جمال کو پوچھ چکے تھے۔ موسٰی نے حتی الامکان مہمانوں کی خاطر مدارت کی اور بیگم کو یقین دلایا کہ وہ اس خوشی میں ان کے برابر کے شریک ہیں لیکن بخت جمال کی غیر حاضری نے اُسے طرح طرح کے شکوک و شبہات میں ڈال دیا تھا۔ تب ہی تو وہ بخت جمال ہی کو بار بار یاد کر رہی تھی۔

بارات آئی اور کھانا کھا کر دلہن کو لیکر واپس چلی گئی۔ دلہن کے پیچھے پیچھے ہزاروں روپوں کا جہیز بھی ٹرکوں پر لاد کر روانہ کر دیا گیا۔ لیکن بخت جمال ہنوز غیر حاضر تھا اور جب شامیانے اتارے جا رہے تھے اور بھگی میدان میں جھاڑو لگا رہے تھے تو بخت جمال نہ جانے کہاں سے آ گیا۔ اس کے ہونٹوں پر پیڑیاں جمی ہوئی تھیں، بال گرد آلودہ تھے اور وہ تھکا تھکا نڈھال سا دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے میلوں پیدل چل کر آیا ہو۔ آتے ہی اس نے گودام سے اپنا بستر نکالا اور صحن میں بچھی ہوئی چارپائی پر ڈال کر پاؤں پسارے لیٹ گیا۔

"ہنگاموں سے مجھے بے حد کوفت ہوتی ہے۔" بخت جمال نے سر اِدھر اُدھر ہٹیختے ویران ویران آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھتے موسٰی سے کہا۔ "ڈھول شہنائی اور خوشی کے شادیانے ان سب سے مجھے للٰہی بُغض ہے۔ اتنے بہت سارے لوگ یکجا دیکھ کر مجھے ہمیشہ محسوس ہوا ہے جیسے میرا ماتم کرنے اکٹھا ہوئے ہوں۔ ایسے میں دل کرتا ہے۔ ڈھول پیٹنے والے کا گریبان چاک کر دوں۔ اس کا ڈھول پھاڑ دوں۔ انہیں خوشیاں منانے کا حق آخر کس نے دیا ہے؟ کسی کا جنازہ اٹھ رہا ہو اور کوئی مارے خوشی کے پاگل ہُوا جا رہا ہو۔ تمہاری یہ بات دُرست ہے کہ میں پاگل ہوں لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے کہ پاگل سے اس کے جینے کا حق بھی چھین لیا جائے۔ میرا ماتم کرو میرے دوست! تم جو میرے دوست ہو میرا غم کھا نہیں سکتے۔ نہ کھاؤ اسے تھوڑا بہت محسوس تو کرو۔ آج میں بیمار بھی ہوں۔ میری بیماری طول پکڑتی جا رہی ہے۔ اور میں بے بس ہوں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے میرا خاتمہ قریب ہو۔ لیکن میکیو میں ایسی حالت میں مرنا بھی نہیں چاہتا۔ جبکہ میری روح عشق کی تکمیل کے لیئے تڑپ رہی ہو۔ یہ کیا مصیبت ہے کہ میں اپنے دل کی ایک معمولی سی خواہش کو بھی پورا نہیں کر سکتا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ کوئی لڑکی مجھے والہانہ پیار کرے۔ میں عاشق کی بجائے معشوق بن جاؤں۔ وہ گلیوں میں میرے پیچھے ماری ماری سرگرداں پھرے بالکل ایسے ہی جیسے آج میں در بدر پھر تا رہا ہوں۔ وہ آہیں بھرے، آنسو بہائے اور میرے قدموں میں اپنا سر رکھ دے۔ اب

تو مجھے یقین ہو چکا ہے کہ ہمارے ملک کے سارے شاعر اور ادیب دھوکہ باز ہیں۔ ان کے افسانے، ناول اور نظمیں سب بکواس ہیں یہ نرگسی مخلوق بذات خود فریب خوردہ ہیں۔ ان کے پاس کچھ بھی نہیں۔ بے چارے عشق کے مریض! اپنی ناکام حسرتوں پر نوحے اور مرثیئے لکھنے والے! غالباً لاشعوری طور پر وہ خود بھی معشوقائیں بننے کی کوشش کرتے ہیں۔

تم بڑے خوش قسمت ہو میرے دوست! جو تمہارے دفتر میں اتنی ساری لڑکیاں کام کرتی ہیں۔ ایک نہ ایک دن تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤ گے۔

میری باتوں پر ناک بھوں نہ چڑھاؤ میرے دوست! تمہارے اندر چھپے ہوئے چور کو میں دیکھ رہا ہوں۔ عشق کا دیوتا جب کسی پر مہربان ہوتا ہے تو عمر، رتبے اور حیثیت کی دیواریں خود بخود گرنے لگتی ہیں۔ اور پھر ادھیڑ عمر کا عشق تو اور بھی جوشیلا ہوتا ہے۔ میں تمہارے چہرے کی بشاشت اور تازگی سے تمہارے دل میں جھانک رہا ہوں اور مجھے سب کچھ دکھائی دے رہا ہے۔ میں اسے کھلی کتاب کی طرح پڑھ سکتا ہوں۔ اب تم بے کار اپنے دل کے زخم چھپانے کی کوشش کر رہے ہو۔"

بخت جمال کی ان بے تکی باتوں پر موسیٰ کو غصہ بھی آیا اور ہنسی بھی۔ اور پھر گھبرا کر وہ گودام میں گھس گیا۔ اپنا سامان نکالتے چند انہونی باتوں کو سوچنے لگا جانے کون تھا جو اس کے دل کے نہاں خانے میں چٹکیاں لینے لگا تھا۔ اس کا جی چاہا وہ جا کر بخت جمال کے سرہانے بیٹھ جائے اور اس کے پاگل پنے کی

باتوں سے لطف حاصل کرے۔

شام کا کھانا تیار کرتے وہ انہی باتوں کے متعلق سوچتا رہا۔ دیگچی میں سبزی اُبل رہی تھی۔ کہیں باسی کڑھائی میں اُبال تو نہیں آگیا۔ وہ سوچنے لگا۔ غیر ارادی طور پر اس نے دیگچی چولہے سے اتار دی اور کمرے میں جا کر مینٹل پیس سے آئینہ لیکر اسمیں اپنی صورت دیکھنے لگا۔ کنپٹی کے سفید بالوں کو دیکھ کر وہ اپنے آپ مسکرا دیا۔ "بے ہودہ! واہیات!" وہ اپنے دوست کو کوسنے لگا جو راکھ میں چنگاری ڈھونڈھ رہا تھا۔ اور پھر مطمئن ہو کر باہر آکر دیگچی دوبارہ چولہے پر رکھ دی۔ "سی سی سی" کی مسلسل آواز اور اٹھتی ہوئی بھاپ نے اسے چونکا دیا کہ دیگچی میں ابال جوں کا توں قائم تھا۔ اس میں ذرا بھی کمی نہیں آئی تھی

کئی دنوں سے موسیٰ کی دفتری مصروفیات معمول سے بڑھ گئی تھیں۔ حساب کتاب کی جانچ پڑتال ہو رہی تھی۔ سالانہ اخراجات اور آئندہ سال کے اخراجات کا تخمینہ لگایا جا رہا تھا۔ ایسے میں اسے سر کھجلانے کی فرصت بھی نہیں مل رہی تھی۔ دفتر کے دیگر اہلکار جب اس کے کمرے کے سامنے چائے پینے کے لئے کینٹین کی طرف جاتے دکھائی دیتے تو وہ انہیں رشک سے دیکھتا ایسے میں مسز ارشاد، اپنی ایک سہیلی کے ساتھ موسیٰ کے کمرے میں داخل ہوئیں۔

"میرے ایک دو پیریڈ خالی تھے۔ اس لئے چلی آئی۔ معلوم ہوتا ہے آپ بہت مصروف ہیں" مسز ارشاد بے تکلفی سے بولیں۔

موسیٰ نے اٹھ کر ان کا استقبال کیا اور پھر پنسل میز پر پھینک کر مہمان خواتین کو کرسیاں پیش کیں۔

"جی ہاں ملازمت ہمیشہ مصروف رہنے کا تقاضہ کرتی ہے۔ مسز ارشاد! کہئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"پچھلے ہفتے جو باتیں آپ نے مجھے بتائی تھیں میں ان پر رات بھر غور کرتی رہی۔ آج صبح میں نے اپنی سہیلی سے بھی آپ کا ذکر کیا۔ اور اب یہی مجھے آپ کے پاس کھینچ کر لائی ہے۔ کیا آپ ان کا ہاتھ دیکھ سکیں گے؟"

"مجھے افسوس ہے مسز ارشاد! آج تو میں بے حد مصروف ہوں۔ اور پھر میں نے شدت سے محسوس کیا ہے کہ مجھے ___ لڑکیوں کا ہاتھ نہیں دیکھنا چاہئے۔ ویسے بھی میرا علم ابھی ناپختہ ہے۔"

"یہ تو آپ نہ کہیں موسیٰ صاحب! آپ نے مجھے جانے بغیر میرے متعلق جو حالات بتائے حرف بحرف صحیح ہیں۔ میں تو آپ کے علم کی قائل ہو گئی ہوں۔ کیا آپ تھوڑا سا وقت اور نہ دے سکیں گے؟"

"مجھے افسوس ہے مسز ارشاد! آج کل تو میں واقعی بہت مصروف ہوں۔ اگر آپ مُصر ہیں تو اپنی سہیلی کو ایک ہفتے بعد لائیں جو کچھ میں جانتا ہوں بلا تامل اظہار کر دوں گا۔"

"لیکن موسیٰ صاحب! میری سہیلی یہاں صرف دو دنوں کی اور مہمان ہے۔ کیا آپ کل کوئی وقت نہ دے سکیں گے؟" مسز ارشاد نے لجا کر کچھ اس انداز سے فرمائش کی کہ موسیٰ کو ٹالنا مشکل ہو گیا۔ اور پھر کل دو بجے کا وقت دے کے

اپنے کام میں دوبارہ جُت گیا۔ دونوں لڑکیاں مسکراتی باہر نکل گئیں۔ باہر برآمدے میں مس ہاردن اور ان دونوں لڑکیوں کی آپس میں باتیں کرتے سن کر موسیٰ کا ماتھا ٹھنکا لیکن وہ بدستور اپنے کام میں منہمک رہا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس کے کمرہ کا دروازہ زوردار جھٹکے سے کھلا۔ موسیٰ نے نگاہ اٹھائی۔ سامنے مس ہاردن کھڑی مسکرا رہی تھی۔

"یہ لڑکیاں کس لئے آئی تھیں مسٹر موسیٰ؟" مس ہاردن نے اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے سوال کیا۔ ایک ثانیے کے لئے موسیٰ کا ذہن کھول اٹھا اور قریب تھا کہ وہ پھٹ پڑتا مگر حالات اور مصلحت آڑے آئی اور چپکا ہو رہا۔

"مسز ارشاد آپ کی سہیلی ہے مس ہاردن! میں انہیں کیونکر منع کر سکتا ہوں۔ آج وہ اپنے ساتھ ایک اور سہیلی بھی لائی تھی اور تقاضا کر رہی تھی کہ میں اس کی سہیلی کا ہاتھ بھی دیکھ لوں" موسیٰ نے انتہائی ضبط و تحمل سے کام لیتے جواب دیا۔

"یہ میری غلطی تھی جو مسز ارشاد کا تعارف آپ سے کیا۔ ذاتی طور پر میں سمجھتی ہوں آپ کو لڑکیوں کا ہاتھ نہیں دیکھنا چاہیئے۔ دیکھیئے نا۔ ایک تو ہمارے کام میں ہرج ہوتا ہے۔ اور پھر طرح طرح کے مغالطے بھی پیدا ہو سکتے ہیں جس سے ہمارے محکمے کی بدنامی یقینی ہے۔ خیر۔ معلوم ہوتا ہے۔ آج تو آپ بے حد مصروف ہیں۔ کیا لائبریری سے متعلق کوئی معاملہ نہیں۔؟ میں اس وقت فارغ ہوں۔ آپ چاہیں تو میرے کمرے میں تشریف لے آئیں۔ میں چند امور پر آپ سے مشورہ چاہتی ہوں۔ آج تو آپ نے حد کر دی۔ لائبریری کی

چابیاں لینے خود نہیں آئے بلکہ چپڑاسی بھیج دیا تھا۔ میں آپ پر تو بھروسہ کر سکتی ہوں مگر آپ مہربانی کر کے لائبریری کی چابیوں کے لئے خود آیا کریں چپڑاسی نہ بھیجا کریں۔ خدانخواستہ ایک کتاب بھی ادھر ادھر ہو گئی تو میں ناظم صاحب کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ ہاں تو آپ تھوڑی دیر کے لئے آجائیں گے نا۔ مس امتیاز بھی وہیں بیٹھی ہیں۔ ایک بڑا دلچسپ مسئلہ زیر بحث ہے۔ آپ آرہے ہیں نا؟"

گفتگو کی ابتدا میں موسیٰ کی جو دل شکنی ہوئی تھی۔ مس ہارون کے آخری جملوں نے اس کی تلافی کر لی تھی۔ اس لئے موسیٰ کے ذہن سے وہ سارا بوجھ اتر گیا تھا مس ہارون کے جانے کے بعد موسیٰ کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا انگ انگ ٹوٹ رہا ہو۔ وہ اپنے دل میں ایک عجیب سی مسرت خوشی کے دھارے پھوٹتے محسوس کرنے لگا۔ "کیا یوں بھی ہو سکتا ہے؟" اس نے خود ہی اپنے آپ سے سوال کیا۔ اور پھر بڑے شد و مد سے اسے رد بھی کر دیا۔

مس ہارون اور مس امتیاز چائے نوشی میں مصروف تھیں جب موسیٰ ادب سے دروازہ پر دستک دے کر اندر داخل ہوا۔ مس ہارون نے بڑے عجیب انداز سے موسیٰ کی طرف دیکھا اور میز پر پڑی ہوئی گھنٹی بجادی۔

"بیٹھیئے موسیٰ صاحب! اس بحث کو آپ ہی ختم کر سکتے ہیں" مس ہارون نے مس امتیاز کی طرف دیکھا اور پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ چپڑاسی دخل در معقولات نہ کرتا تو مس ہارون بحث چھیڑ ہی دیتی۔ چپڑاسی کو اور چائے لانے کا آرڈر دیکر وہ موسیٰ سے مخاطب ہوئیں۔

"ایک بات پوچھوں گی موسیٰ صاحب! صحیح صحیح جواب دینا۔" مس ہارون نے اپنے بالوں میں پن کو ٹھیک جماتے ہوئے موسیٰ کو مخاطب کیا۔

"ہمیں یہ معلوم ہوا ہے کہ آپ شادی شدہ ہیں اور آپ چار بچوں کے باپ بھی ہیں۔ کیا آپ دوسری شادی کے خواہش مند ہیں؟"

اس اچانک سوال کے لئے موسیٰ ذہنی طور پر بالکل تیار نہ تھا۔ وہ بوکھلا سا گیا اور بغلیں جھانکنے لگا۔ وہ کبھی ایک اور کبھی دوسری لڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔ سچائی کا تقاضا تو یہی تھا کہ وہ اقرار کر لیتا لیکن شرافت کا نام نہاد خول جو اس نے اپنے اوپر چڑھا رکھا تھا، آڑے آ رہا تھا۔

مس ہارون اور مس امتیاز موسیٰ کو خاموش پا کر ہنسنے لگیں۔ موسیٰ نے مس ہارون کی طرف دیکھا جس کا انگ انگ ہنستے ہوئے ڈول ڈول رہا تھا۔ وہ میز پر قدرے جھکی ہوئی تھی۔ جس سے اس کا سینہ میز کے کناروں کو چھو رہا تھا۔ موسیٰ کے ذہن میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ اس کا چہرہ تمتما اٹھا اور دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اپنے جذبات پر قابو پانے کے لئے اس نے نگاہیں جھکا دیں اور میز پر پڑے ہوئے پیپر ویٹ سے کھیلنے لگا۔

"آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں مسٹر موسیٰ؟" مس ہارون نے کندھوں پر دوپٹہ درست کرتے پوچھا۔ موسیٰ نے نگاہیں اٹھائیں اور مس ہارون کی سرپوشی سے قدرے مطمئن ہو کر جواب دیا۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔ ذرا وضاحت کیجئے۔"

"مس ہارون کے سوال کا مطلب یہ ہے موسٰی صاحب! کہ آپ دوسری شادی کے حق میں ہیں یا نہیں" بجائے مس ہارون کے مس امتیاز نے وضاحت کی۔

"لیکن یہ سوال آپ مجھ ہی سے کیوں پوچھ رہی ہیں۔ مس ہارون! دوسری بات یہ ہے کہ اس وقت میں بہت مصروف ہوں۔ آپ کے سوال کا پھر کسی وقت جواب دوں گا۔" موسٰی نے جان چھڑانے کو بہانہ تراشا۔ لیکن مس ہارون ہار نہ ماننے پر ادھار کھائے بیٹھی تھیں۔ اور پھر اس وقت وہ خوشی کے موڈ میں تھی اس لیے موسٰی کو چھیڑنے میں شاید وہ لطف محسوس کر رہی تھی۔

"یوں کہیئے۔ میں نے مرد کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہے اس لئے آپ سے جواب نہیں بن پڑ رہا۔"

"یہ بات تو نہیں مس ہارون! جواب تو میرے پاس موجود ہے لیکن عورت ہو کر شاید آپ اُسے برداشت نہ کر سکیں۔ بہر کیف میں اتنا عرض کروں گا کہ یہ ضروری نہیں کہ ہر مرد دوسری شادی کا متمنی ہو۔ ہم نے سینکڑوں مرد دیکھے ہیں جنہوں نے ساری زندگی صرف ایک ہی عورت سے نباہ کیا ہے اور بفرضِ محال اگر کسی مرد نے دوسری شادی رچا بھی لی ہے تو اس میں کوئی مضائقہ بھی تو نہیں۔ عورتیں بھی تو بعض اوقات ایک مرد کو چھوڑ کر دوسرے مرد سے شادی کر لیتی ہیں۔ بلکہ بعض اوقات شادی کے بغیر بھی کئی عورتوں نے مردوں کے پاؤں پکڑے ہیں۔ جس کا اطلاق ہر عورت اور ہر مرد پر نہیں ہو سکتا۔"

"آپ اب بھی نہیں سمجھے موسٰی صاحب!۔ اور نہ مسئلے کی تہہ تک پہنچے۔"

مس امتیاز اپنے کالے رنگ کے پرس کو کھول کر اس میں کچھ ڈھونڈتے ہوئے کہنے لگیں۔ "سوال یہ ہے کہ مرد ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کی خواہش کیوں کرتا ہے؟"

مس ہارون بڑے غور اور اشتیاق بھری نگاہوں سے موسیٰ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ موسیٰ نے پہلی بار محسوس کیا کہ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی چمک عود کر آئی ہے۔ جسے وہ پہلے شاید محسوس نہ کر سکا تھا یا ممکن ہے یہ اس کا واہمہ ہو۔ اس نے یہ خیال جان بوجھ کر اپنے ذہن سے جڑ سے اکھاڑ دیا اور مس امتیاز کے سوال کا جواب سوچنے لگا۔

"ہاں تو موسیٰ صاحب! آپ نے محسوس کیا ہے کہ شادی شدہ مرد غیر عورتوں کی طرف کیوں للچائی اور بھوکی نگاہوں سے دیکھتے ہیں" مس ہارون نے ہنسی ہنسی میں موسیٰ پر بھرپور چوٹ کی۔ موسیٰ نے پینترا بدلا اور دل میں یہ ٹھان کر کہ اس دفعہ وہ صاف گوئی سے کام لے گا۔ مس ہارون کی نگاہوں میں نگاہیں گاڑ دیں۔ مس ہارون کے خوبصورت دانتوں کی روشنی تو بجھ گئی کہ اس نے ہونٹ سکیڑ لیئے تھے مگر اس کی آنکھوں کی وہ عجیب چمک اب بھی جوں کی توں قائم تھی۔

"کہنے کو تو میرے پاس بہت کچھ ہے مس ہارون! مجھے یہ ڈر ہے کہیں آپ برا نہ مان لیں۔" موسیٰ نے دل کڑا کر کے جواب دیا۔

"برا کیوں ماننے لگی مسٹر موسیٰ! تحقیق میرے فرائض میں شامل ہے اور میں ہر معاملے میں تحقیق کو قطعاً معیوب نہیں سمجھتی۔ آپ بغیر کسی ہچکچاہٹ

کے اپنا مافی الضمیر بیان کریں۔"

"تو سنیئے مس ہاروُن!۔ نفسیات کی رو سے عورت مرد سے جلتی ہے۔ عورت کی سرشت میں حسد کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ عورت لاشعوری طور پر محسوس کرتی ہے کہ قدرت نے اس کے ساتھ بے انصافی کی ہے یعنی عورت کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ اور وہ زندگی بھر مرد کی برابری کرنے میں شد ومد سے کام لیتی ہے۔ جو عورتیں اس میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ وہ مردوں پر حاوی ہو جاتی ہیں۔ اور جو حوصلہ ہار دیتی ہیں وہ ہمیشہ کے لئے مرد کی تابعداری اور محکومیت قبول کر لیتی ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے عورت کی سرشت میں حسد کا عنصر غالب ہے۔ آج جو آپ اس کرسی پر بیٹھی ہیں اور ایک لحاظ سے سمجھتی ہیں کہ میں آپ کے ماتحت کام کر رہا ہوں اور اس میں آپ بے حد خوشی محسوس کرتی ہیں یہ بھی درحقیقت آپ کے لاشعور کی وہ سعئِ ناکام ہے لیکن مرد پھر بھی مرد ہے آپ کوئی بھی روپ دھاریں، کوئی بھی سوانگ رچائیں لاکھ جتن کریں مرد کی غلامی سے اپنے تئیں پیچھا نہیں چھڑا سکتیں۔ کئی معاملات میں آپ کو مرد کا سہارا لینا ہی پڑتا ہے۔ اب شادی ہی کے مسئلے کو لیجئے!۔ معاف کیجئے۔ میں موضوع سے قدرے بھٹک گیا ہوں لیکن میں اسی طرف آرہا ہوں۔ آپ میری دلیلوں پر ذرا کان دھریں۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اب شادی ہی کے معاملے کو لیجئے ہمارے تو کیا غالباً دنیا بھر کے معاشرے میں مرد عورت کا ہاتھ تھامنے میں پہل کرتا ہے۔ مرد پہلے اور عورت بعد میں ایک دوسرے کو قبول کرتے ہیں اور زندگی بھر ساتھ دینے کا وعدہ کرتے

ہیں۔ پس یہ ثابت ہو گیا کہ مرد ہر حالت میں عورت پہ فائق اور زوردار آور ہے۔ اب میں اصل موضوع کی طرف لوٹتا ہوں۔ مرد اگر دوسری شادی کرتا ہے تو اس کی کئی وجوہات ہیں۔ سب سے پہلے تو مرد جسمانی لحاظ سے عورت پہ بھاری ہے۔ اسی طرح مرد کی جنسی طاقت بہ نسبت عورت کے بڑھ چڑھ کر ہے۔ مرد کے مقابلے میں عورت کی جوانی جلد ڈھل جاتی ہے۔ ابھی مرد اپنے اعضاء میں بھرپور توانائی محسوس کرتا ہے کہ عورت ہتھیار ڈال دیتی ہے۔ اس کا شباب ڈھل جاتا ہے۔ اور وہ رس چھٹے ہوئے گنے کی طرح سوکھ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ عورت چند قدرتی بیماریوں کا شکار بھی رہتی ہے۔ کبھی اس کا پاؤں بھاری ہے اور کبھی ۔۔۔ وہ ۔۔۔ یعنی آپ میرا مطلب سمجھ گئی ہوں گی۔ ایسی حالت میں مرد صرف ایک عورت پر اکتفا کرے تو کیسے کرے۔ یہی مجبوریاں بعض مردوں کو دوسری شادی پر اکساتی ہیں۔ آخر جنسی بھوک بھی تو اتنی ہی لازمی اور اہم ہے جتنی روٹی کی طلب۔ مجھے یقین ہے میرے دلائل تھوڑا بہت آپ کے ذہن کو اپیل کرنے لگے ہوں گے۔ اس سے زیادہ وضاحت کے لئے معذرت خواہ ہوں اور اگر کوئی گستاخی ہو گئی ہو تو معافی چاہتا ہوں۔"

"معذرت کی کوئی بات نہیں مسٹر موسیٰ!" مس ہارون نے مسکرا کر کہا۔ "اتنا تو آپ بھی تسلیم کریں گے کہ عورت کے شباب کے ڈھلنے میں مرد کا ہاتھ ہوتا ہے۔"

"نہیں مس ہارون! میں آپ سے اتفاق نہیں کرتا۔ اس لئے کہ عورت کے شباب کے ڈھلنے میں خود عورت کا اتنا ہی ہاتھ ہے جتنا کہ مرد کا ہو سکتا ہے۔"

"یہ کیسے ہیں اسے نہیں مانتی" مس امتیاز نے مداخلت کی۔

"پھر تو مجھے اور بھی زیادہ باریکیوں میں جانا پڑے گا۔ اور یہ باریکیاں کم از کم میں عورتوں کی محفل میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔" موسیٰ نے چپراسی کی طرف دیکھ کر کہا جو نہ جانے کب سے چائے لے آیا تھا اور پیش کرنے کے انتظار میں کھڑا تھا

"یوں کہیئے آپ ہار گئے" مس ہارون نے فقرہ کسا۔ اور پھر چپراسی سے مخاطب ہوئیں۔

"تم جاؤ ملازم حسین ہم خود چائے بنا لیں گے۔"

"کچھ بھی سمجھ لیجئے۔ اس سے زیادہ تشریح میرے لئے ممکن نہیں" موسیٰ نے گردن موڑ کر دروازے سے باہر نکلتے چپراسی کو دیکھا اور گویا ہوا۔

"اچھا یہ بتایئے موسیٰ صاحب آپ اپنی بیوی سے مطمئن ہیں؟" مس امتیاز مسکرائی۔

"ہاں بالکل" موسیٰ نے صریحاً جھوٹ سے کام لیتے ہوئے کہا۔ دراصل اس نے جہاں تک اپنے آپ کا تجزیہ کیا تھا۔ وہ ازدواجی تعلقات نبھانے میں ناکام رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس کی بیوی ایک امیر باپ کی بیٹی تھی۔ اور وہ اکثر اس پہ چھا جانے کی کوشش کرتی تھی جس سے بعض اوقات معمولی باتوں پر بھی رنجشیں اور کدورتیں پیدا ہو جاتی تھیں۔

"کیا سوچ رہے ہیں موسیٰ صاحب! کیا بیوی یاد آنے لگی ہے؟"

مس ہارون کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ اور موسیٰ جھینپ سا گیا۔

"لیجئے چائے پیجئے" مس امتیاز چائے کا پیالہ لئے اس کے بہت

قریب آکر کہنے لگیں۔ "گھبرائیں نہیں موسیٰ صاحب! جتنی رخصت چاہیئے ہیں ناظم صاحب سے آپ کی سفارش کردوں گی" مس امتیاز نے مس ہارون کی طرف دیکھا اور پھر دونوں کھلکھلا اٹھیں۔

موسیٰ نے چائے کی دو چار چسکیاں ہی بھری تھیں کہ چپڑاسی نے اندر آکر مس ہارون کو اطلاع دی کہ انہیں ناظم صاحب بلا رہے ہیں۔

"آپ آرام سے چائے پیجئے موسیٰ صاحب! میں ابھی آئی" مس ہارون دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے موسیٰ سے مخاطب ہوئیں۔ "اور تم بھی امتیاز کہیں چلی نہ جانا"

"جی میں تو جا رہی ہوں ہارون! بس موسیٰ صاحب چائے پی لیں" مس امتیاز نے جواب دیا۔ اور پرس ٹٹولنے لگیں۔ مس ہارون دروازہ کھول کر باہر نکل گئیں تو موسیٰ مس امتیاز سے کہنے لگا۔

"آپ جائیں مس امتیاز! میں نے چائے پی لی ہے۔ ویسے میں خود بھی بیحد مصروف تھا لیکن مس ہارون کا حکم ٹال بھی تو نہیں جا سکتا تھا"

"ہاں!" مس امتیاز مسکرائیں "ان کا کہا کون ٹال سکتا ہے؟" پھر وہ خود ہی کھلکھلا کر ہنس دیں۔ موسیٰ نے جلدی جلدی چائے حلق میں انڈیلی اور مس امتیاز کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آیا۔

"یہ مس ہارون بھی عجیب نام ہے؟ جیسے کسی مرد کا نام ہو" برآمدے میں آکر وہ مس امتیاز سے مخاطب ہوا۔

"ان کا اصلی نام آمنہ ہے اور ہارون بطورِ دم چھلا استعمال کرتی ہیں"

"دُم چھلے سے آپ کی مراد غالباً تخلّص ہے"،

"تخلص تو شاعر لوگ استعمال کرتے ہیں۔ مس ہارون بے چاری تو اس معاملے میں بالکل کوری ہیں۔ آپ حیران ہوں گے موسیٰ صاحب! مس ہارون نے آج تک ادبیات کا سرے سے مطالعہ ہی نہیں کیا۔ وہ شعری اور ادبی تخلیقات کو افیون کی گولی سمجھتی ہیں جن کے مطالعے سے انسان اونگھنے لگتا ہے۔ وہ سمجھتی ہیں اگر ادب تخلیق نہ کیا جاتا تو انسان بہت ترقی کر سکتا تھا۔ لٹریچر نے انسان کو بے حس کر دیا ہے۔ وہ ہمیشہ تخیّلات کی دُنیا میں گم رہتا ہے۔ جس سے وہ ٹھس ہو کر رہ گیا ہے ورنہ وہ کب کا ستاروں پر کمند ڈال چکا ہوتا۔"

موسیٰ نے اپنے سامنے بحث کا ایک دروازہ کھلتے دیکھا مگر یہ سوچ کر چپ رہا کہ عورتیں ناقص العقل ہوتی ہیں۔ ان سے بحث کرنا بے سود ہے۔ اس نے محض ایک طنزیہ مسکراہٹ پر اکتفا کیا اور واپس اپنے دفتر آ کر حساب کتاب میں سر کھپانے لگا۔

اگلے روز دو بجے دوپہر مسز ارشاد کی سہیلی کا ہاتھ دیکھ کر موسیٰ دفتر بند کرنے لگا تو ناظم صاحب مس ہارون کے ساتھ اچانک ان کے دفتر میں داخل ہوئے اور موسیٰ کی میز پر چرمی تھیلا رکھتے ہوئے مسکرا کر کہنے لگے۔

"سنا ہے موسیٰ صاحب! آپ قسمت کا حال بتاتے ہیں۔ ذرا دیکھئے تو میرے ہاتھ کی لکیریں کیا پیشن گوئی کرتی ہیں؟"

موسیٰ نے سٹپٹا کر مس ہارون کی طرف دیکھا لیکن مس ہارون جیسے بالکل انجان اور لاتعلق سی کھڑی مسکراتی رہیں بلکہ الٹی شہہ دی۔

"ڈاکٹر صاحب! موسیٰ صاحب صرف لڑکیوں کے ہاتھ دیکھا کرتے ہیں۔ انہیں مردوں کے ہاتھ دیکھنے کی جانچ ہی نہیں" مس ہاروِن اور ناظم صاحب دیر تک کھڑے یونہی ہنستے رہے۔

"اب چلیئے ڈاکٹر صاحب!۔ دیر ہو رہی ہے۔ میری سہیلی مجھے کوس رہی ہوگی۔" مس ہاروِن نے اٹھلا کر کہا اور موسیٰ کو یوں نظر کر دیا جیسے وہ وہاں موجود ہی نہ ہو۔

"آپ چلیں گے ہمارے ساتھ موسیٰ صاحب؟" ناظم صاحب نے از راہِ تکلف دریافت کیا۔ ورنہ موسیٰ جانتا تھا کہ ناظم صاحب سوائے مس ہاروِن کے کسی اور کو اپنی گاڑی میں نہیں بٹھاتے۔

"شکریہ ناظم صاحب! آپ جائیں ابھی مجھے کچھ دیر بیٹھنا ہے۔" موسیٰ نے بچے کھچے کاغذات میز پر دوبارہ پھیلاتے جواب دیا۔

"مسٹر! تکلف نہ کریں۔ ورنہ بس کے انتظار میں گھنٹوں سٹاپ پر کھڑے بور ہوں گے" مس ہاروِن نے انہی عجیب نظروں سے موسیٰ کی طرف دیکھا جن کا مظاہرہ وہ پہلے بھی کر چکی تھیں۔ پھر اس کے لہجے میں بے تکلفی بھی تھی۔ موسیٰ کے دل میں ہلکی ہلکی گدگدی ہونے لگی۔ اس نے نگاہ اٹھا کر مس ہاروِن کی طرف دیکھا پھر مسکرا کر کاغذات سمیٹنے لگا۔

"آپ جانتے ہیں موسیٰ صاحب!۔ مس ہاروِن کی عنقریب شادی ہونیوالی ہے۔" ناظم صاحب نے اچانک نہ جانے کیا سوچ کر یہ انکشاف کیا۔ مس ہاروِن نے ناظم صاحب کو گھور کر دیکھا اور پھر نگاہ پھیر کر مسکرانے لگی۔ موسیٰ کہتے ہیں

تو اچانک ایک جھٹکا سا لگا پھر جیسے نے سنی ان سنی کر کے سامان سمیٹا اور الماری میں بند کر کے تالا لگا دیا۔ ایک بار اور دفتر کا اچھی طرح جائزہ لے کر وہ ناظم صاحب اور مس ہارون کے پیچھے پیچھے برآمدے میں چلنے لگا۔ وہ دونوں اس کے آگے آگے چلتے ہوئے کسی بات پر تکرار کر رہے تھے جس کا ایک آدھ لفظ اس کی سمجھ میں آ جاتا۔ موضوع گفتگو ایک لڑکی کے متعلق تھا جسے ناظم صاحب اپنے دفتر میں ملازم رکھنا چاہتے تھے۔ اور مس ہارون اس کی مخالفت کر رہی تھی جب سب لوگ گاڑی میں بیٹھ گئے تو ڈرائیور نے چابی گھمائی اور گاڑی گھرر گھرر کرتی بلڈنگ کو عبور کر کے جامعہ کی سڑک پر وہیل مچھلی کی طرح ہوا کو چیرتی آگے بڑھنے لگی۔ راستے میں کافی دور تک گاڑی میں مکمل خاموشی طاری رہی یوں لگتا تھا جیسے ہر ایک اپنے آپ سے بیزار ہو۔ کئی میل کا فاصلہ طے کر کے گاڑی مس ہارون کے ہوسٹل کے قریب نمودار ہوئی تو ایک لمحہ کے لئے اس نے پیچھے گردن موڑ کر بالوں میں بے مقصد انگلیاں پھیرتے موسیٰ کی طرف دیکھا اور آپ ہی آپ مسکرا دی جانے اس وقت کیوں موسیٰ کو اس کی مسکراہٹ اچھی نہ لگی۔ لیکن اخلاق و مروت کا تقاضہ تھا کہ وہ جواب میں مسکرا دیتا۔ اور پھر جب گاڑی ہوسٹل کے دروازے پر آن رکی تو مس ہارون نے نہایت دھیمے لہجے اور ہلکی مسکراہٹ سے ناظم صاحب کے ساتھ ساتھ موسیٰ کو بھی سلام کیا۔ اور گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گئی۔ وہ کھٹ کھٹ کھٹ" اونچی ایڑی کی جوتی کی آواز موسیٰ کو اپنے ذہن پر ہتھوڑے سے ایسی ضربیں لگاتی محسوس ہوئی۔ اور غیر محسوس طور پر موسیٰ نے نفرت سے نگاہ پھیر لی۔ پھر اس کے دل و دماغ میں ایک جنگ سی چھڑ گئی۔

"یہ ضروری نہیں کہ نفرت کے لئے کوئی جواز بھی ہو" اس کے دماغ نے دل کو دھتکارا۔ اور اس کا دل جزبز ہو کر رہ گیا۔

"آپ کو کہاں اتار دوں مسٹر موسیٰ؟" جب مس ہارون نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو ناظم صاحب جیسے اچانک ہوش میں آ کر موسیٰ سے پوچھنے لگے۔ "کسی بھی بس سٹاپ پر اتار دیجئے ناظم صاحب!" موسیٰ نے بے دلی سے جواب دیا۔

"پہلے میرا خیال تھا کہ میں آپ کو ریلوے سٹیشن تک لفٹ دوں گا۔" ناظم صاحب نے سگریٹ کے جلتے ہوئے ٹکڑے سے دوسرا سگریٹ سلگاتے کہا "لیکن مجھے ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے۔ آپ محسوس نہ کریں مسٹر موسیٰ! دیکھئے نا۔ دِقت یہ ہے کہ لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں کو نون مرچ لگا کر ایسے بیان کرتے ہیں جیسے کوئی بہت بڑی انہونی بات ہو گئی ہو۔ اور پھر وہ یہ بھی نہیں سوچتے کہ میں کسی کی باتوں کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتا۔"

موسیٰ کے پلے کچھ بھی نہیں پڑ رہا تھا پھر بھی وہ ناظم صاحب کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ گاڑی کب چلی اور کب رکی موسیٰ کو محسوس تک نہ ہوا۔ ایک بس سٹاپ کے چھجے کے نیچے چند طالب علم اور چند طالبات کھڑی تھیں۔ ناظم صاحب کے اچانک بھرپور قہقہے سے اس نے چونک کر ڈرائیور کی طرف دیکھا اور پھر دروازہ کھول کر گاڑی سے نیچے اتر آیا۔ ناظم صاحب کو سلام کر کے موسیٰ بس سٹاپ پر آ گیا۔ اور ریلوے سٹیشن والی بس کا انتظار کرنے لگا۔

اگلے روز جب وہ دفتر پہنچا تو مس شہلا اور مس برکت مسیح اس کے کمرے میں کھڑی رجسٹر پر حاضری لگا رہی تھیں۔

"یہ رہے آپ کے فریم مس شہلا۔" موسیٰ نے چہک کر کہا۔ دراصل لڑکیوں کو مرعوب کرنے میں وہ ایک گونہ خوشی اور فخر محسوس کرتا تھا۔ دیکھ لیجیے وہی مناظر ہیں نا جو میں نے مس برکت کو کرسمس کے موقع پر دیے تھے ہاں، مس شہلا کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے جلدی جلدی موٹے کاغذ کی تہہ فریموں سے اتاری اور فریم دونوں ہاتھوں میں تھام کر ذرا فاصلے سے انہیں جانچنے لگی۔

"شکریہ۔ موسیٰ صاحب۔ بہت بہت شکریہ" اس کے منہ سے الفاظ یوں نکلنے لگے جیسے موٹے موٹے نوالے نگل رہی ہو۔

"شکریہ کس بات کا مس شہلا!۔ مجھے خوشی ہوئی کہ میں نے آپ کی ایک ادنیٰ سی خواہش پوری کی" اس نے دو فریم الگ کر کے الماری میں رکھتے کہا۔ اور جب لڑکیاں باہر چلی گئیں تو موسیٰ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ لیکن آج وہ کچھ بے کل سا لگ رہا تھا۔ نگاہ اٹھا کر وہ بار بار دفتر کے شیشوں سے باہر دیکھتا۔ اس کے کان کسی کی آہٹ پر لگے ہوئے تھے۔ پھر وہ اپنے سر کو یوں جھٹکے دینے لگا۔ جیسے اس کے ذہن کی سلیٹ پر کوئی سوال آپ ہی آپ ابھر آیا ہو اور بجز تردید کے اسے کوئی چارہ نظر نہ آتا ہو۔

"یہ بات کیا ہے؟" اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ "ٹھکراتی ہے تو ٹھکرانے دو" اس نے خود ہی جواب بھی دے دیا۔ "اگر اس نے فریم لینے سے انکار کر دیا۔ تو میں انہیں اسی دفتر میں سجا دوں گا۔" اس نے اپنے آپ کو تسلی دی اور پھر مطمئن ہو کر کام کرنے لگا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد جب سب لوگ اپنے اپنے دفتروں میں کام میں مصروف ہو گئے تو موسیٰ نے الماری کھولی اور فریم

لے کر اپنے کمرے سے باہر آگیا۔ برآمدے میں سوائے دو چپڑاسیوں کے اور کوئی دکھائی نہ دیتا تھا۔ وہ دھڑکتے دل اور ڈولتے قدموں سے مس ہارڈن کے دفتر کی جانب بڑھا۔ دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور بغیر اجازت حاصل کئے۔ ہینڈل کی مٹھی گھما کر اندر داخل ہو گیا۔

"سلام علیکم موسیٰ صاحب!۔ کہیئے طبیعت کیسی ہے" مس ہارڈن کیلکولیٹر کی مشین کی گراری گھماتے موسیٰ سے مخاطب ہوئیں۔

"ٹھیک ہوں مس ہارڈن!۔ بس سلام کرنے چلا آیا" موسیٰ نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش میں ہکلا کر جواب دیا۔

"یہ آپ کے ہاتھ میں کیا ہے؟" مس ہارڈن نے عادت کے مطابق جوڑے میں انگلیاں پھیریں اور مسکرانے لگی۔

"میں نے سوچا" موسیٰ نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور تمہید کے لئے مناسب الفاظ ڈھونڈنے لگا۔

"حسین منظر کسے اچھے نہیں لگتے۔ یہ ایک سیاح کا ایک حقیر سا تحفہ ہے۔ قبول کریں گی؟"

"تحفہ؟۔ میرے لئے آپ تحفہ لائے ہیں؟" مس ہارڈن کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ اور پھر دیر تک ہنستی رہیں۔ اس کا بدن ہلکورے لے رہا تھا اور گداز سینہ بار بار میز کے کنارے سے ٹکرا رہا تھا۔

"آخر ہے کیا۔ دیکھوں تو؟" مس ہارڈن نے موسیٰ کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ اس اثنا میں موسیٰ کو یوں لگا جیسے وہ ایک صدی سے گذر چکا ہو۔ اس کے ٹھنڈے لیے سرد

پڑ چکے تھے اور دل بجھ کر رہ گیا تھا۔ اس نے مس ہاروں کی طرف گھور کر دیکھا، اور پھر چپکے سے فریم اس کی میز پر رکھ کر کچھ کہے سنے بغیر الٹے قدموں واپس چلا گیا۔

"یہ میں نے کیا کر دیا؟" وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا سوچنے لگا۔ "مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا، لیکن۔ وہ اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے؟ ہونہہ" نفرت کے ایک ریلے نے اسے اپنے آپ سے بے زار سا کر دیا، اور پھر کوشش کے باوجود وہ کام میں دل نہ لگا سکا۔ لیکن ملازم کو کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ اس نے اپنے آپ پر لعنت بھیجی اور حساب کتاب کا ایک بڑا رجسٹر کھول کر چند ضروری اندراجات میں منہمک ہو گیا۔ اس کے بعد وہ اپنے کام میں ایسا کھو گیا کہ متواتر تین گھنٹے تک اس نے سر نہ اٹھایا۔ صبح جس بھول کا ارتکاب کر چکا تھا۔ وہ اور اس کے تمام مضر اثرات اس کے دماغ سے بالکل زائل ہو گئے۔ اور وہ نارمل آدمی بن کر اپنا فرض نہایت خوش اسلوبی سے ادا کرنے لگا۔ اچانک ایک جھٹکے سے اس کے دفتر کا دروازہ کھلا اور اسے مجبوراً ہو کر نگاہ اٹھانی پڑی۔ سامنے مس ہاروں کھڑی مسکرا رہی تھی۔

"آپ تو ناراض ہو گئے ہوسی صاحب" مس ہاروں نے شوخی سے اٹھلا کر کہا "میں آپ کا تحفہ ایک شرط پر قبول کر سکتی ہوں" ہوسی کی سوالیہ نگاہوں کو نظر انداز کرتی اس نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔

"آپ کو ان کی قیمت لینی پڑیگی"

"تحفہ ہمیشہ انمول ہوا کرتا ہے مس ہاروں!۔ مجھے توقع نہ تھی کہ آپ جیسی پڑھی لکھی عورت ایسا سوچ بھی سکیں گی۔ اور پھر میں شیشوں کا سوداگر نہیں بعد

نہ ہی تجارت میرا پیشہ ہے۔ میں فن کا قدردان ہوں۔ میں سمجھتا تھا آپ میں بھی فن کو پرکھنے کی صلاحیت ہوگی اس لئے دو فریم آپ کے لئے بھی لے آیا۔ اگر آپ قبول نہیں کرتیں تو کوئی بات نہیں مس ہارون!۔ مجھے اپنے فریم لوٹا دیں"

موسیٰ نے مایوس ہو کر گریبان میں منہ ڈال لیا۔ پھر اس نے لکھنے کو قلم اٹھایا۔ لیکن اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور دل مایوسیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب چکا تھا۔ اس نے جیبیں ٹٹولیں اور سگریٹ کی ڈبیہ نکال کر ایک سگریٹ سلگا کر اس کا کڑوا کسیلا دھواں پینے لگا۔ نادانستہ طور پر اس کے کڑوے سگریٹ کے کثیف دھوئیں کا مرغولہ مس ہارون کی طرف لپک گیا۔ مس ہارون نے بُرا سا منہ بنایا اور پھر ہاتھ سے دھواں ادھر ادھر ہٹانے لگیں۔

"بہت سگریٹ پیتے ہیں آپ۔ کتنی مضر ہے سگریٹ نوشی! کبھی آپ نے سوچا ہے؟" مس ہارون نے مسکرا کر کہا۔ موسیٰ نے اُسے گھور کر دیکھا۔ اس کے جی میں آیا کہدے سگریٹ کا کڑوا دھواں، عورت کے معطر سانسوں سے ہرگز مضر نہیں ہوتا۔ لیکن وہ چپ رہا۔

"سوچ رہی ہوں مسٹر موسیٰ!۔ اس تحفے کے لئے آپ نے مجھی کو کیوں چُنا؟۔ مس امتیاز بھی تو اسی دفتر میں کام کرتی ہیں۔ اور پھر وہ مجھ سے زیادہ فن کی دلدادہ ہیں"

موسیٰ مس ہارون کے چہرے میں کھو سا گیا۔ وہ کافی دیر تک بڑی بے باکی سے اُسے گھورتا رہا۔ مس ہارون سٹپٹا کر بغلیں جھانکنے لگیں۔ شاید موسیٰ سے اسے ایسی گستاخی کی توقع نہ تھی۔ پھر وہ آپ ہی آپ مسکرانے لگیں۔

"وہ یہ تحفہ میں آپ ہی کے لئے لایا تھا۔ اگر آپ اسے قبول کرتی ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ لوٹا دیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

"اگر آپ اس تحفے کی قیمت وصول کر لیتے تو میرے ذہن سے ایک بوجھ اتر جاتا۔ موسیٰ صاحب! آپ نہیں جانتے ہمارے شعبے کی لڑکیاں بات کا بتنگڑ بنانے میں کتنی ماہر ہیں۔ خیر۔ مفاہمت کی صرف ایک صورت باقی رہ گئی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ" مس ہارون نے مسکرا کر موسیٰ کی طرف دیکھا اور آنکھوں میں شوخی بھر کر کہا "آپ کو میرے ساتھ چائے پینی ہوگی۔ چلو۔ آؤ۔ میرے کمرے میں چائے کب سے پڑی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"

موسیٰ نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر قلم میز پر رکھ کر مس ہارون کے پیچھے پیچھے اس کے دفتر میں داخل ہوا۔ مس ہارون نے پیالی میں چائے انڈیلی اور موسیٰ کو پیالہ پیش کیا۔ ابھی اس نے دو ایک چسکیاں ہی بھری تھیں کہ مس امتیاز کچھوے کی چال چلتی مس ہارون کے کمرے میں آدھمکیں۔ اور میز پر پڑے شیشے کے فریموں کو بڑے اشتیاق سے دیکھنے لگیں۔ پھر اس نے ایک تصویر ہاتھ میں لی اور قریب سے دیکھنے لگی۔

"ہائے!۔ کتنا خوبصورت منظر ہے!۔ موسیٰ صاحب!۔ اب میری باری ہے۔ ایسی ہی تصویریں میرے لئے بھی بنا کر لائیں۔ میں انہیں اپنے ڈرائینگ روم میں سجاؤں گی۔ لیکن فریم ان سے دگنا بڑا ہونا چاہیئے۔" مس امتیاز چہک اٹھیں اور موسیٰ اور مس ہارون نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مسکرانے لگے۔ موسیٰ نے سوچا مس امتیاز کے اندر واقعی ایک فنکار

چھپا بیٹھا ہے۔ اس نے مس امتیاز کی اس خواہش کا احترام کیا۔ اور جلد از جلد بڑے سائز کے دو فریم اسے پیش کرنے کی ہامی بھر لی۔

"آج موسٰی صاحب بڑے موڈ میں ہیں" مس ہارون نے پُرمذاق لہجے میں مس امتیاز سے کہا۔ آج تو تم جو مانگو موسٰی صاحب انکار نہیں کریں گے۔ کچھ اور مانگو؟" مس ہارون کھلکھلا کر ہنسیں اور مس امتیاز نے شرما کر گردن جھکا لی۔ اور پھر کافی دیر تک مس ہارون کو تیکھی نگاہوں سے گھورتی رہی جیسے وہ اس کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں امتیاز!۔ ابھی پچھلے دنوں لڑکیوں کی بھری محفل میں تم نے فخریہ کہا تھا کہ موسٰی ایک اچھے دوست ہیں۔ اور پھر اس میں برائی بھی کیا ہے۔ موسٰی اپنے آپ کو بہترین دوست ثابت کرنے کی جان توڑ کوشش بھی تو کر رہا ہے؟" مس ہارون نے ایک قہقہہ لگایا۔ اور موسٰی بے چین ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"عورت اور مرد میں دوستی نہیں ہو سکتی مس ہارون!" موسٰی نے بُجھے بُجھے لہجے میں کہا "یہ ہمارا معاشرہ ابھی اس بوجھ کو نہیں سہار سکتا۔ مرد اور عورت ایک دوسرے کے لئے کتنے مخلص اور نیک نیت کیوں نہ ہوں۔ شکوک و شبہات کا ہدف بن کر ہی رہتے ہیں۔ دراصل ہمارا معاشرہ بذاتِ خود غلاظت کا ڈھیر ہے اور اس گندگی کے ڈھیر میں گوہر پنپ ہی نہیں سکتے۔"

"ہاں یہ تو ہے" مس ہارون نے اچانک سنجیدگی اختیار کی۔ اور کچھ

دیر بالوں میں انگلیاں پھیرتی بے مقصد خلا میں گھورنے لگی۔ "میں تو مذاق کر رہی تھی امتیاز! بُرا تو نہیں مان گئیں؟" مس ہارڈن نے امتیاز کی طرف دیکھا جیسے اپنی بات پر بے حد نادم ہو۔

"نہیں" مس امتیاز نے مسکرا کر جواب دیا۔ "میں تو اب بھی کہتی ہوں موسیٰ صاحب ایک اچھے دوست ہیں۔ مجھے ان کی دوستی پر فخر ہے۔" مس امتیاز بلاکم و کاست دل کی بات زبان پر لے آئی۔ اور موسیٰ مارے فخر کے اپنے آپ میں سکڑ کر رہ گیا۔ اس کا دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ پھر اس نے محجوب نگاہ اٹھا کر مس امتیاز کی طرف دیکھا۔ اور اسے اس کی باتوں کے ترازو میں تولنے لگا۔ مس امتیاز کے چہرے پر کھنڈی ہوئی سچائی کی عبارت پڑھ کر موسیٰ دل ہی دل میں بے حد مرعوب ہوا۔ ایک سانولی سلونی، موٹی اور قد سے بدصورت لڑکی کے سینے میں کتنا خوبصورت دل دھڑک رہا تھا۔ موسیٰ نے چاہا آگے بڑھے اور مس امتیاز کے ہاتھ کو عزت واحترام سے بوسہ دے دے لیکن احساس کمتری میں مبتلا وہ کرسی پر بیٹھا کسمساتا رہ گیا۔ پھر اس نے مس ہارڈن کی طرف دیکھا جو تذبذب میں مبتلا نادیدہ حرکتیں کرتی طنز یہ انداز میں مسکرا رہی تھی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کی آنکھوں میں عجیب قسم کی چمک بھی پیدا ہو گئی تھی۔ اور موسیٰ دل تھام کر رہ گیا۔ چائے سے فارغ ہو کر وہ واپس اپنے کمرے میں آیا۔ مس امتیاز کی باتیں رہ رہ کر اس کے ذہن کو جھنجھوڑنے لگیں۔ اس کی نگاہوں میں امتیاز کا رتبہ اور بلند ہو گیا لیکن وہ کسی صورت مس ہارڈن کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

کہ اس میں ایک عجیب قسم کی کشش تھی۔ اسے دیکھ کر موسٰی اپنے آپ کو اس پر قابو نہ رکھ پاتا تھا۔ کچھ بھی ہو وہ درمیانی راستہ اختیار کرے گا۔ وہ سوچنے لگا۔ مس ہارڈن کے ساتھ مس اشیانہ سے بھی حتی الوسع دوستی نبھائیگا۔

آج اسے ڈاکخانہ سے سابقہ ملازمت کی پنشن وصول کرنی تھی۔ کوئی آدھ گھنٹہ ضروری کام سے نبٹ کر وہ ناظم صاحب کے دفتر گیا اور اجازت لیکر سیدھے بس سٹاپ پر پہنچا۔ ڈاکخانے پہنچ کر اس نے دیکھا پنشن وصول کرنے والوں کی ایک لمبی قطار کھڑی تھی۔ مجبور ہو کر وہ ڈاکخانے کی کنٹین میں گھس گیا اور وقت گزارنے کے لئے ایک میز پر بیٹھ کر چائے پینے لگا۔ بوڑھے فوجی پرانے وقتوں کی باتیں دہرا رہے تھے اور موسٰی دل ہی دل میں کڑھ رہا تھا۔ دراصل وہ سوچنے لگا اسے پنشن نہیں ملنی چاہیئے کہ وہ اب بھی جوان تھا اور محنت مزدوری کر کے اپنا اور بال بچوں کا پیٹ پال سکتا تھا۔ پنشن تو ایسے ہی لوگوں کو ملنی چاہیئے۔ اس نے گردونواح میں نگاہ دوڑاتے سوچا۔ کہ یہی معذور اور عمر رسیدہ لوگ فی الحقیقت پنشن کے حقدار تھے۔ اپنے آپ کو ان چندھیائی ہوئی آنکھوں اور لاٹھی ٹیکتے بوڑھوں میں گھرا ہوا پا کر اسے یوں لگا جیسے وہ خود بھی وقت سے بہت پہلے بوڑھا ہو گیا ہو۔ حالانکہ ابھی اس کی عمر محض چھتیس برس تھی گو اس کی کنپٹی کے بال قدرے سفید ہو گئے تھے۔ لیکن اس کے چہرے پہ اب بھی سرخی دوڑ رہی تھی۔ اور قویٰ میں توانائی جوں کی توں قائم تھی۔ حال ہی میں ایک دوست نے اس سے کہا تھا کہ اس کی کنپٹی کے سفید بالوں

سے اس کے چہرے پر وقار آ گیا ہے اور وہ پہلے سے کہیں زیادہ چاق چوبند، پھرتیلا اور جوان دکھائی دیتا ہے۔" اور یہ حقیقت بھی ہے" اس نے اپنے آپ کو تسلی دی۔ "شادی کئے دس ہی برس تو گذرے ہیں۔ چار بچوں کا باپ بن جانا تو بڑھاپے کی سند نہیں۔ یورپ میں تو مرد چالیس برس کی عمر کے بعد شادیاں کرتے ہیں"

سوچتے سوچتے اس کا دھیان مس ہارون اور مس امتیاز کی طرف چلا گیا کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اسے بوڑھا سمجھ کر اس کا مذاق اڑا رہی ہوں۔

"اچھے محاسب ہو!" اس نے اپنے آپ پر طنز کیا۔ دنیا کے حساب کتاب میں ایسے منہمک ہو کہ تم سے اپنا محاسبہ بھی نہیں ہو سکتا۔ مجھے سوچ سمجھ کر اور احتیاط سے کام لینا چاہیئے۔" اس نے دفتر کے عملے کے ساتھ اپنے رویے پر نظر ثانی کی اور پھر اپنے آپ کو محتاط رہنے کی تلقین کر کے کینٹین سے باہر نکل آیا۔ اور پنشن وصول کرنے کھڑکی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کا نام پکارا گیا۔ بل پر دستخط کر کے اس نے پنشن وصول کی اور پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ڈاکخانے سے باہر آ کر ٹیکسی کے لئے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ خاصی دیر ہو گئی تھی۔ اور پھر آج اس کی جیب میں "مفت کا مال" اچھل رہا تھا اس لئے بس میں سفر کرنا آج اس نے کسر شان سمجھا۔ ایک خالی ٹیکسی زنّاٹے بھرتی اس کے سامنے گزر گئی۔ اس نے زور کی ہونک لگائی۔ "ٹیکسی!" ڈرائیور نے بریک لگائی۔ چیختی ٹیکسی کچھ فاصلے پر رک گئی۔ اور موسٰی لپک کر ٹیکسی میں بیٹھ گیا

پونے ایک بجے وہ دفتر پہنچا۔ ابھی اس نے کام شروع ہی کیا تھا۔ کہ مس ہارون اس کے دفتر میں بلائے ناگہانی کی طرح آدھمکیں۔

"آپ کہاں چلے گئے تھے مسٹر؟ میں آپ کو کافی دیر سے ڈھونڈتی رہی ہوں"

مس ہارون نے افسرانہ موڈ میں موسیٰ سے سوال کیا۔ موسیٰ نے مسکرا کر جواب دیا۔

"بوڑھا آدمی پنشن لینے گیا تھا۔"

"پنشن؟۔ کیا آپ کو پنشن بھی ملتی ہے؟۔ لیکن مسٹر موسیٰ؟۔ آپ تو بوڑھے نہیں آپ کو کیسے پنشن مل رہی ہے؟"

"میں سابق فوجی ہوں مس ہارون! حکومت نے مجھے اپنی سابقہ ملازمت کے اعتراف میں پنشن عطا کر رکھی ہے۔ اور ظاہر ہے پنشن ان لوگوں کو ملتی ہے جو بوڑھے ہو جاتے ہیں۔

"لیکن آپ تو بوڑھے قطعاً دکھائی نہیں دیتے۔ کہیں ہم پر رعب جمانے کو تو یہ حربہ نہیں استعمال کر رہے؟ موسیٰ صاحب! مرد اس وقت تک بوڑھا نہیں ہوتا جب تک اسے اپنے بڑھاپے کا احساس نہ ہو جائے۔ اور آپ تو ماشاء اللہ بالکل جوان ہیں۔ اب آئندہ آپ کے منہ سے اپنے لئے "بوڑھے" کا لفظ نہ سنوں"

"یہ حقیقت ہے مس ہارون! خیر، اس حوصلہ افزائی کا شکریہ"

"حوصلہ افزائی" مس ہارون نے ایک قہقہہ لگایا "یہ بھی خوب رہی۔ بندہ خدا!۔ آپ بالکل جوان ہیں کہو تو سرٹیفکیٹ لکھ دوں۔ ہاں۔ میں یہ پوچھ رہی تھی کہ وہ لائبریری کے لئے جو نئی کتابیں خریدی ہیں، ان کی ادائیگی ہو گئی؟"

"ادائیگی کیسے ہو مس ہارون! چیک بک خزانے کے صندوق میں پڑی ہے اور خزانہ آپ کی لائبریری میں بند ہے اور آپ کی لائبریری کی چابیاں آپ کے پاس رہتی ہیں۔ مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا کہ بار بار آپ سے لائبریری کھلوانے کو کہوں۔ اگر آپ ناظم صاحب سے بات کر لیں کہ خزانے کو اٹھا کر میرے دفتر میں رکھ دیا جائے تو آپ کو اس جھنجھٹ سے چھٹکارا مل جائے گا۔"

"جھنجھٹ کیسی موسیٰ صاحب! مجھے تو اس میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی یہ تو ایک فرض ہے جس کی ادائیگی ہم دونوں پہ لازم ہے۔ آپ چاہے دن میں سو مرتبہ مجھ سے لائبریری کھولنے کو کہیں مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ بلکہ میں تو اکثر لائبریری کی چابیاں آپ ہی کو سونپ دیا کرتی ہوں۔ مجھے آپ پر مکمل اعتماد ہے اور یقین بھی ہے کہ آپ میری کتابیں چرائیں گے نہیں۔ اچھا تو۔ پھر آپ آ رہے ہیں نا میرے دفتر میں۔ چابیاں لینے۔ ساتھ ہی ساتھ مس انتیا زبھی آپ کو کئی مرتبہ پوچھ چکی ہیں۔" مس ہارون نے کھلکھلا کر اپنی بات ختم کی اور موسیٰ اس کے بدن کے ہچکولے میں کھو سا گیا "آفت ہے آفت" موسیٰ نے اپنے دل میں سوچا۔ خدا خیر کرے۔

"کیا ٹکر ٹکر میرا منہ تکے جا رہے ہیں؟" مس ہارون نے چبھتی نگاہوں سے موسیٰ کی طرف دیکھ کر چوٹ کی اور موسیٰ بوکھلا کر بغلیں جھانکنے لگا۔

"صبح سے کام کو ہاتھ نہیں لگایا مس ہارون!" موسیٰ نے ٹالتے ہوئے کہا۔ "آج رہنے دیں۔ کل صبح حاضر ہوں گا۔"

"یہ نہیں ہو سکتا جناب!" مس ہارون نے بڑے میٹھے لہجے اور دلبرانہ

انداز میں ڈانٹ پلائی۔ آپ کو وقت نکالنا ہی ہو گا۔ میرا کام بھی آپ کے فرائض میں شامل ہے۔ اچھا تو میں آپ کو پندرہ منٹ کی مہلت دیتی ہوں۔ ورنہ یاد رکھیں جواب طلبی ہو جائے گی" یہ کہہ کر مس ہارڈن اٹھلاتی ہوئی چلی گئیں۔ موسیٰ عجیب مخمصے اور الجھن میں گرفتار ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ عورت کوئی گل کھلا کر رہے گی۔ اس نے اپنے دل میں سوچا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے جو ہونا ہے ہو کر رہے گا" اس نے اپنے آپ کو تسلی دی اور پھر چند منٹ کام میں دماغ کھپا کر اس نے جھنجلا کر سب کچھ جوں کا توں دھرا رہنے دیا۔ اور دھڑکتے دل سے مس ہارڈن کے دفتر میں داخل ہوا۔

"آپ تو اکیلی بیٹھی ہیں مس ہارڈن! مس امتیاز کہاں ہیں۔؟؟" موسیٰ نے مس ہارڈن کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔

"آجائیگی۔ گھبراتے کیوں ہو؟ کہو تو جا کر بلا لاؤں؟" مس ہارڈن نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھ کر جواب دیا۔

موسیٰ کو اپنے چہرے پر تمازت کی لہر دوڑتی محسوس ہوئی۔ پھر اس نے جھینپ کر گردن جھکالی۔

"آپ ہی نے تو کہا وہ مجھے پوچھ رہی تھیں اس لئے پوچھا ورنہ میرا کوئی اور مقصد تھا ہی نہیں۔"

"اچھا تو اب یہ بتائیں چائے پیئں گے یا کوکا کولا؟"

"کوکا۔ اور اس سردی میں؟۔ مس ہارڈن!۔ یا تو میرا دماغ کام نہیں کرتا۔ اور یا۔۔۔" "یا میں پاگل ہوں۔ کیوں ٹھیک ہے نا موسیٰ صاحب؟؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔ یقیناً میرا دماغ ہی چل گیا ہوگا۔ شائد میں جدید دور کے آداب سے واقف نہیں۔ بس آپ جو پلا دیں پی لوں گا۔"

"اور اگر وہ زہر ہوا تو؟"

"مجھے کسی سے کیا پرخاش ہو سکتی ہے جو کوئی مجھے زہر پلائیگی۔ ویسے ایک میٹھا زہر تو میں پی ہی رہا ہوں۔ جو آہستہ آہستہ میرے رو ئیں رو ئیں میں سرایت کر رہا ہے۔"

مس ہارون نے موسیٰ پر ایک گہری نگاہ ڈالی اور پھر مسکرا کر موضوع بدل دیا۔

"اس روز آپ کہہ رہے تھے کہ آپ کی بیوی بہت خوبصورت ہے یقیناً وہ آپ سے محبت بھی کرتی ہوگی۔"

"ہمارے معاشرے میں میاں بیوی میں محبت ہو یا نہ ہو، لشٹم پشٹم نباہ کئے جاتے ہیں کیا آپ نے اپنا ہونے والا شوہر خود پسند کیا ہے یا وہ آپ کے والدین کی پسند ہیں؟"

"پسند تو والدین ہی کی ہے۔ لیکن ۔ اب میں بھی انہیں پسند کرنے لگی ہوں۔"

"وہ آج کل کہاں ہیں؟"

"وہ سکھر میں انکم ٹیکس افسر ہیں۔ بہت جلد ان کا تبادلہ یہیں کہیں نزدیک ہونے والا ہے۔"

"آپ ان سے پردہ کرتی ہیں؟"

"پردہ؟ ۔ یہ بھی آپ نے خوب کہی ۔ جب میں آپ سے پردہ نہیں کرتی۔ جب دفتر اور دفتر کے باہر اتنے سارے مردوں سے پردہ نہیں کرتی تو

اپنے ہونے والے شوہر سے کیوں پردہ کروں؟ یہ سب دقیانوسی باتیں ہیں زمانہ بدل چکا ہے“

”تعجب ہے۔ آپ جب ہفتے کی شام گھر جانے کے لئے اٹیچی کیس اور برقعہ اپنے ساتھ لاتی ہیں تو میں یہی اندازہ کرتا ہوں کہ آپ مشرقی تہذیب اور رسم و رواج پر سختی سے قائم ہیں۔ آپ کے خیالات میں تضاد پایا جاتا ہے“

”گھر جب بھی جانا ہوتا ہے برقعہ اوڑھ کر جاتی ہوں لیکن یہاں جب اتنے سارے مردوں کے ساتھ مل جل کر کام کرنا پڑے تو برقعہ اوڑھنے کی روایت کیونکر نباہ سکتی ہوں کیا آپ پسند کرینگے کہ آپکی بچیاں جوان ہو کر میری طرح ملازمت اختیار کریں اور مردوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کو معیوب نہ سمجھیں؟

میں عورت کو گھر کی چار دیواری میں بند رکھنے کا قائل نہیں لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ عورتیں ایسے دفتروں میں کام کریں جہاں ہمہ وقت مردوں سے سابقہ پڑتا ہو چاہے وہ عورت میری بیوی ہو۔ بہن ہو یا میری بیٹی ہو“

”تو پھر آپ کو چاہیئے تھا کہ آپ خود بھی ایسے دفتر کی ملازمت قبول نہ کرتے جہاں ہماری جیسی بے باک اور بے شرم لڑکیاں کام کرتی ہیں۔ جو چیز آپ اپنے لئے پسند نہیں کرتے دوسروں کے لئے بھی پسند نہیں کرنی چاہیئے۔ ہم بھی کسی کی بہنیں اور بیٹیاں ہیں“

”میں نے تو آپ کو مجبور نہیں کیا مس ہارون! کہ آپ اس دفتر میں ملازمت کریں۔ اور پھر خدا شاہد ہے مجھے تو یہ علم نہیں تھا کہ جس محکمے میں ملازمت مل رہی ہے وہاں اتنی ساری لڑکیوں کی بھرمار ہوگی۔ بذاتِ خود میں ایسی لڑکیوں کو پسند نہیں کرتا جو یہاں سارا سارا دن ادھر ادھر مٹکتی پھرتی ہیں، مردوں کے جذبات

میں ہیجان کا موجب بنتی ہیں۔ نہ خود کام کرتی ہیں اور نہ کام کرنے دیتی ہیں"۔

"آپ کیا سمجھتے ہیں ہم یہاں مردوں کو لبھانے آتی ہیں؟ آپ کو اپنے گریبان میں جھانکنا چاہیئے موسیٰ صاحب! آپ بھی تو دو تین بچیوں کے باپ ہیں۔ کل آپ کی بچیاں بھی جوان ہو جائیں گی اور ہو سکتا ہے لوگ ان کی طرف ایسے ہی انگلی اٹھائیں جیسے آپ ہم پر اٹھا رہے ہیں۔ یہ طعنے آپ کو زیب نہیں دیتے مسٹر موسیٰ" مس ہاروڈن نے موسیٰ کو خشمگیں نگاہوں سے دیکھتے کہا۔

"مس ہاروڈن" موسیٰ نے بھی تنک کر ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "آپ نے خود اس بحث کو چھیڑا ہے اور میری رائے پوچھی ہے۔ میں لگی لپٹی رکھنے کا قائل نہیں۔ اگر آپ بے لاگ تبصرہ سننے کی روادار نہیں تو آپ کو ایسی کج بحثی سے گریز کرنا چاہیئے۔ میں اپنی رائے کا آپ محتاج ہوں۔ اور یہ تو محض آپ ایک کمزور عورت ہیں، اگر کوئی مجھے پھانسی کے تختے سے ڈرائے تو بھی نہ ڈروں۔ اگر آپ کو میری یہ کھری کھری باتیں ناپسند ہیں تو مجھے اپنے ہاں کبھی نہ بلایا کریں۔ میں یہاں ذلیل ہونے نہیں آیا"۔

موسیٰ کا پارہ ایک دم چڑھ گیا۔ اس کی کنپٹی کی رگ پھڑکنے لگی اور اس کی آنکھوں میں جیسے شعلے سے لپکنے لگے۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا اور کپکپاتا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا۔ لیکن پھر بھی اپنے برانگیختہ جذبات پر قابو نہ پا سکا۔ وہ کرسی پر سے یوں اچھل کر کھڑا ہو گیا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ ایک لحظے کے لیے مس ہاروڈن کے سامنے کھڑا ڈولتا رہا، پھر ایک قہر آلود نگاہ اپنے سامنے بیٹھی ہوئی اس کی طرف بے چین نگاہوں سے دیکھتی عورت پر

ڈال کر وہ کھٹاک سے دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔

"کاش! میں یہاں ملازم نہ ہوتا" وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھانے لگا میری گردن میں تین سو روپوں سے بنا ہوا طوقِ غلامی تو ہوتا۔ تو میں اسے اس تذلیل کا مزہ چکھا دیتا۔ ہونہہ! اپنے آپ کو فرشتہ سمجھتی ہے۔ جیسے میں کچھ جانتا ہی نہیں۔ اپنے گریبان میں جھانکیے! اپنے گریبان میں جھانکیے!!۔ رہ رہ کر مِس ہارون کی تلخ باتیں اس کے دماغ پر ہتھوڑے کی کاری ضربوں کی طرح لگنے لگیں۔ اپنے دفتر میں آ کر وہ دھڑام سے کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنے بال نوچتا بے مقصد خلاء میں کافی دیر تک گھورتا رہا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ موسیٰ حسبِ معمول دفتر آتا کہ اس سے فرار کا کوئی اور راستہ نہ تھا۔ شام تک اپنے کام میں مصروف رہتا۔ کسی کے پاس نہ جاتا بس اپنے کام سے کام رکھتا۔ اس کی روزمرہ کی کارگزاری میں بھی غیر معمولی اضافہ ہو گیا تھا۔ ناظم صاحب بھی اس کی محنت کو سراہنے لگے تھے۔ اس کے دفتر میں آنے کی کسی کو ممانعت نہ ہو سکتی تھی اور نہ ہی وہ کسی کو آنے سے روک ہی سکتا تھا۔ دفتر کے اکثر افراد اس کے پاس آتے اور باتیں کر کے چلے جاتے۔ وہ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتا لیکن اس کے باوجود بعض افراد ایسے بھی تھے۔ جو اس کی اتنی مصروفیت اور انہماک کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگے تھے خلافِ معمول اس کے دفتری اوقات میں اپنے دفتر ہی میں محبوس رہنے کو کچھ لوگ ہَوا دینے لگے تھے۔ اور یہ بھنک جب اس کے کانوں میں پڑی تو وہ جھلا اٹھا اور دندناتا ناظم کے دفتر میں اس وقت داخل ہوا جب مِس ہارون

اور مس امتیاز وہاں پہلے ہی سے براجمان تھیں۔ اس نے مس ہارڈن کے سراپا پر ایک قہر آلود نگاہ ڈالی اور پھر ناظم سے درخواست کی کہ وہ حاضری لگانے والا رجسٹر اس کے کمرے سے اٹھا دینے کی اجازت دے۔ کہ اس رجسٹر کی موجودگی اس کے کام میں حارج ہو رہی ہے۔ صبح کا کافی وقت لڑکیوں کی بے جا مداخلت سے ضائع ہو جاتا ہے اور وہ دلجمعی سے کام نہیں کر سکتا۔

ناظم نے ایک قہقہہ لگایا اور پھر کافی دیر تک اس کی موٹی توند پھولتی، سکڑتی اور سمٹتی رہی۔ مس ہارڈن اور مس امتیاز نے بھی ناظم کا ساتھ دیا۔ اور دیر تک کمرہ قہقہوں سے گونجتا رہا۔ ایک سنجیدہ بات کو ان سب لوگوں نے مذاق میں ٹال دیا۔ اور وہ جھلایا ہوا اپنا سا منہ لیکر بے نیل مرام لوٹ آیا۔ موسیٰ کے رویے میں اس اچانک تبدیلی کو خصوصی طور پر مس امتیاز نے بے حد محسوس کیا اور جب موسیٰ پیچ و تاب کھاتا اپنے کمرے میں آیا تو کچھ ہی دیر بعد ٹھک ٹھک کی آواز برآمدے میں سنائی دی۔ یہ آواز اس کے دفتر کے دروازے پر آ کر رک گئی۔ مس امتیاز نے دروازے کا دستہ گھمایا اور اندر داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اور آنکھوں سے خلوص جھلک رہا تھا۔ باتوں ہی باتوں میں اس نے کوشش کی کہ موسیٰ کے دل کا بھید جان سکے لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکی۔ وہ اپنے دل کا بھید کیسے بتاتا۔ جبکہ پوچھنے والی بھی ایک عورت ہی تھی اور اسی دفتر میں ملازم تھی۔

"معلوم ہوتا ہے آپ کو مجھ پر بھروسہ نہیں۔" مس امتیاز نے آخری حربہ استعمال کیا۔ جسے موسیٰ نے ہنس کر ٹال دیا۔ اس کے دل میں ایک تلاطم بپا تھا اور وہ

اپنے کمرے میں تنہائی چاہتا تھا لیکن مس انتیا نہ ٹلنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ مجبور ہو کر اس نے کاغذات سمیٹے، الماری کو تالا لگایا اور مس انتیا نہ سے ایک ضروری کام کا بہانہ کر کے دفتر سے باہر آگیا۔ وہ بے چاری چپ چاپ اس کے پیچھے پیچھے کمرے سے نکل آئی اور منہ لٹکائے اپنے کمرے کی جانب بڑھی۔

مس ہارون سے جھگڑے کے چند دن بعد ہی موسیٰ نے محسوس کیا کہ وہ بے مقصد ہی اس کے دفتر کے سامنے برآمدے میں کھڑی ہو جاتی ہے اور آتی جاتی لڑکیوں کو روک کر خواہ مخواہ انہیں باتوں میں الجھائے رکھتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کنکھیوں سے موسیٰ کی طرف بھی دیکھا کرتی ہے۔ موسیٰ اپنے کمرے کے شیشے والی دیوار کے اس پار مس ہارون کو دیکھ کر سیخ پا ہو جاتا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ لحظہ بھر کے لئے بھی اس کے متعلق سوچے لیکن اس نے تو جیسے اس کے اعصاب پر سوار ہونے اور اسے دق کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ وہ دل مسوس کر رہ جاتا یہ کیسی بے بسی تھی کہ وہ اسے اپنے دفتر کے سامنے کھڑے ہونے سے نہیں روک سکتا تھا شائد اس لئے کہ مس ہارون اپنے آپ کو نائب ناظم سے کم نہیں سمجھتی تھی اور موسیٰ ایک معمولی محاسب تھا۔ ملازمت کے قاعدے کی رو سے موسیٰ اس کے ماتحت کام کر رہا تھا۔ جہاں وہ موسیٰ کے ہر معاملے میں مداخلت کرنے کی مجاز تھی وہاں موسیٰ بے بس و لاچار تھا۔

دوپہر کو جب موسیٰ اپنے کام میں مصروف تھا۔ اسے مس ہارون اور

امتیاز کے بلند بانگ قہقہے سنائی دیئے جو اس کے دفتر کے سامنے برآمدے میں گذرتی ہوئی اسٹینوں ہی کی ہمدمیں چہلیں کر رہی تھیں۔ مس ہارون کی اونچی ایڑی کی جوتی کی ٹھک ٹھک کی آوازیں ٹھیک اس کے دماغ پر لگ رہی تھیں۔ نہ سوچتے ہوئے بھی وہ مس ہارون کے بارے میں سوچنے لگا۔ اتنے میں اچانک اس کے کمرے کا دروازہ ایک زوردار جھٹکے سے کھلا اور پھر آپ ہی بند ہو گیا اس کے بعد مس ہارون کا نقرئی قہقہہ شیشوں کی دیوار سے ٹکرانے لگا۔ وہ دونوں بدستور اس کے کمرے کے سامنے کھڑی ہنسی مذاق کر رہی تھیں۔ یکبارگی موسیٰ کے دل میں آیا کہ وہ باہر نکل کر مس ہارون سے باز پرس کرے اور بتائے کہ وہ اس کی بے جا مداخلت سے عاجز آچکا ہے لیکن وہ دل پر جبر کئے اپنی میز پر جھکا کام کرتا رہا۔

اسی روز دوپہر ڈھلے جب وہ کنٹین میں کھانا کھا کر اپنے دفتر کی طرف آرہا تھا تو دو تین ریڑھے نئے فرنیچر سے لدے ادارے کے سامنے آکر رک گئے۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد فرنیچر کا ٹھیکیدار مس ہارون کے ساتھ آتا دکھائی دیا۔ اتنے میں یہ خبر کہ ادارے کا نیا فرنیچر تیار ہو کر آگیا ہے سب خواتین و حضرات میں پھیل گئی اور وہ گروہ در گروہ فرنیچر کے ارد گرد منڈلانے لگے اور ایک ایک میز اور کرسی پر اپنی اپنی پسند کا نشان لگانے لگے۔ موسیٰ بے تعلق سا ایک طرف کھڑا تماشہ دیکھنے لگا۔ اتنے میں چپڑاسی نے آکر اُسے اطلاع دی کہ ناظم صاحب اسے دفتر میں بلا رہے ہیں۔ ناظم نے موسیٰ کو ہدایت کی کہ کوئی افسر اپنی مرضی کا فرنیچر منتخب نہیں کریگا۔ بلکہ مس ہارون تمام افسروں میں مساویانہ

ان کی تقسیم کرینگی اور اس کے پاس پہلے ہی سے فہرست موجود ہے۔ دیکھنا کوئی زیادتی یا دھاندلی نہ ہونے پائے۔" ناظم نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ مس ہاردن آدھمکی اور ناظم کو فہرست دکھانے لگی۔ "ہاں یہ بالکل ٹھیک ہے۔ مناسب تقسیم ہے۔" ناظم صاحب نے تائید میں سر ہلایا اور پھر موسیٰ سے مخاطب ہوا کہ وہ اس تقسیم میں مس ہاردن کا ہاتھ بٹائے۔ اس پورے ہفتے میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس کا سامنا ایک بار پھر مس ہاردن سے ہو رہا تھا۔ اس نے سرد مہری سے مس ہاردن کی طرف دیکھا اور اس کے پیچھے پیچھے بددلی سے باہر آگیا۔ تھوڑی دیر بعد چپڑاسیوں کی مدد سے فرنیچر کی تقسیم شروع ہوئی۔ کرسیاں نہایت آرام دہ اور گدیلیوں والی تھیں۔ جن کی ٹانگوں میں گراریاں لگی ہوئی تھیں۔ چپڑاسیوں کو اٹھانی نہیں پڑ رہی تھیں بلکہ وہ انہیں کھینچ کھینچ کر دفتروں میں پہنچا رہے تھے۔ سب سے آخر میں مس ہاردن نے میز اور کرسیاں اپنے دفتر میں سجائیں۔ آخری کرسی وہ خود ہی کھینچتی اپنے دفتر لے جانے لگی۔ اچانک اس نے مڑ کر موسیٰ کی جانب دیکھا اور مسکرا کر کہا۔

"اے مریض! کرسی پر بیٹھو۔ میں تمہیں ہسپتال لے چلوں۔"

"یہ آپ نے نرس کے فرائض کب سے سنبھال لئے ہیں۔ اور پھر میں بیمار کب سے ہوا۔ میں تو ٹھیک ٹھاک ہوں" موسیٰ نے تنک کر جواب دیا۔

"پتہ نہیں پہلے بیمار تھے یا نہیں۔ لیکن اب کچھ دنوں سے بیمار دکھائی دیتے ہو۔ تمہیں اپنا علاج کرانا چاہیئے۔"

"شکریہ مس ہاردن! آپ پریشان نہ ہوں۔ میں ٹھیک ٹھاک ہوں"

"اگر تم بیمار نہ ہوتے تو اتنے سراسیمہ اور بدحواس دکھائی نہ دیتے۔ اپنی صورت دیکھی ہے آئینے میں جیسے برسوں کے بیمار ہو۔ اچھا بیٹھو کرسی پر۔۔۔ میں تمہیں ہسپتال لے چلوں۔ چہ۔ چہ۔۔ بے چارے سے چلا بھی نہیں جاتا۔ کتنے تھکے اور اداس لگ رہے ہو۔"

"مس ہاردن!۔ اب میرا کام ختم ہو گیا ہے۔ اجازت ہو تو چلا جاؤں۔ میں آپ کی طرح بے کار تو نہیں۔ مجھے اور بھی بہت سے کام کرنے ہیں۔ اس شعبے کا ادنیٰ ملازم جو ٹھہرا۔"

"چہ۔ چہ۔ تبھی تو میں کہتی ہوں تم بیمار ہو۔ میں کہتی ہوں تمہیں کسی دلی ماہر نفسیات سے مشورہ لینا چاہیے۔ وہ ایک گھنٹے میں تمہارا دماغ درست کردیگا۔"

"میں اپنے آپ کو اچھی طرح جانتا ہوں مس ہاردن!۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میں بیمار نہیں۔ اور آپ سے بھی درخواست کرتا ہوں کہ میری حالت پر رحم کیجئے مجھے اور پریشان نہ کیجیے۔ کیا آپ خوش ہونگی کہ میں اس لگی لگائی روزی پر آپ لات مار دوں۔ یاد رکھیں اس کی ذمہ داری صرف آپ پر عائد ہوگی۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو؟ ہوش میں تو ہو؟؟"

"ہاں میں ہوش میں ہوں مس ہاردن! بس آپ سے اتنا خواستگار ہوں کہ میرے جذبات سے کھیلنے کی کوشش نہ کریں۔ مجھے میرے حال پہ چھوڑ دیں۔"

"میں تمہارے جذبات سے کھیل رہی ہوں؟ موسیٰ!۔ یہ کیا کہہ رہے ہو؟۔ ممسٹر!۔ اپنی زبان کو لگام دو۔ تم اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو؟۔ چھوٹا منہ اور بڑی بات!۔ ہونہہ!"

مس ہارون! میری آواز کانپ رہی ہے۔ اندازہ لگایئے آپ میرے جذبات کو کتنی ٹھیس پہنچا رہی ہیں۔ اس سے پہلے کہ میں بے قابو ہو جاؤں۔ آپ۔ آپ ۔ مجھے مجبور نہ کریں۔ کہ ۔"

"مجھے دھمکی دے رہے ہو؟ جانتے ہو۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟"

"نتیجہ!۔ نتیجہ!۔ آپ خود ہی مجھے گستاخی پر مجبور کر رہی ہیں۔ میں آپ کا ذاتی ملازم نہیں مس ہارون!۔ اس جامعہ کا ملازم ہوں۔ اس ادارے کا ملازم ہوں جس کی آپ بھی ملازم ہیں۔ میں چاہوں تو آج ہی بلکہ ابھی اس جوئے کو اتار پھینک سکتا ہوں۔ میں جتنا آپ کا لحاظ کر رہا ہوں آپ اتنی ہی سر پر چڑھ رہی ہیں۔ آخر میں بھی تو انسان ہوں۔ اس توہین آمیز رویئے کو کب تک برداشت کر سکتا ہوں۔ میں تو ایک ہفتے سے برابر یہ کوشش کر رہا ہوں کہ آپ سے بات تو درکنار، آپ کا سامنا تک نہ ہونے پائے اس وقت بھی پہل آپ ہی کی طرف سے ہوئی ہے۔ اس چخ چخ کی بناء آپ ہی نے ڈالی ہے۔"

"آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے۔ بات بے بات الجھنے لگتے ہو۔ بے سوچے سمجھے الٹی سیدھی ہانکنے لگتے ہو۔ اس روز بھی تم ناراض ہو کر چلے گئے تھے۔ آخر تمہارا موڈ کب تک درست ہوگا؟" یا ہمیشہ ایسے ہی برہم رہو گے۔

لوگ کیا سمجھیں گے۔ کبھی تو اتنے بے تکلف تھے۔ اور اب یہ حال ہے کہ ہفتے بھر سے اپنی شکل تک نہیں دکھائی۔ اچھا چلو۔ میں ہی ہار مان لیتی ہوں۔ اب غصہ تھوک دو۔" یہ کہہ کر مس ہارڈن مسکرا دی اور بڑی چاہت سے موسیٰ کی طرف دیکھنے لگی۔ موسیٰ نے نگاہ پھیر لی۔ وہ ان قاتل نگاہوں کی تاب کہاں لا سکتا تھا۔ آخر اس کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کی تنی بھوئیں آپ ہی آپ ڈھیلی پڑ گئیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک عجیب خواہش نے اس کے دل و دماغ میں ہلچل مچا دی۔ "پاگل پن کی انتہا!" اس نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو ملامت کیا اور منہ پھیر کر چپکے چپکے مسکرانے لگا۔ "تو پھر آ رہے ہو نا۔ میرے دفتر میں اب تو صلح ہو گئی ہے۔" مس ہارڈن کے شہد آگیں ہونٹ دوبارہ ہلے ادھر موسیٰ اسے ٹکر ٹکر دیکھتا مسکراتا رہا۔

"کچھ منہ سے بھی پھوٹو موسیٰ کے بچے!" مس ہارڈن نے اسے تیکھی نگاہوں سے دیکھتے کہا۔

"صلح تو ہو گئی ہے مس ہارڈن! لیکن وعدہ کرو آئندہ مجھے ستاؤ گی نہیں۔ آپ کا کیا بھروسہ ہے۔ بڑے لوگوں کے مزاجوں سے خدا بچائے۔ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ آپ مجھے آئندہ پریشان نہیں کریں گی"

"بس اب زیادہ نہ بنو۔ سیدھے میرے دفتر آؤ نہیں تو جرمانہ کر دوں گی"

"تو آپ چائے منگوائیں۔ میں آرہا ہوں"۔ موسیٰ کو یوں لگا جیسے تپتی دوپہر کو میلوں مسافت طے کرکے اچانک ایک مرغزار میں داخل ہوگیا ہو اور ٹھنڈے میٹھے چشمے سے خوب سیر ہوکر پانی پی لیا ہو۔ اس کا جی چاہا قلا بازی لگائے۔ چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا دے اور۔ اور۔ مس ہارون کو اپنی بانہوں میں مضبوطی سے جکڑ لے۔ جانے یہ خواہش کتنے دنوں سے اس کے لاشعور میں مچل رہی تھی۔ اور آج اچانک باہر آگئی تھی۔

"ارے ہاں یاد آیا مس ہارون! آج میں ایک گھنٹہ پہلے چھٹی کروں گا مجھے ایک بیمار دوست کی عیادت کے لیے ہسپتال جانا ہے"۔ اس نے دلی جذبات کو چھپاتے کہا۔

"جی نہیں۔ چھٹی نہیں مل سکتی۔ آج تو تمہیں میری کلاس کے ختم ہونے تک میرا انتظار کرنا ہوگا۔ میری وہ ہاسٹل والی سہیلی شبنم آرہی ہے۔ جو تم سے بنگالی میں باتیں کرنا چاہتی ہے" مس ہارون کرسی کھینچتے کھینچتے رک گئی اور موسیٰ سے مخاطب ہوئی۔ کرسی پر جھکی ہوئی وہ کتنی اچھی لگ رہی تھی موسیٰ نے چاہا اسے پیچھے سے دبوچ لے۔ اور اسے زور زور سے بھینچے۔

"لیکن میں تو بنگالی نہیں جانتا مس ہارون! میں اس سے بنگالی میں کیسے گفتگو کروں گا۔ اور پھر سچ کہتا ہوں۔ میرا دوست بہت بیمار ہے اور اس پرائے شہر میں اس کا میرے سوا اور کوئی بھی تو جاننے

والا نہیں۔ وہ میری راہ دیکھ رہا ہوگا۔ آپ اپنی سہیلی سے کہدیں کہ وہ کسی اور دن آئے۔ لڑکیوں سے باتیں کرنے میں تو مجھے بڑا مزہ آتا ہے۔" موسیٰ مسرت آمیز لہجے میں چہکا۔ آج اس کا نہ اپنے آپ پر قابو تھا اور نہ ہی زبان کو لگام دے سکتا تھا۔ مس ہارون نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا اور کرسی کھینچتے طویل برآمدے میں مٹکتی لچکتی اپنے دفتر کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔

آج موسیٰ اداس تھا۔ بے حد اداس! وہ سوچنے لگا "میں کتنا خود غرض ہوں۔ میرا دوست دِق کے عارضے میں مبتلا ہے۔ اور میں اسے یوں بھول چکا ہوں۔ جیسے اس کا میرے سے وجود ہی نہ ہو۔" بوجھل بوجھل قدموں سے مس ہارون کے دفتر میں آکر وہ چپ چاپ کرسی پر بیٹھ اور میز پر سے "نیوز ویک" کا رسالہ اٹھا کر اس کے ورق الٹنے لگا۔

"کتنی بُری عادت ہے۔ موسیٰ کے بچے! میرے دفتر میں جب بھی آتے ہو کوئی نہ کوئی پرچہ یا کاغذ اٹھا کر پڑھنے لگتے ہو۔ اے۔ یہ میرا دفتر ہے تمہارے مطالعے کا کمرہ نہیں سمجھے۔ تم یہاں مطالعے کے لئے نہیں مجھ سے باتیں کرنے آتے ہو" مس ہارون نے اس کے ہاتھوں سے رسالہ چھینتے بڑے پیار اور لبھانے والے انداز سے کہا۔ لیکن موسیٰ بدستور گم سم بیٹھا اسے خالی خالی نگاہوں سے گھورتا رہا۔ وہ اس کی طرف دیکھ تو رہا تھا لیکن اس کا دھیان آج اپنے بیمار دوست میں اٹکا ہوا تھا۔

"کیا بات ہے موسیٰ!۔ آج کچھ پریشان سے دکھائی دیتے ہو۔

کیا بال بچے یاد آ رہے ہیں؟" مس ہارون نے اسے چبھتی نگاہوں سے گھور کر دیکھتے کہا۔ موسٰی کے لبوں پر پھیکی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور پھر اپنے خیالوں میں کھو گیا۔

"آخر بات کیا ہے۔ کچھ کھو گئے یا چپ کا روزہ رکھ کر آئے ہو؟" مس ہارون نے اُسے پیار سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"کل میں اپنے دوست کی عیادت کیلئے ہسپتال گیا تھا۔ موسٰی اُداس لہجے میں رک رک کر کہنے لگا۔"

"میرا دوست جو یرقان کے علاج کے لئے ہسپتال میں داخل ہوا تھا۔ دق کے عارضے میں مبتلا ہو چکا ہے۔ اور دق بھی تیسرے درجے میں داخل ہو چکا ہے۔"

"اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے موسٰی! اب تو دق بھی ویسے ہی مرض ہے جیسے ملیریا، بخار یا نمونیہ۔ دنیا میں طب نے کافی ترقی کر لی ہے۔ گھبراؤ نہیں تمہارا دوست جلد تندرست ہو جائے گا"

"سوچتا ہوں اسکے والدین کو اطلاع کر دوں۔ ایک مدت ہوئی وہ گھر والوں سے قطع تعلق کر کے یہاں چلا آیا تھا۔ تب سے اس نے گھر والوں کو کبھی خط لکھا ہے اور نہ انہیں کبھی صورت دکھائی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا کروں کیا نہ کروں۔"

"بس اس کے والدین کو خط لکھ دو۔ کوئی کسی کا روگ بانٹ نہیں سکتا موسٰی! جس پر آئی ہے وہی بھگتتا ہے۔ تمہارا فرض اتنا ہی ہے کہ گاہے گاہے اس کی خبر گیری کر لیا کرو۔ روپے پیسوں کی تنگی ہو تو میں ادھار دے سکتی ہوں۔"

"وہ بڑا خود دار ہے مس ہارون!۔ وہ میری مدد کبھی قبول نہیں کرے گا۔ اندازہ

لگاؤ کبھی کئی دن اس کی جیب خالی رہتی ہے لیکن مجھ سے کبھی نہیں مانگتا۔ ایک بات پوچھوں؟"

"ہاں ہاں۔ ایک نہیں کئی باتیں پوچھو۔ باتیں کرنے ہی کو تو ہم یہاں ایک ساتھ بیٹھے ہیں"

"کبھی میں بیمار پڑا تو آپ میری عیادت کو آئیں گی؟"

"کیوں نہیں۔ بیمار ہو کر تو دیکھو۔ میں اور امتیاز دونوں تمہاری عیادت کو صبح و شام جایا کریں گی۔ اور میرا خیال ہے مس مخدوم بھی پھلوں سے لدی ہوئی اپنی گاڑی میں تمہاری عیادت کو آئیگی۔ آزمائش شرط ہے۔" مس ہارون نے ہنس کر کہا۔ موسیٰ کو اس کی ہنسی ایک آنکھ نہ بھائی۔

"میں اس وقت مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں مس ہارون! میری باتوں کو مذاق میں نہ ٹالئے" موسیٰ نے سنجیدگی سے لقمہ دیا۔ لیکن مس ہارون پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا وہ بدستور ہنسے جا رہی تھی۔ آخر موسیٰ سے اور برداشت نہ ہو سکا۔ اس نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"میں جاتا ہوں۔ جب آپ کی ہنسی تھم جائے تو مجھے بلا لینا۔"

"اے موسیٰ کے بچے!۔ بیٹھو!۔ ورنہ میں ناراض ہو جاؤنگی۔ تمہارا کیا خیال ہے، صرف تم ہی ناراض ہو سکتے ہو۔ میں ایک دفعہ بگڑ گئی تو پھر ساری زندگی میری باتوں کو ترسو گے۔ سمجھے"

"آپ کو بگڑنا آتا ہی نہیں مس ہارون!" موسیٰ کو اس نوک جھونک میں لطف آنے لگا۔ اور مسکرا کر دوبارہ بیٹھ گیا۔ اس کے دل میں پھر میٹھی سی گدگدی ہونے لگی اور ایک انجانی سرخوشی نے سر اٹھایا۔ کہیں میں مارے خوشی کے پاگل نہ ہو جاؤں۔ وہ

سوچنے لگا۔ اپنے دوست کی بیماری اس کے ذہن سے یوں محو ہو گئی جیسے اس کا کہیں وجود ہی نہ تھا مس ہارون کی آنکھیں، اور اس کی دھیمی دھیمی نرم نرم باتوں کی مٹھاس کتنی دلآویز تھی۔ وہ جان گیا تھا۔ بلکہ اب تو اُسے یقین ہو گیا تھا کہ مس ہارون اُس سے محبت کرتی ہے۔ وہ اس دن کا انتظار کرنے لگا جب مس ہارون برملا اظہارِ محبت کریگی:" کیا یہ ممکن ہے؟ کیا یہ ممکن ہے؟" اس کے دل و دماغ میں ایک سرد جنگ چھڑ گئی۔ ایک دل اس کے خیال کی تائید کرتا اور دوسرے لمحے اس کے جذبات پر اداس پڑ جاتی۔ جانے کون اسکے دل میں بیٹھا اس کے اس خوش آئند خیال کا مذاق اُڑا رہا تھا۔ اس کی نگاہیں مس ہارون کے خوبصورت چہرے پر گڑی ہوئی تھیں جبکہ وہ خود کہیں اور کھو گیا تھا۔ وہ اپنے خیال میں ایک ایسے پیکر سے محو گفتگو تھا۔ جس کی شکل ہو بہو مس ہارون سے ملتی جلتی تھی۔ لیکن جو سامنے بیٹھی ہوئی عورت سے قدرے مختلف بھی تھی۔ وہ جس خیالی پیکر سے راز و نیاز کی باتیں کر رہا تھا وہ اس پر جان چھڑکتی تھی۔ وہ اس کی اپنی تھی۔ وہ جب چاہتا ہاتھ بڑھا کر اُسے چھو سکتا تھا۔ اُس کے ریشمی بالوں میں انگلیاں پھیر سکتا تھا۔ اور اس کے رس بھرے ہونٹوں پر محبت کی مہر ثبت کر سکتا تھا۔ لیکن جو عورت اس کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ کیا چاہتی تھی۔؟ یہ وہ آج تک نہ جان سکا۔ ایک معمہ بن کر وہ اس کے اعصاب پر چھا گئی تھی۔ وہ اتنے نزدیک ہو کر بھی کتنی دور بیٹھی تھی۔ فاصلہ کتنا طویل ہو گیا تھا۔ وہ اس سے اتنی دور تھی کہ وہ ہاتھ بڑھا کر اسے نہیں چھو سکتا تھا۔ اُسے یوں لگتا تھا۔ جیسے دو ہاتھ کا فاصلہ دو سو میل سے بھی لمبا ہو گیا تھا۔ جیسے وہ اس کی شیریں گفتگو

ٹیلیفون کے ذریعے سن رہا ہو۔ اور اس کی موہنی صورت وہ ٹیلیویژن کے پردے پر دیکھ رہا ہو۔!

اس نے چونک کر دیکھا۔ وہ عورت اب بھی اُس کے سامنے بیٹھی اُسے ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی اور تھوڑی دیر پہلے جس ہمزاد عورت سے وہ محوِ گفتگو تھا کب کی جا چکی تھی۔ اس کی پہنچ سے بہت دور جا چکی تھی۔ چپڑاسی کی اچانک مداخلت سے اس کے خیالات کا تانا بانا بکھر کر رہ گیا۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ چپڑاسی ٹرے میں چائے اور شامی کباب لئے کونے والی میز کی طرف بڑھ رہا تھا مس ہارون نے ہڑبڑا کر کہا۔ "ارے! میں نے تو چائے کا آرڈر نہیں دیا تھا۔ یہ چائے کس نے منگوائی ہے۔"

چپڑاسی نے ٹرے میز پر رکھدی۔ اور پھر مسکراتا چائے بنانے میں مصروف ہو گیا۔

"میں نے کہا ملازم حسین! میں نے چائے کا آرڈر نہیں دیا۔ تمہیں مغالطہ ہو گیا ہے۔ میں تو ابھی تھوڑی دیر پہلے مس امتیاز کے ساتھ چائے پی کر آئی ہوں۔ یہ بات کیا ہے۔ کچھ بتاؤ بھی؟"

"خاتون! آپ کو آم کھانے سے مطلب ہے یا پیڑ گننے سے۔ چائے کس نے بھیجی ہے۔ یہ بات آپ کے سوچنے کی نہیں۔ بس چپکی بیٹھ کر چائے نوش فرمائیں"۔ موسیٰ نے مسکرا کر مداخلت کی۔

"پھر بھی مجھے معلوم تو ہونا چاہیئے آخر وہ کون سخی ہے جس نے چائے کے ساتھ ساتھ شامی کباب بھی بھیجے ہیں۔ جب تک مجھے اس سخی کا نام معلوم نہ ہوگا میں چائے

کو ہاتھ نہیں لگاؤں گی" مس ہارون نام جاننے پر مُصر تھیں اور موسیٰ کو اس کی بوکھلاہٹ میں بڑا مزہ آرہا تھا اور جب چائے میز پر پڑی پڑی ٹھنڈی ہونے لگی تو مجبور ہو کر موسیٰ نے انکشاف کیا کہ چائے کا آرڈر اسی نے دیا تھا اور مس ہارون مفت کے مال پر یوں ہاتھ صاف کرنے لگی جیسے کئی وقتوں سے فاقہ ہو۔ اور پھر کباب کھاتے کھاتے ساتھ ہی ساتھ اپنے سامنے میز پر پڑے ہوئے چارٹ کا بھی مطالعہ کرنے لگی۔ موسیٰ نے جھپٹ کر چارٹ اس کے سامنے سے ہٹا کر کہا

"جب آپ مجھے کوئی کام نہیں کرنے دیتیں اور نہ ہی کچھ پڑھنے کی اجازت دیتی ہیں۔ تو آپ کو بھی کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میری موجودگی میں کوئی کام کریں۔ لائیے! یہ پنسل مجھے دیجیے۔"

"مس ہارون نے پنسل میز کی دراز میں چھپالی اور پیالی اٹھا کر چسکیاں بھرتی مسکرانے لگی۔

"معلوم ہوتا ہے آج آپ بدلہ اتارنے پر تلے ہوئے ہیں۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"کچھ بھی سمجھ لو۔ مس ہارون! میں تو اس بات کا قائل ہوں۔ اس ہاتھ دو۔ اس ہاتھ لو۔ اس معاملے میں منٹ وقفے کا قائل نہیں"

"خوب! یہ اطوار سیکھے کس سے؟"

"یہ سب کچھ مجھے ورثہ میں ملا ہے مس ہارون؟۔ میرے آباؤ اجداد بھی بڑے سخی اور مخیر تھے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے کیا میں کنجوس ہوں"

"کنجوس!۔ آپ تو مہا کنجوس ہیں مس ہارون!۔ اب اسی بات سے اندازہ

لگا ہے ۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ چائے کی ٹرے دیکھ کر کتنی پریشان ہو گئی تھیں"۔
مس ہارون آخری کباب کا آخری ٹکڑا نگلتے مسکرا پڑیں۔
"لیکن تم اطمینان رکھو۔ میں تمہاری باتوں میں نہیں آؤں گی۔ جتنی مرتبہ چاہو، چائے پلا کر دیکھو، میں ایک بار بھی بدلہ نہیں چکاؤں گی"۔
"ویسے مجھے آپ سے توقع بھی نہیں مس ہارون! میں جانتا ہوں ان تلوں میں تیل نہیں ہے۔ البتہ مس امتیاز کے بارے میں میرا خیال ہے وہ آپ سب سے زیادہ مہمان نواز ہے"
"تو پھر جاؤ نا اسی کے پاس جا کر بیٹھو اور اپنی مہمان نوازی کا ڈھنڈورا پیٹو۔ ارے میں تو بھول گئی۔ میں تمہیں بتاؤں موسیٰ! ۔ ہمارے دفتر میں اگر مہمان نوازی کا لطف حاصل کرنا ہے تو مس مخدوم کے پاس جاؤ۔ وہ تمہاری ایسی خاطر تواضع کرے گی کہ چاروں طبق روشن ہو جائیں گے۔ ذرا سر پہ ٹوپی رکھ کر جانا"۔ مس ہارون نے ایک قہقہہ لگایا اور، اور پہیوں والی کرسی میں جھکر لگانے لگی۔ پھر اچانک وہ رک گئی اور موسیٰ کی جانب ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے کہنے لگی۔
"کہو موسیٰ! ۔ ہمارا نیا فرنیچر پسند آیا؟"
"ہاں۔ اچھا ہے" موسیٰ نے بے دلی سے جواب دیا۔
"بچ ۔ بچ۔ بے چارے کو حصہ نہیں ملا نا۔ تبھی تو منہ بسورنے لگا ہے۔ چاہو تو میرے دفتر کا سب فرنیچر اپنے کمرے میں سجالو"۔
"جی نہیں شکریہ ۔ میں جس چیز کا اہل نہیں مجھے اس کی تمنا نہیں کرنی چاہیئے۔ جب بھی میں نے اپنے آپ کو ان چیزوں کا اہل ثابت کیا، آپ جیسی بہت سی

اہلِ کار انہیں میرے دفتر میں سجانے پر فخر محسوس کریں گی"

"بڑا مان ہے اپنے آپ پر"

"کیوں نہیں مس ہارون! یہ تو دنت وقت کی بات ہے۔ آج وقت آپ کے ساتھ ہے۔ کیا عجب کل یہی وقت میرا انعام بن جائے!"

"اف یہ مصیبت پھر نازل ہو گئی" مس ہارون نے بُرا سا منہ بنا کر چپڑاسی کو اپنے دفتر میں داخل ہوتے دیکھ کر کہا۔ "کیا بات ہے ملازم حسین؟" مس ہارون نے تیوری چڑھا کر چپڑاسی سے دریافت کیا۔

"آپ کو ناظم صاب بلا رہے ہیں میم صاب" چپڑاسی نے موسیٰ کی جانب گہری اور تشویش ناک نگاہوں سے دیکھتے مس ہارون کو جواب دیا۔

"اچھا۔ تم جاؤ۔ میں آتی ہوں"

اور جب چپڑاسی دفتر سے باہر نکل گیا تو مس ہارون تاگواری سے اٹھیں اور پرس اٹھا کر موسیٰ سے کہنے لگیں۔ "تم یہیں بیٹھے رہو۔ میں ناظم سے کھڑی کھڑی باتیں کر کے واپس آتی ہوں۔ اور دیکھنا اگر ٹلنے کی کوشش کی تو تمہارے حق میں اچھا نہ ہو گا"

"مجھے جانے دو مس ہارون! ناظم صاحب کو معلوم ہو گیا کہ میں کافی دیر سے آپ کے پاس بیٹھا رہا ہوں تو وہ شائد آپ کو کچھ نہ کہیں لیکن مجھ پر ضرور اس کا کوئی نہ کوئی عتاب نازل ہو جائے گا"

"بڑے ڈرپوک ہو۔ ناظم تو کیا ناظم کا باپ بھی تمہارا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ بیٹھے رہو۔ موسیٰ! بس میں ابھی آئی" مس ہارون نے دروازہ کھولا اور اپنے پیچھے دروازہ

بند کرتی برآمدے میں اونچی ایڑھی کی جوتی ٹھکٹھکاتی ناظم کے دفتر کی جانب چل پڑھی موسٰی اس کے جوتے کی ٹھک ٹھک کی آواز کافی فاصلے تک سنتا رہا۔ پھر اس نے میز پر سے رسالہ اٹھایا اور اس کی ورق گردانی کرتا مس ہارون ہی کے متعلق سوچنے لگا۔

آدھ گھنٹہ گذر گیا لیکن مس ہارون لوٹ کر نہ آئی۔ اکتاکر اس نے رسالہ میز پر پٹخ دیا اور کمرے میں بے مقصد چکر کاٹنے لگا۔ آخر جھنجھلا کر اس نے دروازہ کھولا اور برآمدے میں آکر کھڑا ہو گیا۔

"یہ بُری بات ہے۔" وہ سوچنے لگا۔ اس کی توجہ بٹ گئی تھی۔ اور دفتری کام میں تو اس کا دل ہی نہیں لگ رہا تھا۔ اسے اپنا ضمیر ملامت کرنے لگا کہ یوں اپنے کام سے غافل رہ کر وہ حرام کی روزی کھا رہا تھا۔ پھر وہ تیز تیز قدموں سے اپنے دفتر میں آیا اور بڑے انہماک سے دفتر کے دھندوں میں مصروف ہو گیا کام کرتے کرتے اُسے پھر مس ہارون کا خیال آگیا اور وہ یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ اس کی دوستی پر اسے نازاں ہونا چاہیئے یا متردد۔

کوئی ایک گھنٹہ بعد مس ہارون نے ایک زوردار جھٹکے سے اس کے کمرے کا دروازہ کھولا اور دروازے میں کھڑی کھڑی اسے شعلہ بار نگاہوں سے گھورنے لگی۔

"میں نے کیا کہا تھا تمہیں یاد ہے؟"

موسٰی نے نگاہ اٹھاکر اسے دیکھا اور پھر مسکراکر اپنا کام کرنے لگا۔ جیسے مس ہارون کی برہمی کوئی اہمیت ہی نہ رکھتی ہو۔ ٹھک ٹھک کرتی وہ چند قدم آگے بڑھی اور موسٰی کے ہاتھ سے قلم چھین لیا۔

"پہلے میری بات کا جواب دو" اس نے بناوٹی غصے میں موسیٰ کو مخاطب کیا۔
کچھ دیر موسیٰ اُسے ایک ٹک دیکھتا رہا۔ پھر مطمئن لہجے میں گویا ہُوا۔

"آپ کا رویہ قابلِ اعتراض ہے۔ مس ہارون! میں اس ادارے کا ملازم ہوں۔ اور اپنے فرائض سے غافل نہیں رہ سکتا۔ آپ تو گھنٹوں ناظم صاحب سے گپیں ہانکیں اور میں اکیلا بیٹھا کڑھتا رہوں۔ میں آپ کا زرخرید غلام نہیں۔ جو آپ کی بے جا جھڑکیاں بھی برداشت کروں"

یہ ٹکا سا جواب پاکر مس ہارون آپ ہی آپ نرم پڑ گئیں اور زیرِ لب مسکرانے لگیں۔

"میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟" مس ہارون نے کچھ اس اندازِ دلبرانہ سے سوال کیا کہ موسیٰ اپنی ہنسی نہ روک سکا۔ پھر دونوں ایک ساتھ کھلکھلا اٹھے۔

"آپ تو میرے لئے معمہ بنتی جا رہی ہیں۔ کبھی تو یوں رُعب گانٹھتی ہیں جیسے میں آپ کا ذاتی ملازم ہوں اور کبھی اتنی نرم پڑ جاتی ہیں کہ ــــ" موسیٰ نے چاہا کہ ہمت کر کے اپنا نامکمل فقرہ پورا کر دے اور اپنے دل کی بات زبان پر لے آئے "کہ بے اختیار پیار کرنے کو تڑپ اٹھتا ہوں" لیکن وہ اس سے آگے نہ بول سکا اور ردِ عمل جاننے کے لئے وہ ٹکر ٹکر مس ہارون کو تکنے لگا۔

"تمہارے مزاج کا بھی تو کوئی سُراغ نہیں ملتا موسیٰ! کبھی اتنی سی بات پر بگڑ اٹھتے ہو اور کبھی بڑی بڑی باتوں کو برداشت کر لیتے ہو" مس ہارون نے کرسی پر بیٹھتے برجستہ جواب دیا۔ "دراصل تمہارا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا اس سے پہلے کہ میں تمہاری برہمی کا وار سہوں، خود ہی حملہ کر دوں۔ اور

میرا حربہ صحیح استعمال ہُوا۔"

"ہم کیا اور ہماری بڑھی کیا۔ مس ہاردن! ہم تو آپ کے اشاروں پر ناچنے والوں میں سے ہیں۔ آپ جب چاہیں ہمارے کام میں مخل ہو سکتی ہیں۔ آپ جب چاہیں ہمیں ٹوک سکتی ہیں۔ پابند تو صرف ہم ہیں۔ ماتحت جو ٹھہرے۔ وقت کے غلام۔ آپ کے غلام اور حاکم وقت کے غلام!"

"اوہو۔ آج تو بڑی تلخ باتیں زبان پر آ رہی ہیں۔ خدا خیر کرے" مس ہاردن نے شوخی سے کہا اور پھر ہنسنے لگیں۔

"اچھا اب مہربانی کر کے آپ جائیے، تاکہ میں روزی حلال کر سکوں"

"تم کون ہوتے ہو مجھے یہاں سے نکالنے والے۔ تم اپنا کام جاری رکھو۔ میں بھی دیکھوں تم کچھ جانتے وانتے بھی ہو یا یونہی ہمارے محاسب بنے بیٹھے ہو"

"اچھا تو لاؤ۔ میرا قلم دے دو۔ کچھ کام کروں۔ دیکھو مس ہاردن! آپ ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔ آپ سے یہاں کوئی پوچھنے والا نہیں لیکن میں تو یہاں ہر ایک کا ماتحت ہوں۔ اور پھر میری کارگزاری کی تو باقاعدہ جانچ پڑتال ہوتی ہے ذرا سوچیئے تو آپ کی اس دخل در معقولات سے میرے کام میں کتنا حرج ہو رہا ہے"

"ہونہہ۔ بڑے آئے کام کرنے والے۔ جیسے میں کچھ جانتی ہی نہیں"

"اچھا۔ اب میرا دماغ نہ چاٹو۔ اور مہربانی کر کے چلتی پھرتی نظر آؤ"

"کہہ دوں ناظم صاحب سے کہ تمہارے محاسب نے میری توہین کی ہے"

"دیکھو!۔ میرا وقت ضائع نہ کرو۔ جاؤ خود بھی کچھ کام کرو اور مجھے بھی کام کرنے دو"

"اسے! تمہیں تو فخر کرنا چاہیئے کہ میں تمہارے پاس آکر بیٹھتی ہوں ۔ جانتے ہو۔ میں کتنا بڑا خطرہ مول لیتی ہوں"

"میں نہیں جانتا اور نہ جاننا چاہتا ہوں ۔ اول تو میں نے آپ سے کبھی نہیں کہا کہ میرے پاس آکر بیٹھا کرو اور پھر یہ سب باتیں آپ کو سوچنی چاہیئں کہ آپ افسر ہیں۔ میں تو ایک سیدھا سادھا سابق سپاہی ہوں۔ جو اٹھارہ بیس سال فوجی خدمات سر انجام دیتا رہا ہے۔ جس نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ سامنے کھائی ہے کھڈ ہے یا گہرا کنواں ہے۔ بس حکم ملنے کی دیر ہوتی اور میں کود پڑتا۔ آپ بھی کوئی حکم دے کر آزما سکتی ہیں"

مس ہارون نے ایک قہقہہ لگایا اور اس کے جسم کے تمام دلکش زاویے اور ابھار کافی دیر تک پارے کی طرح لرزتے ہچکولے کھاتے رہے۔ موسیٰ دل تھامے اسے ٹکر ٹکر دیکھتا رہا۔

"میں تمہیں ضرور آزماؤں گی۔ دیکھ لینا۔ ایک دن تمہارا پول کھل جائے گا"

مس ہارون مارے ہنسی کے بل پر بل کھا رہی تھی اور موسیٰ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ اور ایک لمحے کے لئے اپنے ہیجان خیز جذبات پر قابو پاتے ہوئے اس نے سوچا یہی وقت ہے۔ یہی موقع ہے۔ وہ ایک قدم اور بڑھے لیکن پھر جیسے کسی نے اس کے اندر سے اسے خبردار کیا اور وہ سفلی جذبات کو روکتا اپنے آپ سے الجھ پڑا۔ "پاگل نہ بنو۔ وہ تو مذاق کر رہی ہے"

ایک شام جب وہ اپنے بیمار دوست کے لئے بازار سے اشیائے ضرورت خریدنے گھر سے نکلا اور بس میں بیٹھ کر صدر دفتر کے قریب سٹاپ

پر اترنے لگا تو ناگاہ اس کی نظریں مس ہارون سے جا ٹکرائیں جو اسی بس کے انتظار میں جانے کب سے کھڑی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ مس ہارون سے دفتر کے احاطے سے باہر مل رہا تھا۔ دو چار سواریوں کے بعد جب اس نے فٹ بورڈ پر اترنے کے لئے قدم رکھا تو مس ہارون نے عجیب انداز سے ہونٹ سکیڑے اور پھر مسکرا دی۔

"آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟" مس ہارون نے فٹ بورڈ پر قدم رکھے اور گردن موڑ کر موسٹی سے مخاطب ہوئی جو نیچے اتر کر تذبذب میں مبتلا یہ سوچ رہا تھا کہ وہ اسی بس میں اپنا سفر جاری رکھے یا اپنی راہ لے۔ بس میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ ناچار مس ہارون نے فٹ بورڈ پر ہی کھڑی رہنے پر اکتفا کیا۔

"آج ہماری گاڑی خراب ہو گئی تھی اس لئے دفتر سے بسوں میں سفر کرتی یہاں تک پہنچی ہوں۔ اب ہوسٹل جا رہی ہوں۔" مس ہارون نے سواریوں کی چبھتی نگاہوں کو نظر انداز کر کے موسٹی سے گفتگو جاری رکھی۔ موسٹی نے بڑی مشکلوں سے حواس مجتمع کئے اور بازار آنے کا مدعا بیان کیا۔

"مجھے یہاں کچھ شاپنگ کرنی ہے۔" نہ معلوم کیوں اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ وہ چوری کرتا پکڑا گیا ہے۔ اور جب کنڈیکٹر نے سیٹی بجا دی تو اس نے اطمینان کا سانس لیا اور مس ہارون کو سلام کر کے چوراہے پر آ گیا جہاں سرخ بتی کا نشان اس کا راستہ روکے بے طرح گھور رہا تھا۔

دوسری صبح ابھی موسٹی دفتر پہنچا ہی تھا کہ مس ہارون نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

"یہ تم نے جھوٹ بولنا کب سے سیکھا ہے موسیٰ؟"

موسیٰ نے پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا مس ہارون!" اس نے اپنی سوالیہ نگاہیں، مس ہارون کے چہرے پہ گاڑ دیں۔

"گھور گھور کر کیا دیکھ رہے ہو؟ میں پوچھتی ہوں کل شام شاپنگ کرنے بازار گئے تھے نا؟"

"ہاں گیا تو تھا۔ پھر؟"

"پھر وہی جھوٹ۔ اگر تم بازار گئے تھے تو پھر کہاں کھو گئے۔ پندرہ منٹ بعد ہی میں اپنی سہیلی تسنیم کے ساتھ اسی بازار میں شاپنگ کرنے آئی تھی۔ لیکن تم تو وہاں دکھائی نہیں دیئے؟"

موسیٰ کے دل میں پھر میٹھی میٹھی گدگدی اور سرسراہٹ نے سر اٹھایا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے انگ انگ میں بجلی کی لہر سرایت کر گئی ہو۔ اس نے پُراشتیاق نگاہوں سے مس ہارون کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔ پھر اپنی بے قراری چھپانے وہ میز پہ بکھرے ہوئے کاغذات کو الٹنے پلٹنے لگا۔

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟" مس ہارون نے موسیٰ کے سامنے پڑے ہوئے کاغذات جھپٹ کر اٹھا لئے اور بناوٹی غصے میں کہا۔

"مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے مس ہارون جیسے مجھے پر لگ گئے ہیں اور میں ہوا میں اڑ رہا ہوں۔ آپ میرا دماغ بگاڑ رہی ہیں۔"

"تمہارا تو آدھے سے زیادہ ہی بگڑا ہوا ہے۔ میں تمہیں کیا بگاڑوں گی۔ ویسے میں

کل خود بھی حیران ہو رہی تھی کہ اتنے سارے مجمعے میں مجھے تم سے بات کرنے کی جرأت کیسے ہوئی۔"

"دل پر کیسے اختیار ہو سکتا ہے مس ہارون۔"

اسی لمحے کا تو مجھے انتظار تھا" دل کی بات آخر زبان پر آ ہی گئی اور موسیٰ اپنی پشیمانی چھپانے گردن موڑ کر میز کی دراز میں ٹٹولنے لگا۔ جیسے نادانستہ کسی فاش غلطی کا ارتکاب کر لیا ہو۔

"جو لوگ اپنے متعلق غلط رائے قائم کر لیتے ہیں ہمیشہ منہ کی کھاتے ہیں۔ تمہیں چاہیئے اپنے دماغ کا علاج کراؤ ورنہ ایک دن پاگل خانے کی ہوا کھانی پڑیگی۔" مس ہارون نے جھلک کر کہا موسیٰ نے زچ ہو کر اس کی طرف دیکھا اور پھر چپ سادھ کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

"کل ہم نے بازار میں چاٹ بھی کھائی۔ ہم تو جب بھی وہاں جاتے ہیں، دو تین پلیٹ چاٹ ضرور کھاتی ہیں۔ میری سہیلی بڑی پیٹو ہے۔" مس ہارون نے اسے گم سُم دیکھ کر دوبارہ موضوع چھیڑا۔ لیکن موسیٰ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کا دل بجھ کر رہ گیا تھا، اور اس کے ولولے ماند پڑ گئے تھے۔ "یہ عورت اسے جُل دے رہی ہے۔" وہ سوچنے لگا۔ جتنا جلد اس سے کنارہ کشی اختیار کر لے اس کے حق میں اتنا ہی بہتر ہے۔ فضول اور لایعنی باتوں میں کھو کر وہ اپنا وقت ضائع کر رہا ہے۔ لیکن وہ چھٹکارا حاصل کرے بھی تو کیسے۔ اصل تو وہ اس مقام پر آ گیا ہے جہاں سے لوٹنا ممکن ہی نہیں اور پھر۔ مس ہارون بھی تو ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گئی ہے۔ جس سے چھٹکارا حاصل کرنا اتنا آسان نہیں جتنا وہ

سمجھ رہا ہے۔ اس کے قاتل ابروؤں کا ہلکا سا اشارہ ناظم کے لئے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ مس ہارون کی ناراضگی اُسے کتنی مہنگی پڑے گی اس لئے وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا اس وقت کو کوسنے لگا جب وہ اس کے ساتھ بے تکلف ہو گیا تھا۔ اس خطرناک بے تکلفی کے لئے اپنے آپ کو مورد الزام ٹھہرانے لگا۔ حالانکہ بادی النظر میں وہ اس معاملے میں اتنا قصور وار نہ تھا۔ جتنی مس ہارون بذاتِ خود تھی۔ لیکن وہ یہ بات کیسے اپنی زبان پر لاسکتا تھا۔ اسی ادھیڑ بُن میں بیٹھا جب اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو مس ہارون غائب تھی۔ وہ اس کے کمرے سے کب کی جا چکی تھی۔ تعجب ہے۔ دروازہ کھُلنے اور بند ہونے کی آواز تک اس نے نہ سنی اور نہ ہی مس کے تیز قدموں کی چاپ اسے سنائی دی۔ بہت بُرا ہوا۔ اس نے تاسف سے سوچا۔ اسے اتنی بے رُخی سے پیش نہیں آنا چاہیئے تھا۔ لیکن پھر وہ آپ اپنے آپ مسکرانے لگا۔ "کوئی بات نہیں۔ میں اسے منانے کا گُر جانتا ہوں" اس نے اپنے آپ کو تسلّی دی اور بڑے انہماک سے کام کرنے لگا۔

وہ دوپہر مس ہارون نے ناظم کے کمرے میں گذاری کہ جرمنی سے ایک وفد آیا ہوا تھا اور وہ سب کسی تحقیقی مسئلے پر گفت و شنید کر رہے تھے۔ ناظم اور مس ہارون کے علاوہ دیگر تحقیقی عملہ بھی اس گفتگو میں شامل تھا۔ وہ دو تین مرتبہ اپنے کمرے سے باہر نکلا اور مس ہارون کے دفتر کا طواف کیا۔ لیکن وہ کہیں دکھائی نہ دی۔ آخر چپڑاسی کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ سب ناظم کے دفتر میں جرمنی سے آئے ہوئے وفد سے بات چیت کر رہے ہیں۔ دل پر ایک بھاری بوجھ لادے وہ تنہا تنہا سا سے بیں

گھومتا رہا۔ جب سے اس کی مس ہارون سے گاڑھی چھن رہی تھی وہ اپنے دیگر رفقائے کار سے بھی کسی حد تک کٹ گیا تھا۔ اب ایسے فرصت اور بے قراری کے لمحوں میں ان کے پاس جانے سے وہ دانستہ احتراز کرنے لگا۔ اس لئے اکیلے اکیلے ادھر ادھر گھوم پھر کر مس ہارون کا انتظار کر رہا تھا۔ اور جب بے چینی نے کہیں بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا تو وہ تنگ آکر دوبارہ اپنے کمرے میں داخل ہوا اور بادل ناخواستہ کام کرنے کے بجائے جھک مارنے لگا۔ دوپہر ڈھل رہی تھی۔ احاطے میں سائے طویل ہو رہے تھے کہ مس ہارون وندناتی اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔

"تمہارے پاس کتنی نقدی ہے" مس ہارون نے انتہائی سنجیدہ اور روکھے پن سے دریافت کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کچھ مغرور اور متکبر بھی لگ رہی تھی۔

"دو روپے تین آنے" موسیٰ نے مسکرا کر جواب دیا۔

"تو دس سے زیادہ کی توقع بھی تم سے کیا رکھی جا سکتی ہے۔ لیکن میں تمہاری ذاتی رقم کے بارے میں نہیں پوچھ رہی۔ یہ بتاؤ سرکاری خزانے میں کتنی نقدی موجود ہے؟" مس ہارون نے بدستور روکھے پھیکے لہجے میں دریافت کیا۔

"وہ تو میں بہی کھاتا دیکھ کر ہی بتا سکتا ہوں" موسیٰ نے بجھے بجھے دل سے کہا۔

"تو جلدی دیکھو۔ میرا منہ کیا تک رہے ہو؟" مس ہارون نے تنی ہوئی گردن اور اکڑ اکڑ کر سوال کیا۔

"خدا خیر کرے آج تو آپ بڑی برہم ہیں،" موسیٰ نے اسے چھیڑا لیکن مس ہارون پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے بدستور رکھائی سے کہا۔

"مذاق چھوڑو۔ سمجھے! اور جو میں پوچھ رہی ہوں اس کا جواب دو۔ وقت بہت

کم ہے اور مجھے بہت سے کام کرنے ہیں"

موسیٰ نے خشمگین نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ تاؤ میں بھرا ہُوا وہ رجسٹروں کو ادھر ادھر پٹخنے لگا اور پھر ایک رجسٹر کھول کر میزان کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد میزان لگا کر جب اس نے نگاہ اٹھائی تو مس ہاردن اس کے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ موسیٰ کا چڑھا ہوا پارہ اتنی جلدی اتر نہیں سکتا تھا۔ اس نے سرد مہری سے مس ہاردن کی طرف دیکھا اور کل میزان بتا دیا۔

"غصہ مجھے بھی آ سکتا ہے موسیٰ کے بچے!۔ ایسی صورت بنا لیتے ہو جیسے وقت کے افلاطون تم ہی تو ہو" مس ہاردن نے دلکش لہجے میں اترا کر کہا۔ موسیٰ نے اس کے لہجے کی دلکشی کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ اور سنجیدہ نگاہوں سے اسے ایک ٹک دیکھتا رہا۔

"اور کیا حکم ہے" موسیٰ نے بے دلی سے پوچھا۔

"دو سو روپے نکال کر مجھے دے دو" مس ہاردن کی نگاہوں میں چاہت کے ڈورے دیکھ کر وہ کانپ کر رہ گیا۔ "یہ عورت ہے یا چھلاوا" وہ سوچنے لگا۔

"ناظم صاحب کا حکم نامہ لے آؤ۔ میں مطلوبہ رقم نکال دوں گا" اس نے سرد مہری سے جواب دیا۔

"کیا میرا حکم کافی نہیں؟"

"جی نہیں۔ سرکاری رقم بغیر کسی تحریری حکم نامے کے میں آپ کے حوالے نہیں کر سکتا۔ یہ رول کے خلاف ہے"

مس ہارون دوبارہ سنجیدہ ہو گئی اور مزید کچھ کہے سنے بغیر موسیٰ کے کمرے سے باہر نکل گئی۔ وہ دور تک اس کے قدموں کی چاپ سنتا رہا جو ناظم کے دفتر کی جانب تیز تیز بڑھ رہے تھے۔ "جاتی ہے تو جانے دو" وہ جھلایا سوچنے لگا۔ "خواہ مخواہ کا رُعب گانٹھ رہی ہے۔ میں ناظم سے کہہ دوں گا کہ قانون اسی لئے بنایا جاتا ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ سرکاری رقم کے داخلے اور اخراج کے لئے تحریری حکمنامہ لازمی ہے"

"یہ لو۔ موسیٰ کے بچے!۔ تمہیں میری زبان پر یقین نہیں لیکن اس معمولی سے کاغذ کے پرزے پر زیادہ بھروسہ ہے" مس ہارون پانچ منٹ بعد ہی آدھمکی اور موسیٰ پر بناوٹی غصّے میں برسنے لگیں۔

"اب جلدی کرو۔ مجھے دیر ہو رہی ہے" وہ موسیٰ کے سر پر یوں سوار رہی کہ اُسے تحریری حکمنامہ پڑھنے بھی نہ دیا۔

"آپ لائبریری کی چابیاں تو لے آئیے۔ آپ بھول رہی ہیں کہ میرے خزانے پر بلا واسطہ آپ کا قبضہ ہے"۔ موسیٰ نے سنجیدگی برقرار رکھی۔

مس ہارون نے پرس میں ہاتھ ڈالا اور چابیوں کا گچھا نکال کر اس کے سامنے میز پہ پھینک دیا۔

"یہ لو چابیاں۔ جلدی کرو۔ میرا وقت ضائع نہ کرو"

موسیٰ نے چابیوں کا گچھا سنبھالا اور پھر خزانے کی چابیاں بھی ساتھ لے کر کمرے سے باہر آ گیا۔ اور جب وہ لائبریری کی سمت بڑھ رہا تھا تو اس کے پیچھے ٹھک ٹھک کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ اس نے چاہا گردن موڑ کر مس ہارون کو ایک

نظر دیکھ لے اور مسکرا دے۔ لیکن اپنے دل پر جبر کیئے، پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر بڑھتا چلا گیا۔

لائبریری کے تالے میں چابی گھمائی۔ لیکن دروازہ نہ کھلا۔ اس نے جھلا کر دوسری چابی تالے میں ڈالی پھر بھی تالا نہ کھُلا۔

"خدا کے بندے۔ ایک سو ایک نمبر کی چابی لگاؤ"، پیچھے کھڑی مس ہارون نے اسے مخاطب کیا۔ اس نے مڑ کر دیکھے بغیر ایک سو ایک نمبر چابی گچھے میں ڈھونڈی اور تالے میں لگائی۔ تالا کھُل گیا۔ اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا۔ مس ہارون اس کے پیچھے پیچھے لائبریری میں در آئی۔

"تو تم مجھ پر دو سو روپوں کا بھروسہ بھی نہیں کرتے۔ شکر ہے تمہیں پہچاننے میں، میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔ مجھے بروقت پتہ چل گیا۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ میں یہ رقم خورد برد کر لیتی؟"

مس ہارون ریک سے ایک کتاب اٹھا کر اس کی ورق گردانی کرتے کہنے لگی۔ موسٰی نے تو جیسے اس کی جانب دیکھنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ وہ بدستور خاموش کھڑا خزانے سے روپے نکال کر گننے میں منہمک رہا۔ وہ سب کچھ سنتے ہوئے بھی بظاہر یوں انجان بنا ہوا تھا جیسے مس ہارون اس سے نہیں دیواروں اور کتابوں سے باتیں کر رہی تھی۔

"دیکھو۔ میں نے اتنی توہین کبھی برداشت نہیں کی سمجھے۔ میں کب سے باتیں کر رہی ہوں اور تم نے یوں چپ سادھ رکھی ہے۔ جیسے میری باتوں کا جواب دینا بھی تمہارے لیے کسرِ شان ہو"۔

"مس ہاردن! اگر میری ذاتی رقم ہوتی اور آپ کو کسی ذاتی کام کے لئے ضرورت ہوتی تو میں کبھی معترض نہ ہوتا،" آخر موسیٰ نے زبان کھولی۔ اور دو سو روپے اس کی جانب بڑھاتے کہا۔

"لیکن سرکاری رقم میں بغیر کسی اجازت کے کسی کو بھی دینے کا مجاز نہیں۔ ایک تو یہ خلاف قانون حرکت ہے اور پھر سراسر میرے اصول کے منافی ہے۔"

"اچھا! ۔ تو تمہارے کچھ اصول بھی ہیں۔ خوب! ۔ خوب!" مس ہاردن نے طنز آمیز لہجے میں چوٹ کی۔ موسیٰ نے اسے سرد نگاہوں سے دیکھا اور تلملا کر کیش بکس کو ایک زوردار جھٹکے سے بند کر کے تالا لگا دیا۔ "کاش! ۔ وہ افسر نہ ہوتی۔ ایک عام عورت ہوتی!" اس نے کھولتے دماغ سے سوچا۔

"بے اصولے انسان اور جانور میں کوئی فرق نہیں ہوتا مس ہاردن!" آخر اس سے رہا نہ گیا۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور پاٹ دار لہجے میں جواب دیا۔

اچھا ۔ اچھا۔ اب فلسفی بننے کی کوشش نہ کرو۔ لائبریری بند کر دو۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔" مس ہاردن اس کی تیز نگاہوں کی تاب نہ لا کر جھینپ سی گئی اور بغلیں جھانکنے لگی۔ موسیٰ نے اپنی چابیاں اپنی جیب میں رکھیں اور لائبریری کی چابیاں اس کی طرف بڑھائیں۔

"یہ رہیں آپ کی چابیاں مس ہاردن! ۔ تالا آپ خود ہی لگائیں۔" یہ کہہ کر جب وہ کمرے سے باہر نکلنے لگا تو پیچھے سے مس ہاردن نے آواز دی "سنو!" موسیٰ نے مڑ کر دیکھا۔ "اُف! کتنی پرکشش ہیں یہ نگاہیں!"۔

ہوسٹی نے دل تھام لیا۔ اس نے چاہا آنکھیں بند کر لے اور ان مسکراتی پُر فریب نگاہوں کے انمٹ نقوش ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے دل پر ثبت کر لے۔

"جرمنی کے وفد کے ساتھ ہم ایک قدیم گاؤں دیکھنے جا رہے ہیں۔ تم چلو گے؟" مس ہارون نے دل لبھانے والے انداز میں اس سے کہا۔ اور وہ زچ ہو کر رہ گیا۔ "یہ عورت کس خمیر سے بنی ہے۔ کبھی اتنی برہم اور کبھی اتنی نرم!!۔ آخر یہ چاہتی کیا ہے؟" اس نے سوچتے سوچتے غصہ تھوک دیا۔ اور مسکرانے لگا۔ مس ہارون کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

"کھانا کھالیا ہے؟" مس ہارون نے بڑی نرمی اور پیار سے اس سے پوچھا

"نہیں" اس نے دھڑکتے دل سے جواب دیا۔ "کھانا تو الگ رہا۔ میں نے تو ابھی تک چائے بھی نہیں پی"

"ہم نے تو آج وہ گرم گرم شامی کباب، وہ چٹپٹے سموسے اور وہ الّم غلّم کھایا ہے کہ اب کھانا کھانے کو طبیعت ہی نہیں کرتی"

"لیکن ابھی ابھی تو آپ کہہ رہی تھیں کہ آپ کو سخت بھوک لگی ہوئی ہے"

"وہ تو میں مذاق کر رہی تھی۔ ہم سب وفد کے ہمراہ ابھی ایک قدیم گاؤں دیکھنے جا رہے ہیں۔ اور پھر رات کا کھانا سرکاری مد سے کسی ہوٹل میں کھائیں گے"

"مزے کر دمس ہارون!۔ مفت کی سیر۔ مفت کا کھانا"

"جلنے والے جلا کریں"

"اچھا۔ خدا حافظ" ہوسٹی نے دروازہ بھیڑ لیا اور مس ہارون

کو لائبریری ہی میں چھوڑ کر اپنے دفتر آ کر ادھورے کام کی تکمیل میں جٹ گیا۔

دوسرے دن وفد کے اعزاز میں گارڈن پارٹی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ سہارن پیش پیش تھیں۔ ناظم سے کہلوا کر وہ موسیٰ کو جگہ جگہ لئے لئے پھریں اور سامانِ خورد و نوش خریدتی رہیں۔ میز کرسیاں، برتن اور چائے کا انتظام ایک مقامی ٹھیکیدار کے ذمہ تھا۔ سہ پہر کو جب پارٹی کے شروع ہونے میں صرف ایک گھنٹہ باقی رہ گیا تو اس نے موسیٰ کو لباس تبدیل کرنے کی اجازت دی اور خود بھی ہوسٹل چلی گئی تاکہ اپنی سہیلی تسنیم کو بھی ساتھ لیتی آئے۔

موسیٰ نے ٹیکسی پکڑی اور گھر آ کر جلدی جلدی لباس تبدیل کیا۔ اپنے دوست کے کمرے کو تالا لگا ہوا دیکھ کر اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی اور رنج میں ڈوب کر کافی دیر تک تالے کو بے مقصد گھورتا رہا۔ ایک بیمار اور دکھی دوست تو کیا وہ اپنے جگر کے ٹکڑوں کو بھی فراموش کر گیا تھا!

وہ بھاگم بھاگ جہانگیر آباد کے چوک تک آیا اور ٹیکسی کے لئے ادھر ادھر نظر دوڑانے لگا۔ ٹیکسی تو کیا رکشہ تک موجود نہ تھا۔ بس سٹاپ پہ ایک بس کھڑی گھر گھرا رہی تھی۔ موسیٰ تیز تیز قدموں سے بس کی جانب بڑھا اور پائیدان پہ پاؤں رکھ کر بس کے اندر ایک خالی نشست پہ بیٹھ گیا۔ اس کے استفسار پہ کنڈیکٹر نے بتایا کہ بس کی روانگی دس منٹ بعد ہو گی۔ مجبوری تھی اور وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ دو ہی منٹ بعد اس نے دیکھا، چوک کے دوسرے سرے پہ ایک ٹیکسی آن رکی تھی اور چند برقعہ پوش

سواریاں اُتر رہی تھیں۔ وہ لپک کر بس سے اُترا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ٹیکسی کی جانب بڑھا۔ نزدیک پہنچ کر معلوم ہوا ٹیکسی بک ہے۔ یہی سواریاں اس میں واپس جائیں گی۔ اس نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور مس ہارون کی یادوں میں کھویا بوجھل بوجھل قدموں سے واپس آکر بس میں سوار ہو گیا۔

"آج تو مس ہارون کی سج دھج دیکھنے کے قابل ہو گی" وہ دیر تک کڑھتا رہا اور رہ رہ کر مس ہارون کو کوستا رہا جس نے اس کا سکون اور قرار چھین لیا تھا۔

آخر خدا خدا کر کے بس چل پڑی۔ کتنی سست رفتار تھی یہ بس! اس کا بس چلتا تو وہ ڈرائیور کو پرے دھکیل کر خود بس چلانے لگتا لیکن وہ معذور تھا کہ اس نے اب تک ڈرائیونگ سیکھی ہی نہ تھی۔ بس تو کیا وہ سکوٹر چلانا بھی نہیں جانتا تھا۔ کہیں غیب سے مدد مل جاتی اور سکوٹر خرید لیتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ پھر وہ روز مس ہارون کے ہوسٹل جاتا اور اُسے اپنے سکوٹر پہ پیچھے بٹھا کر کہیں دور لے جاتا۔ شہر کے ہنگاموں سے بہت دور۔ جہاں صرف وہ دونوں ہوتے، اور کوئی نہ ہوتا۔ پھر اسے مس امتیاز کا خیال آیا۔ جانے کیا بات تھی وہ کچھ دنوں سے بجھی بجھی اور اداس سی لگتی تھی۔ کہیں وہ بیمار نہ ہو۔ اس نے سوچا۔ ایک دوبار ملی بھی تو کتنی افسردگی اور ملال سے بات ہوں کرتی رہی جیسے وہ اپنے آپ پر جبر کر رہی ہو! ۔ خیر کبھی موقع ملا تو تفصیل سے باتیں کروں گا۔ بے چاری

اچھی لڑکی ہے۔ عمر میں مس ہارڈن سے کم ہے لیکن لگتا ہے۔ جیسے
اس کی بڑی بہن ہو۔ اس کی کاٹھی ہی کچھ ایسی ہے کہ وہ اپنی عمر سے زیادہ
کی نظر آتی ہے۔ بھاگم بھاگ۔ جوں توں کر کے موسٰی جب باغ کے وسیع لان
میں داخل ہوا تو میزوں پر بچھی ہوئی سفید چادروں کی ایک لمبی قطار
دکھائی دی جن پر مس امتیاز، شہلا اور برکت مسیح برتنوں کو سجا کر رکھ رہی تھیں
آج ہر ایک نے بناؤ سنگار میں انتہا کر دی تھی۔ سب اپنے بہترین لباسوں میں
ملبوس تھیں اور غازے پوڈر اور سرخی وغیرہ کا بے دریغ استعمال کیا تھا۔ ایک سے
ایک حسین لگ رہی تھی۔ خصوصاً مس امتیاز کے سانولے چہرے اور گداز جسم پر
ساڑھی بڑی سج رہی تھی۔ کندھے سے کیمرہ لٹک رہا تھا۔ اور وہ بڑے انہماک
اور شوق سے ہاتھ نچا نچا کر پلیٹیں اور پیالیاں قرینے سے سجا رہی تھی۔ اس کے
ساتھ ساتھ میز کے دوسرے سرے پر دیگر لڑکیوں کو بھی مختلف ہدایات دے رہی تھی۔
موسٰی کے سلام کا اس نے سر کی جنبش سے جواب دیا اور پھر کچھ دیر تک آپ ہی
آپ کام کرتی مسکراتی رہی۔ کچھ ہی دیر بعد شعبے کی گاڑی سرخ بجری بچھی ہوئی سڑک
پر نمودار ہوئی اور ساری میز بانوں کی نگاہیں ایک ساتھ اس جانب اٹھ گئیں۔ گاڑی
سے ایک ایک کر کے وفد کے اراکین اتر پڑے، اس کے بعد ناظم اور مس ہارڈن
کے ساتھ ساتھ اس کی سہیلی تسنیم بھی گاڑی سے اتریں۔ موسٰی ایک درخت کے
نیچے کھڑا ہو گیا اور رنگ و بو کے سیلاب میں کھو سا گیا۔ اسے اپنی قسمت
پر رشک آرہا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے اس کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ جب اس
نے دیکھا کہ وفد کا تعارف شعبے کے عملے سے ہو رہا تھا اور کسی نے اس کی طرف

دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ کسی نے ضرورت ہی محسوس نہ کی تھی کہ اس سے بھی قطار میں کھڑے ہونے کو کہہ دیا جاتا۔ وہ دل ہی دل میں کھولتا درخت کی آڑ لے کر کھڑا سب کچھ دیکھتا رہا۔ پھر وہ موقع تلاش کرنے لگا کہ چپکے سے کھسک جائے۔ لیکن کھسکنے کی نوبت نہ آئی۔ مس ہارون نے اسے دیکھ لیا اور اپنی سہیلی کو ہاتھ سے کھینچتی۔ اس کی طرف بڑھی۔

مس تسنیم جھینپ جھینپ رہی تھی اور لجا لجا کر ہاتھ چھڑانے کی سعی کر رہی تھی۔ لیکن مس ہارون نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ وہ اس سے دو قدم پیچھے کٹے ہوئے پتنگ کی طرح ڈولتی ڈگمگاتی بڑھتی چلی آ رہی تھی۔

"یہ موسیٰ ہیں۔ نجومی اور باتونی موسیٰ" مس ہارون نے اپنی سہیلی سے اس کا انوکھا تعارف کرایا۔ "اور یہ میری سہیلی تسنیم ہیں۔ پلاننگ کمیشن کی اعلیٰ عہدیدار"

موسیٰ کی باچھیں کھل گئیں اور تھوڑی دیر پہلے جس جانگسل لمحے سے گزرا تھا۔ اس کی تمام کدورتیں آپ ہی آپ دُھل گئیں۔ یہ تعارف وفد کے تعارف سے بالکل مختلف اور بڑا قیمتی تھا۔ پل کی پل میں منوں بوجھ اس کے ذہن سے پھک سے اڑ گیا اور وہ اپنے آپ کو بڑا ہلکا پھلکا لیکن بڑا اہم محسوس کرنے لگا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد دعوت اڑا کر سب لوگ گروہوں میں بٹ گئے اور گپیں ہانکنے لگے۔ چھریرے بدن کی تسنیم مجمعے میں سب سے حسین اور جاذب نظر تھی۔ اکثر مردوں کی نگاہوں کا وہ مرکز بن چکی تھی۔ اور وہ

اپنی جھینپو طبیعت سے مجبور مس ہارڈن کے پیچھے سائے کی طرح لگی اپنا سراپا چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور جب مس ہارڈن الگ تھلگ کھڑے موسیٰ کے قریب آکر کھڑی ہوگئی تو تسنیم اچانک اس کے سامنے آگئی اور موسیٰ مبہوت کھڑا ایک ثانیئے کے لئے اسے تکتا رہا۔ پھر اس بیہودگی پر نادم ہو کر وہ بغلیں جھانکنے لگا۔

ناظم ہنستے ہوئے ان کے قریب آئے اور مس ہارڈن کو ایک طرف لیجاکر کچھ ضروری باتیں کرنے لگے۔ اب موسیٰ ہوشربا حسن کے سامنے اکیلا کھڑا تھا۔ تسنیم نے جھینپتے ہوئے آخر زبان کھولی۔

"میں آپ کے متعلق بہت کچھ جانتی ہوں موسیٰ صاحب! مس ہارڈن آپ کی دست شناسی کی بڑی تعریفیں کرتی ہیں۔ ہمارے ہوسٹل میں آپ کے نجوم کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ کئی لڑکیاں آپ کو ہاتھ دکھانے کی خواہش رکھتی ہیں۔ پچھلے دنوں میں آپ کے دفتر آئی تھی لیکن آپ کسی ضروری کام سے باہر گئے ہوئے تھے۔"

موسیٰ سوچنے لگا کہ وہ جس لڑکی کو کم سخن سمجھے ہوئے تھا۔ وہ تو بڑی باتونی نکلی۔ ناظم سے باتیں ختم کر کے مس ہارڈن دوبارہ ان کی طرف آئی۔ اور انہیں آگاہ کیا کہ مس امتیاز اُن سب کا گروپ فوٹو اتاریں گی۔ سب تیار رہیں۔ اور جب وہ دوبارہ کسی اور سمت جانے لگی تسنیم اس کی طرف لپکیں اور دونوں میں کھسر پھسر ہونے لگی۔ مس ہارڈن نے ایک قہقہہ لگایا۔ پھر ہنستے ہنستے اس کی چھوٹی چھوٹی بلوریں آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

"اور سنو موسیٰ!" وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوتی موسیٰ سے مخاطب ہوئیں۔ "ہماری تسنیم کو شکایت ہے کہ ہمارے دفتر کے مرد اسے یوں گھور گھور کر دیکھتے ہیں جیسے کبھی کوئی عورت دیکھی ہی نہ ہو۔"

موسیٰ مسکرانے لگا۔ تسنیم نے مس ہارون کو تیکھی نگاہوں سے دیکھا اور پھر جیسے آپ اپنے آپ شرما کر نگاہ پھیر لی۔

"موسیٰ سے تو کوئی شکایت نہیں نا تسنیم! تم ان سے باتیں کرو میں ابھی آئی"، مس ہارون بھڑکیلے لباس میں چھم چھم کرتی اس جانب بڑھی جہاں ناظم وفد سے محوِ گفتگو تھا۔

"موسیٰ صاحب! یہ ہارون بڑی منہ پھٹ ہے اس کی باتوں میں نہ آنا"، مس تسنیم نے شرما کر کہا۔

"آپ بے فکر رہیں مس تسنیم! مس ہارون کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ دفتر میں مجھ پر بھی ایسی چوٹیں کیا کرتی ہے۔ ویسے آپ کی شکایت بجا ہے"۔ موسیٰ نے بے تکلف ہونے کی کوشش کی اور مس تسنیم اسے کنکھیوں سے دیکھتی مسکراتی رہی۔

کچھ دیر بعد مس انتباڑتے گروپ فوٹو اتارنے کا اعلان کیا تو سب اس پہاڑی کی جانب بڑھے جس کے نشیب میں تصویریں اتاری جاتی تھیں۔

پہلے مرد دو قطاروں میں کھڑے ہو گئے۔ پھر عورتیں اپنی مرضی سے مردوں کے سامنے کھڑی ہو گئیں۔ جب دو تصویریں اتاری جا چکیں تو موسیٰ ٹھٹھک کر رہ گیا اس کے بالکل سامنے مس ہارون اپنی سہیلی کے ساتھ کھڑی تھی ایک لمحے کے لئے موسیٰ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ وہ یہ فیصلہ نہ کر سکا۔ مس ہارون نے جان بوجھ کر

ایسا کیا تھا یا یہ محض اتفاق تھا۔ پارٹی سے لوٹ کر وہ ساری رات اسی خیال میں کھویا رہا۔ رہ رہ کر اس کے دل میں میٹھی میٹھی گدگدی ہونے لگی تھی۔ اگر یہ اتفاق ہی تھا پھر بھی کتنا حسین اتفاق تھا۔

تیسرے روز مس امتیاز نے ایک نوٹس جاری کیا کہ گذشتہ پارٹی کی تمام تصویریں نوٹس بورڈ پر نمبروار چسپاں ہیں۔ شائقین حضرات سے درخواست ہے کہ وہ اسے جلد از جلد اپنی ضرورت سے آگاہ کردیں۔ ایک تصویر کی قیمت صرف پچاس پیسے مقرر ہوئی تھی۔

شعبے کی تمام لڑکیاں اور مرد حضرات جوق در جوق نوٹس بورڈ کی طرف بڑھتے نظر آئے۔ پھر کچھ ہی دیر بعد وہ سب آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے۔ اپنے رفیقوں کے دبے دبے قہقہوں نے موسیٰ کے دل میں شکوک و شبہات اور بڑھائے اس نے بے چین ہو کر قلم میز پر پھینک دیا اور دھڑکتے دل سے باہر آکر نوٹس بورڈ کا رُخ کیا۔ ایک تصویر پر اس کی نگاہیں جم کر رہ گئیں۔ وہ مس ہارون اور تسنیم کے درمیان کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کے داہنے ہاتھ کی انگلیاں مس ہارون کی انگلیوں کو تقریباً چھوتی نظر آرہی تھیں۔ یہ کیسے ہو گیا!۔ وہ دیر تک ششدر کھڑا سوچتا رہا۔ اس نے دماغ پر بہت زور دیا لیکن کچھ بھی پلے نہیں پڑ رہا تھا۔ وہ ایسی اُوچھی اور نازیبا حرکت کیسے کر سکتا تھا۔ اس نے دوبارہ اس تصویر کو غور سے دیکھا۔ بادی النظر میں اس کا ہاتھ اس کی ران کے قریب مناسب فاصلے پر رکھا ہوا تھا جبکہ مس ہارون کا ہاتھ کچھ آگے بڑھا ہوا لگتا تھا۔ لیکن یہ تو اس کی اپنی رائے تھی۔ جبکہ لوگ اس کے برعکس قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ بدحواسی کے

اس لمحے میں اس کا دماغ گڑبڑا گیا اور اس نے جھپٹ کر چوکھٹے سے وہ تصویر اتار لی اور کوٹ کی اندرونی جیب میں ٹھونس لی۔ پھر اس نے سوچا، اسے چوری کرتے سب نے دیکھ لیا ہے۔ اب چھپانے سے کیا فائدہ! تصویر جیب سے نکال کر ہاتھ میں لئے وہ اسے دیر تک دیکھتا رہا اور پھر مسکرا کر اسی چوکھٹے میں دوبارہ ٹانک دیا۔ اور خوش خوش واپس آ کر اپنے دفتر میں بیٹھ کر کام میں مصروف ہو گیا۔

"مجھے تم سے یہ توقع ہرگز نہ تھی" مس ہارون دروازہ کھول کر اسے غضبناک نگاہوں سے گھورتی گویا ہوئی۔

"میں خود حیران ہوں مس ہارون! خدا شاہد ہے! میں نے ایسا سوچا تک نہ تھا۔ مجھے تو اس کا علم بھی بعد میں ہوا کہ آپ اتفاقاً میرے سامنے کھڑی ہیں۔" موسیٰ نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے اپنی صفائی پیش کی۔ لیکن مس ہارون پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ بدستور رہی اور انتہائی غصے میں اسے گھورتی رہی۔

"تم نے میری عزت خاک میں ملا دی۔ اور میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی" مس ہارون نے کانپتی آواز میں یہ جملے ادا کئے اور پھر زور سے دروازہ بند کر کے باہر چلی گئی۔ موسیٰ کو اب احساس ہوا کہ وہ ایک ناکردہ گناہ کا مجرم گردانا جا رہا ہے اور اس کی صفائی پیش کرنا لاحاصل ہے۔ تب اس نے دوسروں کی چے میگوئیوں پر لعنت بھیجی اور مس ہارون کو منانے کا قصد کر کے باہر آ کر اسے ڈھونڈنے لگا۔ سوئے اتفاق مس ہارون نوٹس بورڈ کے قریب کھڑی وہی تصویریں دیکھنے میں محو تھی۔ موسیٰ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کی جانب بڑھا اور پھر اس کے قریب کھڑے ہو کر مناسب وقت کا انتظار کرنے لگا۔ تاکہ اس سے معافی مانگ لے۔

"معافی کیسی!" کوئی اس کے اندر سے چیخ اٹھا۔ "جب تم نے کوئی جرم ہی نہیں کیا تو معافی کس بات کی مانگ رہے ہو؟" وہ اپنے آپ سے اُلجھ پڑا اور اپنے ہمزاد کو راضی کر کے اس نے کانپتی اور بیتاب آواز میں مس ہارڈن کو مخاطب کیا

"کیا میں تحریری معافی مانگوں؟ مس ہارڈن! یقین کر دیں بالکل بے قصور ہوں۔" سوچیئے تو سہی میں ایسی گری ہوئی حرکت کیسے کر سکتا تھا جبکہ میں جانتا تھا کہ اور کوئی نہیں تو کیمرے کی آنکھ تو مجھے دیکھ رہی ہے۔ اور عورت کی طرح کیمرے کے پیٹ میں بھی کوئی بات یا کوئی حرکت چھپی نہیں رہ سکتی۔ ایسے موقعے تو وہ خدا سے مانگتا ہے۔ مس ہارڈن بدستور تصویروں کو دیکھنے منہمک رہی۔

"بس بس اب زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ بھر پائی تمہاری دوستی سے" مس ہارڈن نے رُک رُک کر پلٹ کر دیکھے بغیر اپنی ناراضگی کا بدستور اظہار کیا۔ لیکن اس شکایت آمیز لہجے میں جو مٹھاس تھی اور چاشنی تھی، موسیٰ محسوس کیئے بنا نہ رہ سکا اس نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر وہ خود بھی تصویریں دیکھنے میں منہمک ہو گیا

"مجھے تو یہی تصویر سب سے اچھی لگتی ہے مس ہارڈن" موسیٰ نے اسی تصویر پر ہاتھ رکھ کر کہا جو ان دونوں کے لیئے بدنامی کا باعث بنی ہوئی تھی۔

"خاطر جمع رکھو۔ میں یہ تصویر ہرگز نہیں لوں گی" مس ہارڈن نے اِٹھلا کر کہا "اسے تو میں رکھ لوں گی" مس ہارڈن نے دوسری تصویروں میں سے ایک طرف اشارہ کیا جس میں وہ دونوں میز پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ اور مس ہارڈن ہاتھ میں چاکلیٹوں کی پلیٹ لیئے اس کی طرف ہاتھ بڑھائے مسکرا رہی تھی۔ موسیٰ پر پھر اختلاج قلب کا دورہ پڑا۔ "تو کیا یہ بھی سوئے اتفاق تھا کہ وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے ہیں"۔ وہ تعجب سے سوچنے لگا پھر

اس نے مس ہارون کی جانب غور سے دیکھا۔ جو زیر لب مسکرا رہی تھی۔
"کاش! وہ اتفاق سے محبت کا اظہار بھی کر بیٹھے!" اس نے محبت سے لبریز نگاہیں مس ہارون کے چہرے پر گاڑ دیں۔ اور مس ہارون کے اور قریب ہو گیا لیکن پھر جیسے نادانستہ اس نے بجلی کے تاروں کو چھو لیا ہو۔ وہ تڑپ کر الگ ہو گیا اور اپنے آپ پر نفریں بھیجنے لگا۔

"مس مخدوم کو دیکھو! جیسے کوئی چڑیل کھڑی ہو" مس ہارون نے تمک کر بات کی۔ موسیٰ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر اس تصویر پر نگاہیں گاڑ دیں جس کی طرف مس ہارون انگلی سے اشارہ کر رہی تھی۔

"تسنیم کے بارے میں کیا خیال ہے؟" موسیٰ نے کھوئے کھوئے انداز میں سوال کیا۔

"تسنیم تو ان سب لڑکیوں میں خوبصورت دکھائی دے رہی ہے"۔ مس ہارون نے پیار سے کہا۔ اور پھر وہ اس کی صورت میں کھو سی گئی۔

"یہ سب تصویریں میں لوں گی۔ لیکن میرا البم تو بھر چکا ہے ان تصویروں کے لئے نیا البم بھی خریدنا پڑیگا" مس ہارون جھکیں۔

"اور یہ تصویر بھی لیں گی؟" موسیٰ نے اسے چھیڑتے اسی تصویر پر انگلی رکھدی جو دونوں کے لئے بدنامی کا باعث بن چکی تھی۔

"نہیں۔ ہرگز نہیں" مس ہارون نے مسکرا کر کہا۔ اس کی آنکھوں میں چھلکتی شوخی سے موسیٰ نے اندازہ لگایا کہ وہ مَن چکی ہے۔ ناراضگی اور خفگی کے آثار اس کے چہرے سے ڈھل چکے ہیں۔ اور اب وہ خلاف توقع کچھ مسرور مسرور سی بھی دکھائی دینے لگی ہے۔ موسیٰ نے فرطِ انبساط میں ڈوب کر دل پر ہاتھ رکھ لیا اور آنکھیں میچ لیں۔

صبح ہی صبح ناظم صاحب نے موسیٰ کو اپنے دفتر میں بُلایا اور ہدایت کی کہ ڈھاکے والی شاخ کو ابھی ابھی پچاس ہزار روپے کی پانچویں قسط روانہ کر دے۔ ڈھاکہ سے تاروں پر تار آرہے تھے اور ناظم صاحب اپنی گوناگوں مصروفیات سے اس طرف توجہ نہ دے سکا تھا۔ اب جبکہ ڈھاکہ والوں نے الٹی میٹم دے دیا تھا کہ وہ پراجیکٹ پر کام بند کر دیں گے تو ناظم کو کہیں ہوش آیا اور موسیٰ کو رقم بذریعہ چیک فوراً ارسال کرنے کی ہدایت کی۔

موسیٰ بھاگا بھاگا مس ہارون کے کمرے میں داخل ہوا اور اس سے لائبریری کی چابیاں مانگیں۔ مس ہارون نے بڑی بے توجہی سے اس کی بات سنی اور انگریزی رسالے کی ورق گردانی کرتی۔ اسے کرسی پر بیٹھنے کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔ پھر اس کی نگاہیں ایک صفحے پر مرکوز ہو گئیں اور مسکرا کر موسیٰ کی جانب دیکھا۔

"دیکھو تو۔ کتنی خوبصورت لڑکیاں جمع ہیں اس ایک تصویر میں"
موسیٰ اس وقت بے حد جلدی میں تھا مس ہارون کا بے وقت مذاق اسے بالکل نہ بھایا۔ اس نے جھلا کر کہا۔ "فرصت ملیگی تو دیکھ لوں گا جلدی کرو۔ چابیاں دو تاکہ لائبریری کھول سکوں۔ مجھے ایک ضروری چیک لکھنا ہے" موسیٰ نے کھڑے کھڑے بے دلی سے کہا۔

"جب بھی آتے ہو گھوڑے پہ سوار ہو کر آتے ہو" مس ہارون پیار اور غصّے کے ملے جلے لہجے میں گھرگیں۔ موسیٰ زچ ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ "ارے! تم جب بھی آتے ہو تمیز کہیں باہر چھوڑ آتے ہو"۔ مس ہارون نے بدستور میٹھی آواز کا جادو جگایا اور موسیٰ کو یوں محسوس ہوا جیسے غش کھا کر اب گرا، کہ اب گرا۔

"اُف! عذرا واپس آچکی ہے" وہ ایک ناول کے بارے میں سوچنے لگا جسے اس نے حال ہی میں پڑھا تھا۔

"اب وہ اس کے طلسمی جال میں پھڑپھڑاتا ہوا جان دے دیگا"
اس نے میز پر دونوں ہاتھ پھیلا دیئے اور پھر اُن پر سر رکھ کر آنکھیں میچ لیں
"میں کہتی ہوں۔ اٹھو!۔ اور یہ تصویر دیکھو کتنی خوبصورت لڑکیاں جمع ہیں" مس ہارون نے پیار کی ڈانٹ پلائی۔ اور موسیٰ آنکھیں میچے میچے جذباتی آواز میں گویا ہُوا۔

"دنیا کی کوئی بھی عورت آپ سے خوبصورت نہیں مس ہارون!۔ میری بدبختی مجھے یہاں کھینچ لائی ہے"

مس ہارون نے ایک قہقہہ لگایا۔ موسیٰ نے آنکھیں کھول کر اس کی جانب دز دیدہ نگاہوں سے دیکھا اور پھر اُسے یوں لگا جیسے کسی نے اس کے دل کو مُٹھی میں لیکر دبا دیا ہو۔ وہ کرسی سے اچھل پڑا اور ٹکر ٹکر مس ہارون کے سراپا کو تکنے لگا۔ اچانک مس ہارون کی بھنویں تن گئیں اور بلوریں آنکھیں سکیڑ کر وہ موسیٰ کو بے طرح گھورنے لگی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے چہرے کا تناؤ آپ ہی آپ یوں زائل ہونے لگا۔ جیسے غبارے سے ہوا نکل رہی ہو۔ اس نے مسکرا کر کہا۔

"دن بدن شوخ ہوتے جا رہے ہو۔ موسیٰ! کوئی بنا تم ہی سے سیکھے"

"سچ کہتا ہوں مس ہارون" اب موسیٰ کو اپنے آپ پر قابو نہ رہا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ جس منزل کی جانب وہ انجانے میں گامزن ہو چکا ہے ایک جست بھر کر اس کی دہلیز پر قدم رکھ لے۔ لیکن پھر دوسرے ہی لمحے کسی انجانے خوف اور وسوسے نے اس کے دل و دماغ کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیا اور وہ اپنے جذبات پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا۔ "سچ کہتا ہوں کہ میں بڑی جلدی میں ہوں" اس نے مسکرا کر پینترا بدلا۔

مس ہارون نے اسے تیکھی نگاہوں سے دیکھا اور پھر مسکرا کر کرسی سے اٹھیں۔ شیلف پر پڑے ہوئے پرس کو ہاتھ میں لیا اور اس میں سے چابیوں کا گچھا نکال کر موسیٰ کی طرف بڑھایا۔

"لو۔ چالاک آدمی!" موسیٰ نے ہاتھ بڑھایا۔ دونوں کی نگاہیں ملیں

مس ہارون کی نگاہوں میں ایک واضح پیغام تھا جس سے اس کے دل کے تار جھنجھنا اٹھے لیکن وہ ہمت نہ کر سکا۔ اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے ہاتھ بڑھائے مسکراتا رہا۔ مس ہارون نے کھلکھلا کر ہاتھ کھینچ لیا۔

"لونا۔ چابیاں لینے بھول نہیں؟" اب وہ مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔ کبھی وہ اپنا ہاتھ آگے بڑھاتی کبھی پیچھے کھینچ لیتی۔ ہنستے ہنستے اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ کتنا پیارا تھا یہ انداز! موسیٰ کھڑے کھڑے سوچتا رہا۔ اس نے ایک مرتبہ اور ہاتھ بڑھایا اور جب موسیٰ کا ہاتھ چابیاں لینے اٹھا تو مس ہارون نے پھر اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ موسیٰ نے چاہا وہ یونہی ہاتھ کھینچتی اور بڑھاتی رہی۔ اس کی آنکھوں سے جیسے محبت اور چاہت کے شرارے نکل رہے تھے۔ بے کل ہو کر موسیٰ نے آخر جرأت رندانہ سے کام لیا اور مس ہارون کی کلائی مروڑ کر چابیاں چھین لیں۔ کتنا نرم اور گداز تھا اس کا ہاتھ! موسیٰ کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہوئے۔ اور جسم میں زلزلے کے جھٹکے محسوس کرنے لگا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ بلندیوں کی جانب پرواز کر رہا ہو۔ مس ہارون کے ہاتھ کی شفاف جلد، اس کی چھوٹی سی نرم و نازک مٹھی اور ربڑ کی ساخت کی مخروطی انگلیاں، موسیٰ نے چاہا اس ہاتھ کو ایک بار اور اپنے ہاتھ میں لے لے اور پھر اُسے کھینچ کر سینے سے بھینچ لے۔ کتنا حسین لمحہ تھا اور کتنی سرعت سے گذر گیا۔ اس کا دل دھڑ دھڑ کرتا مچل رہا تھا اور ہاتھ پاؤں بھول سے گئے تھے۔ دروازے میں کھڑے ہو کر اس نے پلٹ کر مس ہارون کی جانب دیکھا۔ مس ہارون کی آنکھوں میں بدستور قندیلیں

سی روشن تھیں اور ہونٹ عجیب انداز میں بھینچے ہنس رہی تھی۔

"آپ لاکھ افسر سہی مس ہارون! لیکن اپنے ماتحت مرد سے زور آزمائی تو نہیں کر سکتیں۔ مرد ہر حال میں جسمانی طور پر عورت سے طاقتور ہے" موسیٰ نے کانپتی لرزتی آواز پر قابو پاتے ہکلا کر کہا۔

"بڑا گھمنڈ ہے اپنے آپ پر؟" مس ہارون نے آنکھوں میں شوخی بھر کر جواب دیا۔

"کیوں نہیں۔ یقین نہ ہو تو آزما لیں" موسیٰ نے بے خیالی میں یہ جملہ تو اُچھال دیا لیکن پھر وہ پچھتانے لگا۔ کہیں مس ہارون نے بُرا نہ مان لیا ہو۔ لیکن ایسا کوئی تاثر جب مس ہارون کے چہرے سے جھلکتا دکھائی نہ دیا۔ تو وہ کسی حد تک مطمئن باہر کی جانب لپکا۔ لائبریری کی طرف جاتے اسے یوں لگتا تھا جیسے اس کے پاؤں زمین پر نہ پڑ رہے ہوں اور وہ بہت اونچی ہواؤں میں اُڑ رہا ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے جسم کے رونئیں رونئیں میں روشنی کی نوکیلی کرنیں سی پھوٹتی محسوس ہو رہی تھیں۔ مس ہارون کے خیالوں میں ڈوبا اور ایک انوکھے جذبے سے سرشار اس نے لائبریری کا دروازہ کھولا اور ایک فاتح کی طرح اندر داخل ہوا۔ جیسے اس لائبریری اور اس سے منسلک ہر چیز اور ذی روح کا وہ بلا شرکتِ غیرے مالک ہو۔ ایک مدہوشی کا عالم تھا جس سے وہ گزر رہا تھا۔ ہر کتاب کی اوٹ سے مس ہارون جھانک رہی تھی اور لطیف اشاروں سے اسے رِجھا رہی تھی۔ عالمِ وارفتگی میں اس نے ریک سے ایک کتاب اٹھالی اور اسے سینے سے لگا لیا۔ پھر لگا

جی چاہا تمام کتابوں کو باری باری چومے۔ اور ان کے ورق ورق پر محبت کی مہریں ثبت کرتا چلے۔ وہ یہ بھول چکا تھا کہ وہ کس غرض سے یہاں آیا تھا۔ تنہائی اور مس ہارون کے مدہوش کن خیالوں میں ڈوب کر اُسے یوں لگا جیسے اس کے بدن پر چیونٹیاں رینگ رہی ہیں۔ اور اعضاء میں کھچاؤ سا پیدا ہو گیا ہے۔ گمراہ کن خیالات کی رو اسے کہاں سے کہاں بہا کر لے جاتی اگر اسے یاد نہ آجاتا کہ ناظم نے اسے ایک ضروری کام سونپ رکھا تھا۔ اس نے جلدی جلدی کیش بکس کھولا۔ اور چیک بک نکال تالا لگا کر گنگناتا باہر آیا اور پھر لائبریری کو تالا لگا کر ہوا کے دوش پر قلانچیں بھرتا واپس اپنے کمرے میں آیا۔ پچاس ہزار روپے کا چیک لکھا اور دوسرے ضروری کاغذات لیکر وہ ناظم کے دفتر میں داخل ہوا۔ اور جب وہ اس کام سے پوری طرح فارغ ہوا تو اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ آپ ہی آپ پھیلنے لگی۔ اس کے ہاتھ میں مس ہارون کی چابیاں تھیں اور اس بہانے وہ ایک بار اور اس کا سامنا کر سکتا تھا۔ اس نے لوہے کی چابیاں زور سے مٹھی میں دبا لیں۔ لوہا آپ ہی آپ پگھل کر موم میں تبدیل ہو گیا۔ اسے یوں لگا جیسے مس ہارون کی نازک نازک نرم نرم مخروطی انگلیوں سے کھیل رہا ہو۔ لوہے کی چابیاں مٹھی میں بھینچنے سے جس تکلیف اور درد کا احساس ہو سکتا تھا وہ اس سے قطعاً بے نیاز تھا۔ وہ دیوانہ وار مس ہارون کے دفتر کی جانب لپکا اور ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں بے انتہا محبت کروٹیں لے رہی تھی۔ سرشار نگاہوں سے اس نے مس ہارون کی طرف دیکھا اور دل تھام کر رہ گیا

پھر اسے یوں لگا جیسے وہ مس ہارون کہیں کھو گئی تھی جس نے تھوڑی دیر پہلے اسے لبھایا اور رجھایا تھا۔ اس کے سامنے جو عورت بیٹھی تھی وہ انتہائی سنجیدہ اور متین سی لگ رہی تھی۔ افسر اور ماتحت کے درمیان فاصلہ قدرے اور بڑھ گیا تھا۔ اور وہ دل کی دل میں لئے کھڑا کھڑا پیچ و تاب کھانے لگا۔ کیا یہ فاصلہ یونہی مدام قائم رہے گا؟ وہ اس بُعد کو مٹانے پر کب قادر ہو گا؟ موسیٰ کے دل کو ایک جھٹکا سا لگا اور بے دلی سے دو قدم آگے بڑھ کر کھڑے کھڑے مس ہارون سے مخاطب ہوا۔

"مس ہارون! اپنی چابیاں لے لیں"

"میز پر پھینک دو" مس ہارون نگاہیں اٹھائے بغیر اپنے کام میں منہمک سنجیدہ لہجے میں بولیں۔ موسیٰ کا رنگ فق ہو گیا۔ تھوڑی دیر پہلے وہ جس سرخوشی اور بے پناہ اضطراب سے دوچار تھا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے حسین خوابوں کے محل ریزہ ریزہ ہو کر ہوا میں تحلیل ہو گئے ہوں۔ اس کے دل سے ایک ہوک اٹھی پھر اس نے بکھرے حواس مجتمع کئے اور اپنے آپ پر طعنہ زن ہوا۔

"کچھ بھی ہو۔ میں اپنی ذلت کسی صورت برداشت نہ کروں گا!" ایک مصمم ارادے نے اس کی ڈھارس بندھائی اور اس نے بڑی لاپرواہی سے چابیاں میز پر پھینک دیں۔ چھناکے کی آواز سے چونک کر مس ہارون نے اس کی طرف دیکھا۔

"تم نے مجھے ہاتھ کیوں لگایا تھا؟ تمہیں یہ جرأت کیسے ہوئی؟؟" مس ہارون

کی آنکھیں اُبل پڑی تھیں۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے اور آواز بے طرح کانپ رہی تھی جیسے جذبات کا ریلا اسے اپنے ساتھ بہا لے گیا ہو۔

"اگر کوئی دیکھ لیتا تو؟ تم نے میری عزت خاک میں ملا دی ہے"

موسیٰ کا دماغ شائیں شائیں کرنے لگا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے دل کی دھڑکن تھم گئی ہو۔ اس کے ماتھے پر ٹھنڈا پسینہ رینگنے لگا۔ اور وہ کھڑا کھڑا یوں محسوس کرنے لگا۔ جیسے اب گرا کہ اب گرا۔ وہ اپنے آپ کو مجرم گرداننے لگا۔ اس لئے نہیں کہ اس نے اخلاق سوز حرکت کی تھی۔ بلکہ اس لئے کہ پہلے ہی دن سے اس نے اس بے جان رسی کو سانپ کیوں نہ سمجھ لیا۔ جو اچانک پھن پھیلا کر اب اس کے سامنے لہراتی اسے کاٹ رہی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے کا محبت کا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔ اور اس کے اندر کا چور اپنے آپ کو پابہ زنجیر کر کے اس کا دل کھول کر مذاق اڑا رہا تھا۔ اپنے ذہن میں امڈتے ہوئے قہقہوں کے شور سے بیتاب ہو کر اس نے رہی سہی خودی کا سہارا لیا اور مس ہارون کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھتا گویا ہوا۔

"اچھا تو یہ بات تھی!۔ آپ نے سارا الزام مجھ ہی پر دھر لیا ہے۔ خیر۔ میں اسے تسلیم کرتا ہوں۔ اور وعدہ کرتا ہوں آئندہ ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ لیکن ایک بات آپ بھی کان کھول کر سن لیں۔ آئندہ مہربانی کر کے مجھ سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھیں اور نہ ہی مجھ سے کبھی بات کرنے کی کوشش کریں۔ میں اپنی اوقات پہچان چکا ہوں"

موسیٰ کھڑا اُدھو لتا رہا۔ اور اس لمحے کو کوستا رہا جب نادانستہ طور پر

مس ہارون سے اس کے تعلقات استوار ہوئے تھے اور وہ اس کے طلسماتی جال میں پھنس کر رہ گیا تھا۔ مس ہارون اسے گھور گھور کر دیکھ رہی تھی آہستہ آہستہ مس ہارون کے چہرے سے سنجیدگی زائل ہو گئی اور اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس کے ہونٹوں پر پھر حسین مسکراہٹ کے پھریرے لہرانے لگے۔ لیکن موسیٰ اب مکمل طور پر ہوش میں آ چکا تھا۔ اس کی مسکراہٹ جیسے اسے زہر میں بجھی ہوئی لگی۔ اور اس نے نفرت سے نگاہیں پھیر لیں۔ اس نے شعلہ بار نگاہیں دوبارہ مس ہارون پر گاڑ دیں۔

"اب مجرم اجازت چاہتا ہے" موسیٰ نے رنج میں ڈوب کر کہا۔ اسے یہ توقع ہرگز نہ تھی کہ حالات پل کی پل میں ایسا رخ اختیار کر لیں گے۔ اندھیرے نے اسے چاروں اطراف سے گھیر لیا تھا اور اس کے وقار کو جو ٹھیس پہنچی تھی وہ اس کی تاب نہ لا سکا۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ مس ہارون سے ہمیشہ کے لئے قطع تعلق کر لیگا چاہے اسے دل پر کتنا ہی جبر کیوں نہ کرنا پڑے۔ وہ اس دل کو مسل دیگا۔ خواہشات کا گلا گھونٹ دیگا۔ اور اپنے تمام ارمانوں کا خون کر لیگا۔ وہ اس ملازمت کو بھی چھوڑ دیگا۔ جس نے اس کے پاؤں میں زنجیریں پہنا دی ہیں۔ طرح طرح کے خیالات نے اس کے دل و دماغ کو جکڑ لیا مس ہارون شائد اس کے چہرے کے تاثرات جان چکی تھی۔ اور اب وہ دوبارہ اسے اپنے دام میں جکڑنے کو ہاتھ پیر مارنے لگی۔

"مجرم کو اجازت نہیں مل سکتی" مس ہارون نے مسکرا کر دوبارہ جال پھینکا۔ اور شوخ نگاہیں موسیٰ کے چہرے پر گاڑ دیں۔ "بیٹھو! آئندہ

ایسی حرکت نہ کرنا۔"

موسلی اب ہوش میں آچکا تھا۔ اور اس کے دماغ کی ڈھیلی چولیں آپ ہی آپ کس گئی تھیں۔ وہ مزید فریب کھانے پر ہرگز تیار نہ تھا۔

"جی نہیں۔ شکریہ۔ میں اس کرسی پر بیٹھنے کے لائق نہیں۔ آپ کا ماتحت جو ٹھہرا،" موسلی نے دُکھ سے کہا "شاید یہ ہماری آخری ملاقات ہو۔ دفتری معاملات میں بھی توقع ہے آپ مجھ سے براہ راست کوئی غرض نہ رکھیں گی۔ چپڑاسی موجود ہے۔ آپ کو جس چیز کی ضرورت ہو۔ چپڑاسی کی وساطت سے مجھ سے حاصل کر سکتی ہیں۔"

"ہوش میں تو ہو۔ موسلی!۔ تم بھول رہے ہو کہ میں تمہاری افسر ہوں میں جب چاہوں تمہیں بُلا سکتی ہوں اور تم انکار نہیں کر سکتے" مس ہارڈن نے ہمک کر کہا۔

"آپ بُلا کر تو دیکھیں" موسلی نے تن کر جواب دیا۔ "میری طبیعت سے شاید ابھی تک آپ واقف نہیں ہو سکیں۔ عزتِ نفس کی خاطر میں اس ملازمت کو بھی قربان کر سکتا ہوں"

مس ہارڈن اسے دیر تک دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے سے مترشح تھا جیسے وہ اپنے رویّے پر بے حد پچھتا رہی ہو۔ اس نے مفاہمت کی مقدور بھر کوشش کی لیکن ناکام ہو کر وہ جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ پھر وہ اضطراری حالت میں کرسی سے اٹھی اور دروازے پر آکر کھڑی ہو گئی۔ دروازہ کھول کر وہ ایک ثانیے کے لئے باہر جھانکی اور

پھر اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے وہیں کھڑی ہو کر موسیٰ کو ایک ٹک دیکھتی مسکرانے لگی۔

"دروازہ کھول دیں مس ہارون! - میں باہر جانا چاہتا ہوں۔" موسیٰ نے بدستور روکھے پن کا اظہار کیا۔ مس ہارون نے خشمگین نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر غصے پر قابو پاتے پھٹ پڑیں۔

"میں نے تمہیں کب روکا ہے۔ جاتے ہو تو جاؤ" مس ہارون نے دروازہ کھول دیا اور ایک طرف کھڑی ہو کر نتھنے پھلانے اور سکیڑنے لگی۔ موسیٰ بے رخی سے آگے بڑھا، دروازے تک آیا اور پلٹ کر دیکھے بغیر باہر نکل گیا۔

وہ جھنجلایا ہوا اپنے کمرے میں داخل ہوا اور کام میں دل لگانے کی کوشش کی۔ ناکام ہو کر اس نے دفتر بند کر دیا اور کسی سے اجازت لئے بغیر بس سٹاپ پر دیر تک کھڑا پیچ و تاب کھاتا رہا۔ رہ رہ کر اسے مس ہارون کا خیال آ رہا تھا جسے سمجھنے میں وہ بالکل ناکام ہو گیا تھا۔ "عورت فطرتاً پُر اسرار واقع ہوئی ہے" وہ سوچنے لگا۔ "ایک وہ ہی تو نہیں دنیا کی تمام عورتیں پُر اسرار ہیں۔ جو کچھ وہ چاہتی ہیں۔ کبھی زبان نہیں لائیں گی۔" وہ عبث ہی پتھروں سے اپنا سر پھوڑ رہا ہے۔ برہنہ رہیں گی، لیکن برہنگی کو تسلیم کبھی نہیں کریں گی۔ یہی تو عورت کی فطرت ہے۔" اتنے میں ایک بس دندناتی جامعہ کے احاطے میں داخل ہوئی اور ایک لمبا چکر کاٹ کر سٹاپ پر رک کر گھر گھرانے لگی۔ موسیٰ بس میں بیٹھ گیا اور کھڑکی سے اس سر سبز ٹکڑے کو دیکھنے لگا۔ جس کی

روشوں پر رنگ رنگ کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ بہار کی آمد آمد تھی وہ دل مسوس کر رہ گیا۔ "ور اسے کیا؟" وہ سوچنے لگا۔ اس کی قسمت میں تو خزاں ہی خزاں لکھی ہے۔

تعجب ہے۔ فضا بہاری ہواؤں سے معطر تھی۔ اور اسے اتنے دنوں سے بہار کا احساس تک نہ ہو سکا۔ شاید یہ مس ہارون کے قرب کی کرشمہ سازی تھی جس نے اُسے موسم کی تبدیلی سے غافل بنا رکھا تھا اچانک اُسے اپنے بچوں اور بیوی کی یاد ستانے لگی۔ کتنا سنگدل تھا وہ! اتنے مہینوں میں اس نے صرف ایک ہی خط بیوی کے نام لکھا تھا۔ اور بس۔ پھر اسے بیمار دوست کا خیال آیا اور وہ دل مسوس کر رہ گیا۔ ندامت سے اس نے اپنا منہ گریبان میں ڈال لیا اور دل بھر آیا۔ اگلی سیٹوں پر بیٹھی ہوئی چہکتی طالبات کی طرف اس کی نگاہ اٹھی تو نفرت کا ایک سیلاب امڈ آیا اور پھر وہ منہ پھیر کر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ شہر کے گنجان آباد علاقے میں وہ بس سے اُتر پڑا اور سڑکوں پر یوں ہی بے مقصد مڑ کر گشت کرنے لگا۔ پھر ایک سینما گھر کے قریب فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر وہ بے پناہ ہجوم میں کھو گیا۔ سامنے موٹریں، رکشا، سکوٹر اور تانگے آجا رہے تھے۔ اس گہما گہمی اور ریل پیل سے اس کی تلخی قدرے دور ہوئی تو اس نے اطمینان کا سانس لیا اور کوئی فلم دیکھنے پر اپنے آپ کو آمادہ کرنے لگا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے جب کوئی عورت تانگے پر بیٹھی اس کے سامنے گذر جاتی تو وہ تڑپ اٹھتا۔ اسے یوں لگتا جیسے وہ عورت ایک ایک کر کے کپڑے اتار رہی ہو۔ اور پھر اس کے

سامنے مادر زاد ننگی ہو گئی ہو!۔ وہ سٹپٹا کر دوسری جانب دیکھنے لگا لیکن وہاں بھی اس کے خیالات کی برہنگی اس کا پیچھا نہ چھوڑتی۔ اب وہ جس سمت دیکھتا عورتیں ہی عورتیں دکھائی دیتیں۔ ان ننگی عورتوں کے اژدحام میں ناگاہ اس کی نظر کالا برقعہ اوڑھے، تانگے پر سوار ایک عورت پر پڑی جس کا برقعہ میلا ہو رہا تھا اور وہ پچھلی نشست پر بیٹھی راہ گیروں کو گھور رہی تھی۔ یہی تانگہ کوئی چار مرتبہ اس کے سامنے سے گزر اتھا۔ برقعہ پوش عورت نے چہرے سے پلو ہٹا کر اس کی طرف دیکھا اور مسکرا دی ہوسی نے پہلے اسے استفہامیہ نگاہوں سے دیکھا پھر لپک کر تانگے میں سوار ہو گیا۔ کوچوان نے گھوڑے کو چابک دکھائی۔ آن کی آن میں گھوڑا ہوا سے باتیں کرتا۔ ہجوم کو چیرتا ایک سنسان سڑک پر آ گیا۔ کوچوان نے اب گھوڑا دلکی چال پر چھوڑ دیا۔

"کہاں چلنا ہے بابو؟" لڑکی نے مسکرا کر بھاری آواز میں کہا۔ ہوسی کو اس کی آواز سے متلی آنے لگی۔ جیسے پھٹا ہوا ڈھول بج اٹھا ہو۔ وہ اس کا موازنہ اپنے دفتر کی لڑکیوں سے کرنے لگا پھر اسے اس کے زرد چہرے پر ترس آیا۔ جیسے زمانے کے بے رحم ہاتھوں نے تھوڑی ہی مدت میں کلی سے پھول بنا دیا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو بابو؟ کوئی ٹھکانہ ہے یا میں بندوبست کردوں؟" پھٹے ڈھول ایسی آواز نے ہوسی کو چونکا دیا۔ اور وہ بغلیں جھانکنے لگا۔ یہ تو اس نے سوچا ہی نہ تھا۔ پھر وہ اپنے آپ ملامت کرنے لگا۔ لیکن اب تیر

کمان سے نکل چکا تھا۔ اور اسے ہر حال میں اس عارضی رفاقت کی قیمت ادا کرنی تھی۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا" موسیٰ دل پہ جبر کرکے ہکلایا۔" ہم کسی ہوٹل میں بیٹھ کر باتیں کریں؟"

"سمجھی!" پھٹے ڈھول ایسی آواز والی لڑکی نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا۔ "ٹھیک ہے۔ ہوٹل چلو۔ وہیں معاملہ طے کریں گے۔" لڑکی نے بیباکی کا مظاہرہ کیا اور موسیٰ کو اپنے آپ سے شرم محسوس ہوئی۔ لڑکی نے "خفیہ" زبان میں کوچوان سے کچھ کہا اور تانگہ دو چار موڑ کاٹ کر ایک غلیظ سے ہوٹل کے سامنے آکر رک گیا۔ تانگے سے اتر کر لڑکی بے جھجک، ہوٹل کے کھلے دروازے میں داخل ہوئی اور پھر کاؤنٹر پر غلیظ کپڑے پہنے نام نہاد مینجر سے بڑی بے تکلفی سے باتیں کرنے لگی۔ ڈرتا جھجکتا موسیٰ ہوٹل کے دروازے میں نمودار ہوا۔ لڑکی نے مینجر سے باتیں کرتے کرتے گردن موڑی اور موسیٰ سے کہا۔

"تانگے والے کو پانچ روپے دے دو"

موسیٰ کی حیرانی بھانپ کر لڑکی نے کاروباری انداز میں صفائی پیش کی۔

"یہ ہمارا دستور ہے بابو!۔ کوچوان اس سے کم پر راضی نہ ہوگا۔ اچھا چلو! آپ ڈھائی روپے دیدیں۔ ڈھائی روپے میں اپنی جیب سے ادا کر دوں گی۔"

مجبور ہو کر موسیٰ نے ڈھائی روپے کاؤنٹر پہ رکھ دیئے۔ لڑکی

نے جھٹ کر روپے کاؤنٹر سے اٹھائے اور تیز تیز قدم بڑھاتی، کوچوان کی طرف لپکی۔ تھوڑی دیر تک دونوں میں ایک انوکھی زبان میں چیخ پکار ہوتی رہی۔ پھر جیسے معاملہ طے ہو گیا۔ کوچوان نے ڈھائی روپے اپنے میلے کرتے کی جیب میں اڑس لئے اور گھوڑے کو پچکارتا تانگہ آگے بڑھا دیا۔

"تم اوپر چلو بابو! میں آتی ہوں" لڑکی دوبارہ کاونٹر پہ آئی اور موسیٰ کو ہدایت دے کر دوبارہ منیجر سے اسی زبان میں باتیں کرنے لگی۔ جس کا ایک لفظ بھی موسیٰ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ موسیٰ نے ہوٹل پہ طائرانہ نگاہ ڈالی اور یہ جان کر بے حد متعجب ہوا کہ اس ہوٹل میں سوائے اس کے اور کوئی گاہک موجود نہ تھا۔ میلی اور پھٹی ہوئی کرسیاں، چند میزوں کے گرد اگر دپڑی ہوئی تھیں۔ میزوں پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ اور دیواروں کی برسوں کی سفیدی سیاہی مائل ہو رہی تھی۔ ایک زینہ اوپر کی منزل میں کھل رہا تھا۔ اوپر کیا تھا؟ اس نے گھبرا کر سوچا۔ کہیں اس لڑکی نے کوئی دام نہ بچھا لیا ہو؟ اس نے مشکوک نگاہوں سے لڑکی کی طرف دیکھا۔ لڑکی نے برقعہ اتارا اور پھر اسے لپیٹ کر نام نہاد منیجر کے حوالے کیا جس نے کاؤنٹر کی دراز میں رکھ لیا۔

"گھبراؤ نہیں بابو!۔ یہ شریفوں کا اڈہ ہے۔ یہاں کوئی تمہارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا" پھٹے ڈھول ایسی آواز پھر ابھری۔ موسیٰ نے چھچلتی

نگاہ لڑکی کے سراپا پر ڈالی۔ جو برقعہ اتار دینے سے اب خاصی جاذب نظر لگ رہی تھی۔ جسم گداز تھا۔ کمر پتلی اور نچلا دھڑ تربوز کی طرح خم کھائے ہوئے تھا۔ تنگ قمیص میں اس کے جسم کے سارے زاویے نمایاں طور پر جھلک رہے تھے یہاں تک کہ وہ کسی ہوئی انگیا تک کو واضح دیکھ سکتا تھا۔

موسیٰ کے قدم آپ ہی آپ زینے کی جانب بڑھے۔ اوپر ایک تنگ سی بالکنی میں دو تین کمرے دکھائی دیئے۔ جن پر تالے چڑھے ہوئے تھے۔ اور پھر بالکنی میں ایک اور چھوٹا سا زینہ تیسری منزل کی نشاندہی کر رہا تھا۔ موسیٰ نپے تلے قدموں سے دوسرے زینے پر چڑھنے لگا۔ چند ہی سیڑھیاں طے کر کے وہ اوپر آگیا۔ ایک چوکور جنگلے میں چھوٹا سا صحن پھنسا ہوا تھا۔ جس کے اوپر نیلا آسمان جھانک رہا تھا۔ پاس ہی کہیں سے تعفن اور غلاظت کی بو آ رہی تھی۔ شاید نزدیک ہی کہیں بیت الخلاء موجود تھا۔

اس نے جنگلے پر ہاتھ رکھے اور سامنے نگاہ دوڑائی۔ دور۔ ایک ریل گاڑی چھک چھک کرتی دھواں اڑاتی پٹڑی پر بھاگی جا رہی تھی۔ نیچے سڑک پر اکّا دکّا تانگے اور رکشا گذر رہے تھے۔ وہ سب کو دیکھ رہا تھا لیکن اسے کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ایسے میں اسے خدا کی یاد آئی جو اس سے بھی بلندی پر کھڑا یا بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایک جھرجھری لی اور اس کا رواں رواں کانپنے

لگا۔ پھر متاسف ہو کر اس نے اپنے آپ کو لعنت ملامت کیا۔ اخلاقی گراوٹ کی انتہا!۔ وہ سوچنے لگا۔ اسے یہاں نہیں آنا چاہیئے تھا۔ پھر وہ سوچنے لگا کہ جو کھیل وہ دفتر میں کھیل رہا ہے۔ وہ کیا ہے؟ اور مس ہارون اور اس فاحشہ میں فرق کتنا ہے؟ صرف اتنی سی بات ہے کہ مس ہارون ایک اونچے طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ اور مہذب سوسائیٹی کی نام لیوا ہے۔ جنسی لحاظ سے تو دونوں ایک ہی طرح کا کھیل کھیل رہی ہیں۔ ایک جنسی تسکین حاصل کرنے کے لئے اور دوسری پیٹ بھرنے کے لئے!۔

"مگر تمہارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟" اس کے ہمزاد نے اسے ٹوکا "تمہیں شرم نہیں آتی۔ شادی شدہ ہو کر یوں جنس کے ہاتھوں تماشہ بنے بیٹھے ہو؟ کیا تمہیں واقعی مس ہارون سے محبت ہے؟ محبت کے نام پر بٹہ لگانے والے "ڈوب مرو" موسیٰ جنگلے پر جھکے جھکے دیر تک اپنے آپ سے الجھتا رہا۔ اور اپنے آپ کو کوستا رہا۔ وہ اتنا ذلیل پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ اور اس تمام ذلت اور اخلاق سوزی کے لئے وہ مس ہارون کو موردِ الزام ٹھہرانے لگا۔ ورنہ اس سے پیشتر وہ ایک نیک باپ اور شریف خاوند تھا۔

"حد ہو گئی۔ میں نے تمہارے پیچھے ہوٹل کا کونا کونا چھان مارا اور تم یہاں کھڑے ہو" اوپر آکر لڑکی نے واویلا مچایا پھر بے طرح ہانپنے لگی۔

"دراصل میں تمہارے ڈھب کا آدمی نہیں ہوں" موسٰی خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہکلایا۔

"کیا مطلب؟" لڑکی گھرکی۔

"مطلب یہ کہ میں غلط جگہ پہ آگیا ہوں" اس نے دلجمعی سے اپنا مافی الضمیر بیان کیا۔ لیکن لڑکی اس کا غلط مطلب سمجھی۔

"تو چلو۔ کہیں اور چلیں" لڑکی کاروباری انداز میں بولی۔ "ویسے اس سے بہتر کوئی جگہ ہو ہی نہیں سکتی۔ الگ تھلگ اور بالکل محفوظ"

"نہیں میرا یہ مطلب نہیں۔ میں۔ دراصل اس قماش کا آدمی ہی نہیں" وہ دوبارہ ہکلایا اور اکتا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"کیا خوب!۔ بابو!۔ یہ جھانسا کسی اور کو دو۔ میں تو ایک ایک منٹ کی قیمت وصول کرتی ہوں۔ اس ہتھیلی پر تیس روپے رکھ دو اور چلتے پھرتے نظر آؤ۔ دھندے کا وقت ختم ہو چکا ہے"

"لیکن۔ میں نے تو تمہیں چھوا تک نہیں"

"کیا فرق پڑتا ہے۔ اب چھو کے دیکھ لو۔ میں صرف شام کو باہر نکلتی ہوں۔ اور گھنٹے دو گھنٹے میں تیس روپے کما لیتی ہوں۔ بابو صاحب گھر میں میری بڑی بہن میرا نہیں تیس روپوں کا انتظار کر رہی ہو گی۔ ہماری کمائی کا صرف یہی ذریعہ ہے۔ اچھا۔ اب سیدھے ہاتھ تیس روپے نکالو" لڑکی اسے دھمکانے پہ اتر آئی۔

"پردیسی سمجھ کر مجھے لوٹنے لگی ہو" موسٰی نے شکست خوردہ

آواز میں پینترا بدلا۔ لڑکی اسے ٹکر ٹکر دیکھنے لگی۔

"کہاں کے رہنے والے ہو؟" لڑکی کچھ مرعوب سی ہو کر بھاری آواز میں بولی۔

"بیں ۔ یں۔ بنگال کا رہنے والا ہوں" موسٰی ہکلایا اور ساتھ ہی ساتھ اس سفید جھوٹ پر مارے ندامت کے کٹ کٹ گیا۔

"بنگالی ؟۔ کیا تم واقعی بنگالی ہو؟"

ہاں ! میں بنگالی ہوں۔"

"میری ماں بھی بنگالن تھی" لڑکی نے آبدیدہ ہو کر کہا "میرے باپ نے اسے یہاں لا کر چھوڑ دیا تھا اور پھر آج تک ہم نے اپنے باپ کی صورت نہیں دیکھی۔ میری ماں نے برتن مانجھ کر ہمیں پالا اور پھر ایک دن وہ بھی مر گئی۔ پہلے میری بڑی بہن دھندا کرتی تھی اب اس نے بیاہ رچا لیا ہے۔ اور دھندا میرے حوالے کر دیا ہے"

موسٰی نے اسے ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھا اور اپنے آپ کو مجرم گرداننے لگا۔ جس نے بیچاری کا دل خواہ مخواہ دُکھایا۔

موسٰی نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور روپے نکال کر گننے لگا۔

"مجھے افسوس ہے میرے پاس تیس روپے نہیں ہیں۔ لو یہ بائیس ۲۲ روپے رکھ لو" موسٰی نے اپنی تمام پونجی اس کے سامنے بڑھائی۔ رہنے دو بابو! تم بھی تو پردیسی ہو شاید تمہاری ضرورت مجھ سے زیادہ ہو۔ سچ تو یہ ہے مجھے روپوں کی بالکل

ضرورت نہیں لیکن میری بہن کا خاوند شرابی ہے۔ جس دن اسے روپے نہ ملیں وہ میری بہن کو پیٹتا ہے۔ بہن کی خاطر مجھے کچھ نہ کچھ کمانا ہی پڑتا ہے۔"

"تم انہیں رکھ لو۔ ویسے تمہارا نام کیا ہے؟" موسیٰ نے ہمدردی سے پوچھا وہ دل ہی دل میں پچھتانے لگا تھا کہ ایک کیسی معصوم بھولی بھالی لڑکی کو فریب دے رہا تھا۔

"گاہکوں میں مَیں چھمیاں کے نام سے مشہور ہوں۔ ماں نے میرا نام شمیم رکھا تھا۔"

"شمیم!" موسیٰ نے اس کا نام دُہرایا "تم رہتی کہاں ہو؟"

"زیادہ دور نہیں۔ وہ سامنے ریلوے کا پل دکھائی دے رہا ہے نا۔ پل کے اس پار ہمارا چھوٹا سا مکان ہے۔ میرا باپ بحری فوج میں ملازمت کے دوران میں بنگال گیا اور وہیں میری ماں سے اس نے شادی کی تھی پھر یہاں لاکر اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ بنگال میں تم کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"میرا گھر جیسور میں تھا" موسیٰ نے دوبارہ جھوٹ کا سہارا لیا۔ اس کے سوا اب چارہ بھی تو کوئی اور نہ تھا اور پھر اُسے اس جھوٹ میں مزہ بھی بہت آرہا تھا۔ لہٰذا وہ مسلسل جھوٹ پر جھوٹ بولتا شمیم کی ہمدردیاں جیت رہا تھا۔

"ایک طوفان میں میرے ماں باپ اور بہن بھائی سب ڈوب کر مر گئے۔ میں اکیلا رہ گیا۔ روزی کی تلاش میں مارا مارا پھرتا یہاں آکر بس گیا ہوں۔"

"تو تمہارا اب کوئی بھی نہیں رہا۔ تم بالکل اکیلے ہو؟" موسیٰ کا وار ٹھیک

لٹائے پر بیٹھا تھا۔ شمیم کے لہجے سے ہمدردی ہی ہمدردی ٹپک رہی تھی۔

"میں ایک کرائے کے مکان میں رہتا ہوں جو یہاں سے کافی دور ہے۔"

"پھر بھی کتنا دور؟"

"جہانگیر آباد میں! تم کبھی جہانگیر آباد گئی ہو؟"

"نہیں۔ لیکن اب دیکھ لوں گی ایک بات ہے۔ تمہارا لب و لہجہ بنگالیوں ایسا نہیں۔"

"تم بھی تو بنگالن دکھائی نہیں دیتیں۔ کتنی سلیس اردو میں باتیں کر رہی ہو"

"یہ زبان تو میں نے ملنے والوں سے سیکھی ہے۔ اور پھر میری پیدائش بھی تو یہیں کی ہے"

"لیکن۔ تھوڑی دیر پہلے تم جو کوچوان اور مینجر سے باتیں کر رہی تھیں وہ کون سی زبان تھی؟" شمیم کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ پھر کہنے لگی۔

"وہ ہماری "خفیہ" زبان ہے بابو! ۔ خالص دھندے والی اور کاروباری زبان۔ ہم دھندے والیاں گاہکوں کے سامنے اسی زبان میں باتیں کرتی ہیں تاکہ گاہک انہیں سمجھ نہ سکیں۔ ورنہ ہماری مٹی پلید ہو کر رہ جائے"

باتیں کرتے کرتے خاصی دیر ہو گئی تھی۔ شام کے سائے ڈھلنے لگے تھے اندھیرا پھیل رہا تھا۔ سڑکوں پر قمقمے جل اٹھے تھے اور ایک "ملگجا" دبیز سا غبار اور دھواں سا دور دور تک چھا گیا تھا۔

"تو یہ روپے نہیں لو گی؟" موسیٰ نے نیم دلی سے دریافت کیا۔

"نہیں۔ بابو! ۔ انہیں جیب میں رکھو" شمیم نے مسکرا کر جواب دیا اور

پھر جنگلے پہ ہاتھ رکھ کر منہ ہی منہ میں کچھ گنگنانے لگیں۔

"تو پھر چلو۔ دیر ہو رہی ہے" موسیٰ نے متشکرانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تم چلو۔ بابو!۔ مجھے آج رات یہیں بسر کرنی ہے" شمیم نے کچھ اداس ہو کر جواب دیا۔

"اچھا تو پھر میں جاؤں؟"

"ہاں۔ تم جا سکتے ہو۔ کبھی کبھی ملتے رہا کرو"

"کیوں نہیں۔ کیوں نہیں" موسیٰ بشاشت سے ہکلایا۔ اور خدا حافظ کہہ کر سیڑھیوں پہ اترنے لگا۔

"سنو۔ تمہارا نام کیا ہے بابو؟" شمیم نے پیچھے سے آواز دی۔ موسیٰ نے قدم روک کر گردن موڑی اور کہا۔

"میرا نام موسیٰ ہے !۔ موسیٰ جیسوری !" اور پھر تیزی سے نیچے اتر آیا۔ ایک ساتھ دو دو سیڑھیاں پھلانگتا وہ بڑی سرعت سے ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ جیسے جھوٹ کا پلندہ اس کا تعاقب کر رہا ہو!۔ کون کسبی تھا؟ کون کاروباری تھا؟ وہ خود یا شمیم؟۔ وہ نادم و شرمسار سڑک پر بڑھتے سوچ رہا تھا۔ پھر جگمگاتی روشنیوں اور بے پناہ ہجوم میں ایسا گم ہوا کہ اپنے صریح دھوکے اور شمیم کا بھولپن تک اس کے دماغ سے محو ہو گیا۔

"مجھ کو امن اور تہذیب کی بھیک دے" بھیڑ میں گم موسیٰ کے کانوں میں ایک ریکارڈ کے یہ بول گونجنے لگے۔ اس کے دل میں بے پناہ درد کے ریلے

سے سر اٹھایا۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسو مچلنے لگے۔ اس نے چاہا دھاڑیں مار مار کر رو دے۔

یہ وزیٹرز آور تھا ہسپتال کے باہر موٹریں، رکشے اور تانگے کھڑے تھے۔ آہنی پھاٹک آدھا کھلا اور آدھا بند تھا۔ اندر کی جانب خاکی وردی پہنے دربان کھڑا آنے جانے والوں کو ایک ایک کر کے دیکھ رہا تھا۔ سوٹوں میں ملبوس اور امیر کبیر ملاقاتیوں سے وہ کوئی استفسار نہ کرتا، بلکہ بڑے ادب سے ایک طرف ہٹ کر انہیں راستہ دیتا۔ اور ماتھے پر ہاتھ لے جا کر سلام بھی کر لیتا۔ اس کے برعکس انہیں ٹوکتا جو معمولی کپڑوں میں ملبوس ہوتے، مریض کا نام، بستر نمبر اور وارڈ ضرور دریافت کرتا۔ بعضوں کو وہ جھڑک دیتا کہ ملاقات کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ وہ کل آئیں۔ اس میں شک نہیں ملاقات کا وقت قریب الاختتام تھا اور دیر سے آئے ہوئے ملاقاتیوں کے داخلے کا انحصار محض دربان کی خوشنودی پر منحصر تھا۔

پھاٹک کے قریب کھڑا ہو کر سوچنے لگا کہ وہ اندر جانے کی ہمت کرے یا ملاقات کل پر ملتوی کر دے۔ پھر اس نے سوچا، کل کی مصروفیات شائد اسے مہلت نہ دیں اس لئے جرأت سے کام لے کر وہ ادھ کھلے دروازے میں داخل ہوا اور دربان کی نگاہوں میں نگاہیں ڈالے آگے بڑھ گیا۔ چند قدموں کے فاصلے تک اس کے کان کھڑے رہے، پھر دربان کا خیال اس کے ذہن سے محو ہو گیا اور وہ اپنے بیمار دوست کے متعلق سوچتا آگے بڑھتا گیا ٹی بی وارڈ دائیں جانب اتھا تھا۔ سیڑھیاں چڑھ کر وہ وارڈ کے برآمدے میں داخل

ہوا۔ بائیں جانب کھلا میدان تھا جس میں جا بجا پھولوں کی کیاریاں اور درمیان میں فوارے سے پانی اچھل اچھل کر حوض میں گر رہا تھا۔ حوض کے چاروں طرف سیمنٹ کے بینچ لگے ہوئے تھے جن پر کہیں مریض اور کہیں ملاقاتی عورتیں بیٹھی آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔

برآمدے میں بڑھتے اچانک وہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ مخالف سمت سے شمیم نقاب اٹھائے چلی آ رہی تھی۔ قریب آ کر موسٹی نے محسوس کیا کہ وہ کافی دیر سے روتی رہی ہے۔ اور اس وقت بھی اس کی آنکھیں نم آلود تھیں۔

"تم یہاں کہاں شمیم؟" موسٹی نے حیرت کا اظہار کیا۔

"میری بہن کل سے بیمار ہو گئی ہے۔ میں اسے دیکھنے آئی تھی۔" شمیم نے جواب دیا اور پھر ادھر ادھر دیکھنے لگی جیسے کسی کی آمد کی توقع ہو۔ "چلو وہ سامنے بینچ پر بیٹھ کر باتیں کریں۔ بابو! میں بڑی مصیبت سے دوچار ہو گئی ہوں۔"

ایکبارگی موسٹی نے چاہا اسے ٹال دے۔ ایسی بدنام لڑکی سے گفتگو کرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ پھر اس نے سوچا۔ یہاں اسے کون جانتا ہے۔ دو تین منٹ ہی کی تو بات ہے۔ کھڑے کھڑے باتیں کر کے وہ اسے رخصت کر دے گا۔ آخر پچھلی رات اس نے کتنی فیاضی اور دریا دلی کا ثبوت دیا تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتی تو اس کے کپڑے تک اتروا لیتی۔

موسٹی نے ہامی بھر لی اور دونوں برآمدے کی سیڑھیوں پر سے اتر کر لان کی طرف بڑھے اور پھر ایک خالی بینچ پر ساتھ ساتھ بیٹھ گئے۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد موسٹی

نے محسوس کیا جیسے شمیم رو رہی ہو۔ پھر اس کی سسکیوں کی آواز ابھرنے لگی اور وہ بینچ کی پشت پر سر رکھ کر زار و قطار رونے لگی۔ موسیٰ مخمصے میں گرفتار سوچتا رہا آخر ایسی کیا افتاد آن پڑی تھی جس نے ایسی لاابالی طبیعت والی شوخ اور چنچل لڑکی کو رونے پر مجبور کر دیا تھا۔ انسان ہے بیمار ہو ہی جاتا ہے۔ اس کی بہن بیمار ہو گئی تو اس میں اچنبھے کی کیا بات ہے۔ آج نہیں تو کل وہ تندرست ہو جائیگی۔

"گھبراؤ نہیں شمیم!۔ تمہاری بہن تندرست ہو جائے گی۔" موسیٰ نے اسے تسلی دی۔ پھر اس نے شمیم کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ اسے برسوں سے جانتا ہو۔ درحالیکہ یہ ان کی دوسری ملاقات تھی۔ "کیا وہ بہت بیمار ہے؟"

"بیمار؟" شمیم نے سر اٹھایا اور ہچکی لے کر کہا "وہ مر رہی ہے بابو۔ کل رات اس نے کپڑوں پر تیل چھڑک کر اپنے آپ کو آگ لگا دی تھی۔"

موسیٰ کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اور دل ڈوب کر رہ گیا۔

"کپڑوں کو آگ لگا دی تھی؟ مگر کیوں؟"

"میری وجہ سے بابو!۔ میں نے اسے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ لیکن میں جھوٹ بول رہی ہوں بابو!۔ یہ محض ملامت کا احساس ہے جو میری زبان سے جھوٹی باتیں اگلوا رہا ہے۔ میں جانتی تو اس سے پہلے میں خودکشی کر لیتی۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے بابو! منہ ہی تو کالا کرنا ہے۔ چاہے تمہارے ساتھ ہو یا اپنے بہنوئی کے ساتھ منہ کالا کیا تو میری بہن کو کیوں برا لگا؟۔ کیا وہ

نہیں جانتی تھی کہ ان کی شادی سے پہلے یہی میرا بہنوئی کئی بار میرے ساتھ منہ کالا کر چکا تھا۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی میری بہن نے اسی شرابی اور بدمعاش لچے لفنگے کو میرا بہنوئی بنا کر میرے اوپر مسلط کر دیا تھا۔ اور پھر وہ دونوں میری ہی کمائی تو کھا رہے تھے۔ کل رات میں نے ہوٹل میں کافی دیر تک تک گاہک کا انتظار کیا۔ لیکن کوئی بھی نہ آیا۔ میں جانتی تھی کہ میری بہن میری بات پر یقین نہیں کریگی۔ وہ سمجھیگی میں نے تیس روپے کمائے تو ہیں لیکن اپنے لیئے رکھ لیئے ہیں۔ اس لئے میں بغیر روپے کمائے گھر جانا نہیں چاہتی تھی۔ اتنے میں میرے بہنوئی آگئے اور مجھے کہنے لگے کہ دیدی فلم دیکھنے گئی ہے گھر میں کوئی نہیں ہے۔ ساتھ ہی مجھے بھوک بھی لگی ہوئی تھی۔ میں بہنوئی کے ساتھ ہولی اور گھر جاکر ہم دونوں نے ایک ساتھ کھانا کھایا۔ وہ ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی نشے میں چور تھا کھانا کھاکر پہلے تو میرا بہنوئی فحش مذاق کرتا رہا۔ پھر وہ دست درازی پر اتر آیا۔ میری بہن گھر میں اس وقت داخل ہوئی جب ہم دونوں ؟ اپنی دانست میں میں نے اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ لیکن بہن کی قہر آلود نگاہوں سے میں جھینپ گئی اور اپنا جسم چادر سے ڈھک لیا تھا۔ میری بہن نے نفرت سے مجھ پر اور میرے بہنوئی پہ تھوکا اور پھر دندناتی کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں اور میرے بہنوئی ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ گئے۔ تب باورچی خانے سے ایک ساتھ شعلے بھڑکے اور دلدوز چیخیں سنائی دیں۔ لیکن ہمارے پہنچنے سے پہلے پہلے آگ کے شعلے اپنا کام کر چکے تھے۔ اور اب وہ ہسپتال میں پڑی دم

توڑ رہی ہے۔ اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں۔ لیکن میں پوچھتی ہوں بابو!۔ میری بہن اتنی غیرت والی تھی تو وہ مجھے یہ دھندا ہی کیوں کرنے دیتی تھی؟۔ میرے لئے تو سب مرد برابر ہیں!۔ سب مرد برابر ہیں!!،، شمیم نے ہچکیوں میں یہ ساری داستان سنائی اور پھر تاسف سے بنچ کی پشت پر سر رکھ کر، اپنا چہرہ کھردرے پتھر سے رگڑنے لگی۔ ،، میرے لئے سب برابر ہیں!۔ میرے لئے سب برابر ہیں!! وہ ہچکیاں لیتی بدستور بڑبڑاتی رہی۔

" مجھے بڑا افسوس ہے شمیم!" موسیٰ نے ہمدردی جتائی۔ ،، میں تمہاری بہن کی صحت کے لئے دعا کرتا ہوں۔ اور،، تمہارا بہنوئی اب کہاں ہے؟"

،، وہ مردود حوالات میں ہے۔" شمیم نے آہ بھر کر کہا۔ ،، خدا کرے وہ پھانسی کے تختے پر چڑھے۔ شروع شروع میں جب میری بہن ہوش میں تھی تو اس نے پولیس والوں کو بیان دیا تھا کہ اس کے کپڑوں پر تیل اس کے خاوند نے چھڑکا تھا اور آگ بھی اسی نے لگائی تھی۔ لیکن اب میرا کیا بنے گا بابو؟ میرا تو اب کوئی بھی نہیں رہا!!،، شمیم دوبارہ رو دی اور پھر دیر تک سسکیاں بھرتی رہی۔ موسیٰ نے ہمدردی کے چند مزید رسمی جملے کہے اور گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے خالی خالی نگاہوں سے شمیم کی طرف دیکھا اور پھر خدا حافظ کہنا شمیم کو وہیں چھوڑ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا برآمدے کی اور بڑھا۔ پہلی سیڑھی پر قدم رکھ کر اس نے مڑ کر دیکھا، شمیم اس کی طرف ہکا بکا حیران سی بیٹھی دیکھ رہی تھی۔ موسیٰ دل ہی دل میں اپنی کمزوری پر کڑھنے لگا۔ پھر اس نے اپنے آپ کو یوں تسلی دی کہ ایک وہ ہی تو نہیں، شمیم کی جان پہچان

کے اور بھی بہت لوگ ہوں گے۔ آخر کوئی تو اسے سہارا دے ہی دیگا۔

بخت جمال کے سرہانے ایک سٹول پر بیٹھ کر وہ ٹکر ٹکر اپنے دوست کی طرف دیکھتا رہا جس نے آنکھیں موند رکھی تھیں۔ اور دونوں ہاتھ سینے پر باندھے ہوئے تھے۔ اس کے ستے ہوئے زرد چہرے سے ویرانی جھلک رہی تھی۔ ہونٹوں پر پپڑیاں سی جمی ہوئی تھیں۔ گال پچک گئے تھے اور چہرے پر گوشت کی بجائے ہڈیاں ہی ہڈیاں اُبھر آئی تھیں۔ یکبارگی بخت جمال کھانسا اور پھر آنکھیں کھول کر دیر تک کھانستا چلا گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ سینے پر یوں جما رکھے تھے جیسے کوئی شے اندر سے باہر آنا چاہتی ہو اور وہ اسے روکنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کی آنکھیں اور بھی اندر کو دھنس گئی تھیں اور پتلیوں میں زرد جھلی سی تیر رہی تھی۔ کھانستے کھانستے وہ بے حال ہو گیا اور اس کا سر تکیے سے آپ ہی آپ لڑھک کر سفید چادر پر ٹک گیا۔ موسیٰ نے ہاتھ بڑھا کر اس کا سر دوبارہ تکیے پر ٹھیک طور سے جمایا۔

"کیا بات ہے تمہارے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں؟" بخت جمال نے کھانسی کے دوران رک رک کر نحیف و نزار آواز میں کہا اور موسیٰ بغلیں جھانکنے لگا۔ پھر شرمندہ سا ہو کر بخت جمال کے ماتھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"اب طبیعت کیسی ہے؟"

"ٹھیک ہوں۔" بخت جمال کے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ جم کر رہ گئی جس میں طنز ہی طنز بھرا ہوا تھا۔ موسیٰ کا دل اپنے دوست کی محبت سے لبریز ہو گیا اس نے آہستگی سے وہی ہاتھ بخت جمال کے سوکھے اور بے جان ہاتھ پر

رکھ دیا۔ اور اسے آہستہ آہستہ سہلانے لگا۔

"غم نہ کرو۔ تم بہت جلد تندرست ہو جاؤ گے۔ میں تمہارے لئے کوئی فروٹ وغیرہ لانا چاہتا تھا پھر سوچا پہلے معلوم کر لوں کہ تمہارا کن کن چیزوں سے پرہیز ہے۔ ویسے تمہاری صحت بحال ہو رہی ہے۔ بس ذرا ہمت نہ ہارنا۔ ہم پھر ایک ساتھ رہیں گے اور رات رات بھر باتیں کریں گے اور جاگتے رہیں گے۔ اس دن میں تنور پر روٹیاں پکوانے گیا تو وہ بھٹیارن کی بیٹی تمہیں پوچھ رہی تھی۔ بھٹیارن تو تمہیں بہت دعائیں دے رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ تم نے کسی آڑے وقت میں اس کی مدد کی تھی۔"

موسیٰ نے دیکھا ایک خوبصورت سی، دُھلے دُھلائے سفید کپڑوں میں ملبوس نرس اپنے کمرے سے نکلی اور وارڈ میں آ کر دائیں جانب پہلے مریض کو دوا پلانے لگی۔ دوا پلا کر مریض کے منہ میں تھرمامیٹر رکھا اور اس کی نبض پر انگلیاں رکھ کر نگاہیں اپنی کلائی کی گھڑی پر جما دیں۔

"اور کیا حال چال ہے؟ وقت کیسے گذر رہا ہے؟" موسیٰ نرس کی طرف دیکھتے اپنے دوست سے مخاطب ہوا۔ نرس نے ایک پاؤں تپائی کے دوسرے خلانے پر رکھ دیا تھا اور چارٹ کو گھٹنے پر رکھ کر کچھ خانہ پری کر رہی تھی۔

"تم نے اچھا نہیں کیا۔ میرے گھر والوں کو اطلاع کر دی" بخت جمال نے اداس ہو کر کمزور سی آواز میں کہا۔ "میں غریب الوطنی کی موت چاہتا تھا"

"ایسا نہ کہو یار! تو کیا گھر سے کوئی خط وط آیا ہے؟"

"خط کیا خطوط کہو۔ ماں الگ لکھتی ہے۔ بہنیں الگ۔ اور وہ میری چچازاد بہن بھی، جن کی بدولت میں یہ در در کی خاک چھان رہا ہوں۔ اس کے علاوہ پرسوں سے میرے چچا آئے ہوئے ہیں۔ وہ مجھے گھر لے جانا چاہتے ہیں۔ شکر ہے۔ ڈاکٹروں نے اجازت نہیں دی ورنہ میں کہیں کا نہ رہتا"

بخت جمال پر دوبارہ کھانسی کا شدید دورہ پڑا اور وہ دیر تک تکیے پر سر پٹختا کھانستا رہا۔ وہیں کھڑے نرس نے گردن موڑ کر بخت جمال کی طرف دیکھا جو بے طرح کھانسے جا رہا تھا۔ پھر چارٹ کو مریض کے سرہانے لٹکا کر وہ سیدھے بخت جمال کی طرف آئی۔

"آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟" نرس نے موسیٰ سے پوچھا۔ بخت جمال کی کھانسی تھی کہ رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ موسیٰ نے نرس کے سوال کو نظر انداز کر کے کہا۔

"سسٹر!۔ آپ نے دیکھا میرے دوست پر کھانسی کا دورہ پڑا ہے۔ کیا آپ ڈاکٹر کو نہیں بلائینگی؟"

"میں پوچھتی ہوں۔ آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟" سسٹر نے بدستور اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔

"میں اپنے دوست کو دیکھنے آیا تھا!" موسیٰ نے اطمینان سے جواب دیا۔

"لیکن ملاقات کا وقت تو کب کا ختم ہو چکا۔ مسٹر! کیا آپ نہیں چاہتے کہ آپ کا دوست تندرست ہو جائے؟"

"کیوں نہیں۔ کیوں نہیں،" موسیٰ نے بخت جمال کی طرف دیکھ کر کہا جس کی کھانسی ختم گئی تھی اور اب وہ گہرے گہرے سانس لیتا آنکھیں میچے لیٹا ہوا تھا۔

"تو پھر مہربانی کرکے چلے جاؤ۔ اور آئندہ وقت پر آیا کرو ورنہ ملاقات کی اجازت نہیں ملیگی۔"

"بہت اچھا! سسٹر!۔ آپ کی مہربانی کا تہہ دل سے شکر گذار ہوں۔" موسیٰ نے ایک بار اور اپنے بیمار دوست کی طرف دیکھا جو بدستور آنکھیں موندے لیٹا ہوا تھا۔ موسیٰ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنے دوست کو الوداع کہی اور وارڈ سے باہر آگیا۔ باہر اندھیرا پھیل چکا تھا۔ وارڈ کے برآمدے، لان کے اردگرد اور پھاٹک اور ایمرجنسی روم سب جگہ قمقمے جل رہے تھے۔ دودھیا سفید قمقمے سبز قمقمے اور سرخ قمقمے، اٹھتے اندھیرے کی دبیز چادر کو چیر رہے تھے۔ مغرب میں بہت دور کہیں بادل گرج رہے تھے اور بجلی چمک رہی تھی۔ ہسپتال سے باہر چائے کی چھوٹی سی دکان کے سامنے رکشا کھڑا تھا۔ اور رکشا والا کیبن میں گھسا چائے پی رہا تھا۔ موسیٰ بھی کیبن کے اندر چلا گیا۔ اور رکشا والے سے پوچھا۔

"یہ رکشا آپ کا ہے؟"

"جی نہیں۔ میرا تو نہیں ہے لیکن میں اسے چلاتا ہوں۔" چائے کی چسکی بھر کر رکشا والے نے مسکرا کر مذاق کیا۔

"جہانگیر آباد چلو گے؟" موسٰی نے جھلائے اور خشک لہجے میں کہا

"کیوں نہیں صاب! ۔ اجازت ہے چائے پی لوں؟" رکشا والا ہنس دیا۔ اور موسٰی نگاہ پھیر کر دل ہی دل میں کڑھنے لگا۔

"وہ عورت مر گئی ہے" رکشا والا کیبن والے سے مخاطب ہوا۔

"جس کی "ٹیکسی" چلتی تھی" رکشا والا ہنستے ہوئے اپنے زرد دانتوں کی نمائش کرنے لگا۔ اور موسٰی نے نفرت سے نگاہ پھیر لی۔

"کونسی عورت؟ ۔ ایک تو صبح کو مری تھی ۔ بے چاری کے پیٹ میں بچہ پھنس گیا تھا۔ اور دوسری ابھی ابھی شام کو مری ہے۔ جسے خاوند نے آگ لگا کر ہلاک کر دیا تھا۔ بے چاری کا پورا سینہ سرے سے غائب تھا۔ جیسے کوئی "مرد ہو" چائے والے نے گلاس میں چمچہ ہلاتے رکشا والے سے کہا۔

"ہاں وہی اس کی بہن میرے رکشا میں کئی بار بیٹھی ہے۔ اور مجھے منہ مانگا دام ملا ہے۔ اسی کو یار لوگ "ٹیکسی" کہتے ہیں ۔ ہے بڑی ہی طرحدار اور جی دار لڑکی۔ یوں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کرتی ہے پولیس والوں سے تو وہ ڈرتی ہی نہیں۔ ایک تھانیدار سے یارانہ گانٹھ رکھا ہے۔"

رکشہ والے اور چائے والے کی باتیں سن کر موسٰی کے کان کھڑے ہو گئے ۔ پھر اسے شمیم یاد آئی اور وہ دل ہی دل میں اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا۔

"بھئی جہانگیر آباد جانا ہو تو چلو۔ دیر ہو رہی ہے"۔ موسلی نے اکتا کر رکشہ والے سے کہا۔ رکشہ والے نے جلدی جلدی چائے کے آخری گھونٹ پیئے اور جیب سے ریزگاری نکال کر سکے گننے لگا۔

"دیکھنا یہ کتنے پیسے ہوئے؟" چند سکے کونٹر پر پھینک کر رکشہ والا چائے والے سے مخاطب ہوا۔

"ایک تو یہ نئے پیسوں کا حساب اب تک نہ آیا۔ پچیس، پچاس پچھتر اور سو پیسے تو ٹھیک ہیں لیکن اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ سات آنے کے کتنے پیسے ہوئے؟ تو میرا دل ڈوب جاتا ہے۔ ہاں تو میں نے تمہیں بیس پیسے دیئے ہیں اور تمہارے ایک گلاس کے تین آنے ہوئے حساب ٹھیک ہو گیا نا؟"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے" چائے والے نے گلاس ایک اور گاہک کی طرف بڑھاتے کہا۔ "تمہارا ایک ٹیڈی پیسہ میرے ذمہ نکلتا ہے۔ پھر کبھی آ کر لے جانا"

"رہنے دو بابا!۔ ٹیڈی پیسے کا کیا حساب ہوا۔ البتہ ٹیڈی لڑکیوں سے ہی ایک ایک ٹیڈی پیسے کا حساب لیتا ہوں۔ پتہ نہیں یہ مجھے کیوں اچھی نہیں لگتیں" رکشہ والے نے داد طلب نگاہوں سے موسلی کی طرف دیکھا لیکن موسلی نے بڑی سرد مہری کا ثبوت دیا مایوس ہو کر رکشہ والا کیبن سے باہر نکل گیا اور پھر رکشہ میں بیٹھ کر رکشہ چلا دیا۔ موسلی لپک کر پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس وقت

اس کا دماغ دو متضاد خیالات میں الجھا ہوا تھا۔ کبھی وہ اپنے بیمار دوست کے متعلق سوچتا جس کی گرتی ہوئی صحت تشویشناک حد تک بگڑ رہی تھی۔ اور کبھی وہ شمیم کے بارے میں سوچنے لگتا جو ایک کسی کی طرح ملی، پھر شناسائی ہوئی اور پھر دوست بن گئی۔ اور اس کے بعد دونوں اجنبیوں کی طرح بچھڑ بھی گئے۔ کیا پتہ وہ بخت جمال سے بھی اسی طرح بچھڑ جائے۔ یہ اسے کیا ہو رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو کوسنے لگا۔ اتنا برخود غلط تو پہلے وہ کبھی نہ تھا۔ جتنا وہ اس وقت اپنے آپ کو محسوس کر رہا تھا۔

اس روز بارہ یا ایک بجے دوپہر تک موسٰی نے بڑی دلجمعی اور بغیر کسی بیرونی مداخلت کے دفتر میں کام کیا۔ ایک منٹ کے لئے بھی سیٹ سے نہ ہلا۔

صبح جب مس نہلا اور برکت مسیح وغیرہ اس کے کمرے میں حاضری لگانے آئی تھیں تو اُن کے ساتھ مس ہارون بھی یوں چلی آئی تھی جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ ایک لحظہ کے لئے موسٰی کا دل دھڑکا ضرور تھا مگر پھر اس نے اپنے آپ پر قابو پالیا اور اپنے کام میں مگن ہو کر مس ہارون کو یوں نظرانداز کر دیا جیسے وہ موجود ہی نہ ہو۔ تب اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے" اس نے مطمئن ہو کر سوچا۔ "جتنی ان لڑکیوں کو کوئی اہمیت دے، یہ اتنی ہی سر پر چڑھنے لگتی ہیں۔"

کافی دیر تک لڑکیاں کھڑے آپس میں باتیں کرتی رہیں اور موسٰی

بڑی توجہ سے اپنے کام میں مصروف رہا۔ کبھی وہ دن تھا۔ موسیٰ سوچنے لگا کہ وُہ ان لڑکیوں کی محفل، اُن کی میٹھی باتوں اور نقرئی قہقہوں کے لئے ترستا تھا اور آج اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے اُن پر نہیں، اس نے اپنے آپ پر فتح پالی ہے۔ جیسے وہ بہت اونچی جگہ پر کھڑا ہو اور یہ لڑکیاں جیسے اس کے سامنے چیونٹیاں سی لگ رہی تھیں۔ احساسِ برتری سے اُس کے دل میں شگوفے سے پھوٹنے لگے تھے۔ "تو یہ بات ہے!" اُسے اپنے آپ پر فخر محسوس ہونے لگا۔

پھر یہ محفل برخاست ہوئی۔ لڑکیاں کب گئیں۔ اُسے خبر نہ ہوئی۔ ایک پر ایک ہی کھاتہ کھلتا گیا اور اس کے قلم کی نوک لکھتی چلی گئی یہاں تک کہ کئی روز کا رُکا ہوا کام چار پانچ گھنٹوں ہی میں نبٹا لیا گیا۔ اور جب وہ بدن میں کچھ تھکاوٹ سی محسوس کرنے لگا تو اُس نے قلم میز پر رکھ دیا۔ چند مکمل شدہ بہی کھاتے چپڑاسی کے حوالے کر دئے کہ وہ انہیں ناظم صاحب کے دفتر میں میز پر رکھ دے اور جب دستخط ہو جائے تو واپس لے آئے۔ چپڑاسی کو ہدایت کر کے وُہ اپنے کمرے سے باہر نکلا اور اپنے رفیق بابوؤں کے دفتر میں جا کر گپیں ہانکنے لگا۔ آج وہ بہت خوش تھا اور دل کھول کر فلک شگاف قہقہے لگاتا رہا۔ وُہ اپنے آپ کو بڑا ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ جیسے اس کے ذہن سے منوں بوجھ اُتر گیا ہو۔

کلرکوں سے باتوں کے بعد اس نے دوسرے کمرے کا رُخ کیا۔ جہاں اس کی دوستی کا دم بھرنے والی مس امتیاز بیٹھی، اپنے میز پر جھکی کوئی کام کر رہی تھی۔

مس امتیاز نے ہلکی مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا۔

"آج تو بڑے زوردار قہقہے لگا رہے تھے آپ؟" مس امتیاز پنسل کی نوک سے گردن کھجلاتی اس سے مخاطب ہوئی۔

"ہاں۔ قہقہے زندہ دلی کے ضامن گردانے جاتے ہیں اور پھر صحت کے لئے کبھی کبھی قہقہے لگانے بھی چاہئیں" موسٰی نے جواب دیا اور پھر کرسی پہ بیٹھ گیا۔ مس امتیاز کے ہونٹوں پر بدستور پپڑیاں جمی ہوئی تھیں اور پپوٹے سوجے سوجے سے لگ رہے تھے۔ اس کے چہرے پر نسوانی تروتازگی، ملائمت اور نکھار نام کو نہ تھا۔ اس کے باوجود وہ ایک بھرپور عورت تھی۔ خصوصاً اس کے سینے کا ابھار بلا کی کشش رکھتا تھا۔ اُسے ٹالسٹائی کے ناول "جنگ اور امن" پر مبنی فلم کی وہ کردار یاد آئی جس نے بیوی ہو کر ہیرو یعنی ٹالسٹائی سے دغا کی تھی اور اُسے طلاق دینے پر مجبور کیا تھا۔ کیا نام تھا بھلا اُس کا؟ وہ سوچنے لگا۔ ہے تو بڑی مشہور ایکٹریس لیکن اسوقت نام ذہن سے اُتر گیا ہے۔

"مس امتیاز آپ نے وہ فلم دیکھی تھی "جنگ اور امن"؟"

"ہاں دیکھی تھی" مس امتیاز نے جھٹ سے جواب دیا اور پھر بڑی دلچسپی سے موسٰی کی طرف دیکھنے لگی۔ موسٰی جانتا تھا کہ مس امتیاز ہر انگریزی فلم اور کبھی کبھار اُردو فلمیں بھی دیکھا کرتی تھی۔

مطالعہ اور فلم بینی یہی دو شوق تھے جنہیں وہ ہر قیمت پہ پورا کیا کرتی تھی۔ کوئی انگریزی فلم سہو نظر ہو جائے، یہ ممکن ہی نہ تھا۔

"اُس ایکٹریس کا کیا نام ہے جس نے ہیرو کی پہلی بیوی کا کردار ادا کیا تھا۔

وہ بھرے بھرے سڈول جسم والی عورت۔ بھلا سا نام ہے اس کا۔ اب یاد نہیں آرہا" موہنی نے اس کے سینے پر نظریں جما کر پوچھا۔

"اس فلم میں دو مشہور ایکٹرسوں نے کام کیا تھا۔ ایک آڈری ہیپ برن اور دوسری اینتا ایکبرگ"

"ہاں وہی۔ اینتا ایکبرگ۔ اینتا ایکبرگ" موہنی نے دہرایا۔ "ویسے دونوں نے اپنا کردار خوب نبھایا تھا۔ مجھے تو یوں لگ رہا تھا جیسے ہیرو خود ٹالسٹائی ہو۔ یا پھر ٹالسٹائی کی روح اس میں حلول کر گئی ہو۔ آپ نے بھی محسوس کیا تھا یا نہیں مس امتیاز؟"

کچھ کہہ نہیں سکتی۔ دراصل موہنی صاحب! میں نے اب تک وہ ناول ہی نہیں پڑھا۔ گو میرے پاس موجود ہے۔ کافی عرصہ ہوا ریلوے بک سٹال سے خریدا تھا۔ لیکن بس پڑھنے کی توفیق ہی میسر نہیں ہوئی"

"خصوصاً وہ ٹچ (Touch) بہت ہی عمدہ ہے جب نپولین کی فوجیں روس پر یلغار کر رہی ہیں۔ توپیں داغی جا رہی ہیں۔ جنگ زوروں پر ہے ہیرو میدان جنگ میں کھڑا فوجوں کی پسپائی، یلغار اور کٹتے مرتے سپاہیوں کو دیکھ رہا ہے۔ اچانک اس کا پاؤں پھسلتا ہے اور وہ گر پڑتا ہے۔ ایسے میں اسے ایک خود رو سرخ پھول دکھائی دیتا ہے اور وہ ہولناک جنگ کے مکروہ مناظر بھول بھول کر پھول توڑ لیتا ہے۔ ہاتھ میں لے کر اُسے سونگھتا ہے اور پھر شاید کوٹ کے کالر میں ٹانک بھی دیتا ہے۔ دراصل وُہ اُس پھول کو امن کی علامت سمجھ کر سینے سے لگاتا ہے۔"

"شاید ایسا ہی ہو۔ میں فلم بین ضرور ہوں لیکن اتنی باریک بین نہیں۔ ایسے باریک نکتے تو کوئی ادیب ہی سوچ سکتا ہے۔"

"نہیں میرا خیال ہے مس امتیاز! آپ میں جمالیاتی حس سب سے زیادہ ہے۔ وہ فلم آپ کو یاد نہیں رہی۔ ورنہ اس سے بھی باریک نکتے آپ نکال لاتیں۔ میں نے اندازہ لگا لیا ہے کہ آپ بڑی ذہین اور حساس واقع ہوئی ہیں۔"

"خیر ذہانت کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ ڈگریاں حاصل کر لینا، کوئی ذہانت کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ البتہ میں حساس ضرور ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ میں کافی حد تک زود رنج بھی ہوں۔ ذرا سی بات ہو جائے تو پہروں سوچتی رہوں گی کہ ایسا کیوں ہوا۔ اور زود رنج تو اتنی کہ ناظم کسی بات پر جھڑک دیں تو گھنٹوں روتی رہتی ہوں۔ اکثر روٹھ بھی جایا کرتی ہوں۔ دفتر کو بھی میں نے اپنا گھر سمجھ رکھا ہے۔ بہت جلد اثر قبول کر لیتی ہوں اب اسی بات کو لیجئے! لوگ دوسروں کے پاس جا کر گھنٹوں باتیں کرتے ہیں اور میں یہاں اکیلی بیٹھی کڑھتی رہتی ہوں اور پھر اگر میں بھولے سے کسی محفل میں چلی بھی جاتی ہوں تو سب یوں چپ سادھ لیتے ہیں۔ جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ آخر مجھ میں کوئی خامی ضرور ہو گی جو لوگ مجھ سے ملتے یا باتیں کرنے سے کتراتے ہیں اور مجھ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں۔"

موہنی کو یوں لگا جیسے بلا واسطہ وہ اسی سے مخاطب ہو اور اسی کے رویّے کی شاکی بھی ہو۔

"میرے خیال میں ایسی تو کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ میں نے تو اکثر رفقائے کار میں آپ کی تعریفیں ہی سنی ہیں۔ اور پھر یہ تو محفل پر منحصر ہے، جہاں جم گئی سو جم گئی۔ آپ نے دیکھا ہوگا۔ یہی محفل کبھی کبھی ناظم صاحب کے دفتر میں بھی جم جایا کرتی ہے اور پھر جو غل غپاڑہ مچتا ہے، جو قہقہوں اور لطیفوں کی پھلجھڑیاں چھوڑی جاتی ہیں اور چائے کے دَور چلتے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے، کیا آپ کے ناظم و مربی حاتم طائی کے بیٹے ہیں؟ نہیں بلکہ محض محفل کو گرمانے کے لئے وُہ بار بار چائے کے دور چلاتے ہیں اور یہی محفل آپ کے دفتر کو بھی تو کبھی کبھی رونق بخشتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مس ہارڈن کے ہاں اہلکار کچھ زیادہ ہی اکٹھے ہو جایا کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کم از کم آپ کو مجھ سے تو ایسی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ سچ تو یہ ہے مس امتیاز! اس شعبے میں سب سے زیادہ آپ ہی کی قدر کرتا ہوں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ہمارے مابین کچھ قدریں مشترکہ ہیں۔ مثلاً آپ بھی حسّاس ہیں اور میں بھی سمجھتا ہوں میں بھی کچھ کم حساس نہیں۔ تھوڑا بہت تو ہر ایک جذباتی واقع ہُوا ہے۔ لیکن شاید ہم دونوں ضرورت سے زیادہ جذباتی ہیں۔ اب اسی بات لیجئے کہ آپ محض اپنے چچا کی تنہائی اور اکیلے پن کو ملحوظِ خاطر رکھ کر شادی نہیں کرنا چاہتیں۔ آپ کے چچا کی حالت قابلِ رحم ہے مس امتیاز! بے چارے کو اس کی بیوی اور لڑکا چھوڑ چکے ہیں کیا وہ امریکن تھی؟ —— نہیں۔ تو شاید انگریزن ہوگی۔ خیر کوئی بھی ہو۔ غیر ملک کی تو رہنے والی تھی تبھی تو اُسے تنہا چھوڑ کر اپنے ملک سُدھار گئی اور ساتھ ہی اکلوتے، واحد وارثِ جائداد لڑکے کو بھی لے گئی۔

دس برس کوئی تھوڑی مدت نہیں ہوتی۔ مجھے آپ کے چچا پہ بڑا ترس آتا ہے یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ انسان زندگی بھر بیوی اور اولاد کو ترستا رہے پھر اُسے یہ بھی معلوم ہو کہ وہ دونوں زندہ ہیں اور وہ عارضی علیحدگی، مستقل داغِ مفارقت میں تبدیل ہو گئی ہے، بھئی قابلِ ستائش ہے۔ آپ کا یہ اقدام! لیکن مس امتیاز! زندگی یوں خشک اور بے رونق بھی تو بسر نہیں ہو سکتی۔ زندگی گذارنے کے لئے کوئی نہ کوئی وسیلہ تو ہونا چاہیئے۔ مجھے یقین ہے۔ ایک نہ ایک دن آپ کو درمیانی راستہ اختیار کرنا ہو گا۔ پتہ نہیں یہ درمیانی راستہ کونسا ہو سکتا ہے؟ میرے خیال میں عورت اور مرد کے تعلقات میں درمیانی راستہ ہو ہی نہیں سکتا یا اُس پار ـــــ یا اِس پار ـــــ بس جو بھی قدم اُٹھانا ہو، سوچ سمجھ کر اُٹھانا چاہیئے۔ آخر شادی بیاہ کوئی بچّوں کا کھیل تھوڑا ہی ہے۔ معاف کرنا، میں کچھ ضرورت سے زیادہ باتونی ہو گیا ہوں۔ آپ نے بُرا تو نہیں مانا؟"

"نہیں نہیں آپ بولتے چلے جائیے" مس امتیاز مسکرائی اور پھر آپ ہی آپ جھینپ سی گئی اور نگاہیں نیچی کر لیں۔ موتی نے چاہا وہ گفتگو میں دلچسپی برقرار رکھے تاکہ مس امتیاز کی توجہ کہیں کھو نہ دے۔

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا حالات بدلتے دیر نہیں لگتی۔ ممکن ہے ایک وقت آ جائے کہ آپ کو اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کرنی پڑے۔ تب آپ نے کیا سوچ رکھا ہے۔ میرا اشارہ زندگی کے ساتھی کی طرف تھا۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ کو امیر شوہر ایک آنکھ نہ بھائے گا۔ ویسے امیر خاندان سے تو آپ خود بھی تعلق رکھتی ہیں۔ نہیں؟ ـــــ خیر نہ سہی۔ آپ ذرا کسرِ نفسی سے کام لے

رہی ہیں۔ ورنہ یہ آپ کی موٹریں، اور وہ نئی کالونی میں نیا اور شاندار بنگلہ جسے دکھانے کا آپ مجھ سے وعدہ کر چکی ہیں، سب امارت کی نشانیاں ہیں۔ ہم نے تو اٹھارہ بیس برس فوج کے دھکے کھائے ہیں۔ لیکن کوٹھی تو کیا، ایک جھگی بھی ایسی تعمیر نہ کر سکے جسے ہم اپنا کہہ سکیں۔ خیر یہ تو سب مقدر کی باتیں ہیں اور جیسے عشق پر زور نہیں چلتا ویسے ہی مقدر پر بھی کسی کا زور نہیں۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا آپ کس قسم کا شوہر اپنے لئے پسند کریں گی؟

آپ نے بُرا تو نہیں مانا؟"

مس امتیاز کھلکھلا اٹھیں اور پھر سنجیدہ ہو کر بولیں۔

"شادی کے معاملے میں میں آزاد خیال ہوں اور میں سمجھتی ہوں ہر عورت کا پیدائشی حق ہے کہ وہ اپنے لئے خود شوہر منتخب کرے۔ کبھی کبھی میرے چچا بھی یہ بحث چھیڑ دیتے ہیں میں نے اُن سے کہہ رکھا ہے کہ میں ایک کلرک سے بھی شادی کر سکتی ہوں بشرطیکہ وہ میرا ہم خیال ہو۔ لیکن موسلی صاحب! بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ عورت کی نسبت مرد زیادہ بے وفا ثابت ہوئے ہیں۔ اس نے ہمیشہ عورت ذات کو دھوکہ دیا ہے۔

میری ایک ہم جماعت سہیلی تھی۔ میرے ساتھ اس نے عمرانیات میں ایم اے کیا تھا۔ چندے آفتاب چندے مہتاب تھی۔ جب وہ سڑک پر گذرتی تو ہر ایک آنکھ اس کا دُور تک تعاقب کرتی۔ ہمارے اپنے ہوسٹل میں وہ کئی لڑکیوں کی منظورِ نظر تھی۔ پھر کیا ہُوا کہ اُس نے ایک ایسے مرد سے شادی کر لی جو برسوں اس کی محبت کا دم بھرتا تھا۔ لڑکی نے اپنی ڈگری طاقِ نسیان پر دھر دی اور

ایک ادنیٰ کنیز کی طرح اپنے شوہر کی دن رات خدمت کرتی رہی۔ لیکن آپ جانتے ہیں۔ موسٹی صاحب! اُس مرد نے اُس بے چاری کو اس کا کیا صلہ دیا؟ ٹھوکریں۔ طعنے اور گالی گلوچ۔ وہ اللہ میاں کی گائے تین برس تک شوہر شریف کی ٹھوکریں، مار پیٹ سہتی رہی، آخر مجبور ہو کر شوہر سے علیحدگی اختیار کر لی۔ حق مہر تک لینے سے انکار کر دیا۔ وہ شوہر کو ایمان سمجھے بیٹھی تھی جب شوہر ہی نہ رہا تو اس کی دولت کس کام کی ہے۔ آج وہ ملازمت کر کے اپنا اور اپنے بچے کا پیٹ پال رہی ہے۔ وہ چاہتی تو اپنے معصوم بچے کے لئے بھی معقول نان نفقہ حاصل کر سکتی تھی۔ لیکن وہ دولت کو، شوہر کی محبت کے مقابلے میں، ہیچ سمجھتی تھی اس لئے وہ چپ چپاتے شوہر کے گھر سے چلی آئی۔ مرد بے وفا نہ ہوتے تو چار چار شادیوں کی اجازت نہ لے رکھی ہوتی۔ وہ ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری عورتوں کے پیچھے مارے مارے نہ پھرا کرتے۔ آپ خود ہی سوچیں موسٹی صاحب! اگر عورت بھی یہی وطیرہ اختیار کر لے تو مردوں کی پوزیشن کیسے رہیگی؟ اور پھر ہمارا معاشرہ کیا کہے گا؟ تب کیا آپ عورت کو ننگا کر کے چوراہے میں نہ کھڑا کر دیں گے؟ مشکل تو یہ ہے کہ سماج کے کرتا دھرتا بھی مرد ذات ہیں۔ عورت کو وہ نمائندگی اسی لئے نہیں دیتے کہ کہیں وہ ان کی راہ میں حائل نہ ہو جائے اور مرد فرامے کی بے راہ روی اور عیش پرستی میں فرق نہ آجائے۔ عورت بھی انسان ہے، ویسا ہی انسان جیسے کوئی بھی مرد ہو سکتا ہے۔ یہ ناقص العقل اور کمزور اور پُر اسرار وغیرہ کے طعنے عورتوں کو اس لئے دیئے جاتے ہیں تاکہ مرد بے چاری عورت پر غالب رہیں۔ اور اس کے حقوق غصب کرتے رہیں۔"

"صاحب آپ کو سلام دے رہے ہیں" چپڑاسی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور موسیٰ سے کہنے لگا۔

"وعلیکم السلام" موسیٰ کے بجائے مس امتیاز نے ہنس کر جواب دیا۔ "ناظم صاحب سے کہیں آپ کا سلام پہنچا دیا گیا ہے۔"

"اجازت ہے مس امتیاز؟ وقت ملا تو پھر حاضر ہوں گا۔ آپ کی باتیں بڑی دلچسپ ہیں" موسیٰ نے کرسی سے اٹھتے ہوئے مس امتیاز کو مخاطب کیا۔

"ہاں مگر موسیٰ صاحب!۔ مجھے وہ فریم اب تک نہیں ملے۔ کیا شہر میں فوٹوگرافروں کا کال پڑ گیا ہے"

"یہ بات نہیں مس امتیاز!۔ شاید تصویریں بن چکی ہوں۔ میں اس طرف گیا ہی نہیں خاطر جمع رکھیں جتنا جلد ہو سکا میں وہ فریم آپ کی خدمت میں حاضر کر دوں گا۔" موسیٰ نے دروازے سے نکلتے جواب دیا اور پھر اپنے پیچھے ایک جھٹکے سے دروازہ بند کر کے برآمدے میں بڑھنے لگا۔ امتیاز اچھی لڑکی ہے۔ وہ سوچنے لگا۔ اتنی بدصورت بھی نہیں۔ بس گوارا ہے۔ اور پھر مس ہارون سے تو لاکھ درجے بہتر ہے۔

کم از کم اتنا تو ہے کہ وہ تنک مزاج نہیں۔ سیدھی سادی اور پُرخلوص ہے۔ بات بھی سلیقے سے کرتی ہے اور بڑائی کا احساس تو اسے چھو کر بھی نہیں گیا۔ میں اب تک ایک پتھر سے دل پھوڑ رہا ہوں۔ مس ہارون کے دفتر کے سامنے سے گذرتے ہوئے اس نے بڑی حقارت سے شیشوں پر تنے ہوئے رنگدار پردوں کی جانب دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔ پتہ نہیں وہ اندر بیٹھی بھی ہے یا کہیں اور چلی گئی ہے۔ کہیں بھی جاتی رہے مجھے کیا؟ بس وہ میرے منہ نہ لگے۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آخر ایک ہی شعبے

ہیں کام کرتے ہیں۔ سامنا تو کرنا ہی ہو گا۔ خیر دیکھا جائے گا۔

ناظم صاحب کے دفتر کے دروازے پر اس نے ہلکی ہلکی دستک دی اور پیتل والی مٹھی گھما کر اندر داخل ہوا۔

سامنے ناظم صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ اور اس کے بالمقابل وہی مس ہارون براجمان تھی، جسے ایک نظر دیکھنے کا بھی وہ روادار نہ تھا۔ شکر ہے مس ہارون کی پشت اس کی جانب تھی ورنہ اس کا رنگ فق ہو جاتا اور وہ تاڑ لیتی، سب کچھ تاڑ لیتی۔ دریں اثناء موسیٰ اپنے جذبات پر قابو پانے کی سر توڑ کوشش کرتا رہا۔

"بیٹھیے موسیٰ صاحب! میں ذرا فارغ ہو کر آپ سے بات کرتا ہوں۔" ناظم صاحب نے اپنے سامنے پڑے کاغذات کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتے کہا۔ بادل ناخواستہ موسیٰ بیٹھ گیا۔ البتہ اپنی کرسی ذرا پرے کھسکا لی تاکہ مس ہارون کے جسم کی گرمی اس تک نہ پہنچ سکے۔

مس ہارون بڑی شان سے بیٹھی ناظم صاحب سے گفتگو کرنے لگی جیسے موسیٰ کا ہونا نہ ہونا اس کے لئے کوئی اہمیت ہی نہ رکھتا ہو۔ "واہ کیا شانِ دلربائی ہے!" موسیٰ نے طنز سے بھرپور نگاہ مس ہارون کے سراپا پر ڈالی اور پھر ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر رکھ کر، اسے جھلانے لگا۔ گھڑیال کی ٹِک ٹِک سے چونک کر اس نے اوپر نگاہ اٹھائی، تین بج کر پندرہ منٹ ہوا چاہتے تھے اور ابھی اس نے مزید پینتالیس منٹ اس خرافہ کا سامنا کرنا تھا۔

"یہ کتابیں نہایت اہم ہیں ڈاکٹر صاحب!" موسیٰ کے ذہن پر مس ہارون کی دلکش آواز اثر انداز ہونے لگی۔ گو مس ہارون اس سے مخاطب نہیں تھی، لیکن

اس کی آواز کا لوچ ضرور اس سے مخاطب تھا۔

"تقریباً تین سو روپے لاگت آئیگی ان پہ اور پھر یہ بھی تو سوچئے ناظم صاحب! کہ اس سے ہمارے شعبے کو کتنا فائدہ پہنچے گا۔"

تب موسٰی کو یوں لگا جیسے وہ مکھی ہو اور مس ہارون کے جال میں پھنس کر رہ گیا ہو۔ اس نے چاہا آنکھیں بند کرلے اور اپنے تئیں اس عذاب سے چھٹکارا حاصل کرلے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ناظم کے سامنے بیٹھا تھا اور دفتر میں اونگھنا جرم نہیں تو معیوب ضرور سمجھا جاتا ہے۔

"ٹھیک ہے۔ بھئی ٹھیک ہے۔ میں کب کہتا ہوں کہ یہ کتابیں مفید نہیں بے حد مفید ہیں۔ بس صرف اتنا خیال رکھو کہ سالِ رواں کے بجٹ سے تجاوز نہ ہونے پائے۔ ورنہ۔ (ہاہاہا) ہمارا ادارہ یوں تو بے دریغ خرچ کرتا ہے۔ جہاں ایک روپے سے کام چل سکے۔ دس روپے خرچ کر دیتے ہیں لیکن میرے معاملوں میں وہ بڑی جانچ پڑتال کرتے ہیں، یہ خازن وغیرہ سب مجھے اپنا جانی دشمن سمجھتے ہیں۔ سمجھتے ہیں تو سمجھنے دیں۔ میں ان کی کب پرواہ کرتا ہوں۔ لیکن دقت یہ ہے۔۔ ملازمت آپ کو بھی کرنی ہے اور مجھکو بھی۔ بس محترمہ! آپ ذرا محتاط رہیں۔ پہلے یہ دیکھیں کہ درسی اور فضولیات قسم کے لٹریچر کے لئے ہمارا بجٹ اجازت بھی دیتا ہے۔ یا نہیں۔ ہاں تو موسٰی صاحب!۔ میں نے آپ کو اسی لئے تکلیف دی ہے کہ آپ ہمیں بتائیں۔ کتابیں خریدنے کے لئے ہمارے پاس کتنا روپیہ بچتا ہے۔ یہ خیال رہے جن بلوں کی ادائیگی باقی ہے۔ وہ رقم ابھی سے منہا کرلیں۔ ویسے مس ہارون کی

سے متفق ہوں کہ یہ کتابیں خرید کر طالب علموں کو رعایتاً دے دی جائیں اور سال کے آخر میں یا تو وہ کتابیں واپس کریں۔ نہیں تو قیمت ادا کر دیں۔ دیکھئے نا!۔ میرے خیال میں یہ جائز تو نہیں مگر کیا کیا جائے!۔ اکثر طلبا نادار ہیں اور وہ کتابیں خریدنے کی استطاعت ہی نہیں رکھتے! ہاں تو موسٰی صاحب! کیا خیال ہے آپ کا، بجٹ میں تین سو روپوں کی گنجائش نکل آئیگی یا نہیں؟" ناظم صاحب کی طویل گفتگو سے اکتا کر موسٰی جھٹ سے بولا۔ "ایک ہزار سے زائد رقم خرچ کرنے کی گنجائش ہے ڈاکٹر!" اس نے کنکھیوں سے مس ہارون کی طرف دیکھتے ناظم کو بتایا۔

"پھر کیا پریشانی ہے مس ہارون! کہو تو لکھ کر دے دوں۔ ورنہ آپ خریدیں یہ میری طرف سے کھلی اجازت ہے۔ ہا ہی ہی ہی۔" ناظم صاحب بتیسی نکال کر ہنسنے لگا جیسے بڑا تیر مار لیا ہو۔ حالانکہ موسٰی جانتا تھا۔ یہ سب دکھاوے کی باتیں تھیں۔ ناظم صاحب، مس ہارون کے سامنے چوں تک نہیں کر سکتے تھے۔

"مسٹر موسٰی!۔ آپ میرے ساتھ آئیں" مس ہارون نے کرسی سے اٹھ کر موسٰی کو حکم دیا۔ اور موسٰی جز بز ہو کر رہ گیا۔

"ہاں ہاں موسٰی صاحب! آپ مس ہارون کے ساتھ جائیں اور کتابیں خریدنے میں ان کی مدد کریں۔ تین چار سو روپے لیتے جائیں۔ ہو سکتا ہے جن دکانداروں سے ہمارا لین دین ہے ان کے ہاں یہ کتابیں دستیاب نہ ہو سکیں اور دوسرے دکاندار نقد قیمت کا مطالبہ کریں۔ گاڑی میں پٹرول بھی ختم ہو رہا ہے۔ راستے میں آٹھ گیلن پٹرول، گاڑی میں ڈلوا لیں۔ پٹرول ڈلواتے وقت اس

بات کا خاص خیال رکھیں کہ پٹرول پمپ کی سوئی ٹھیک ٹھیک مقدار بتائے۔ دقت یہ ہے کہ آج کل کوئی بھی تو ایماندار نہیں رہا۔ سب ٹھگ اکٹھا ہو گئے ہیں اور ہمیں دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔ آج میں نے چار پیکٹ سگریٹ خریدے اور سگریٹ فروش نے دو پیسے کم لوٹائے۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو چپکا ہو کر کھسک جاتا۔ لیکن میں نے اسے یوں آڑے ہاتھوں لیا کہ وہ بھی کیا یاد کرے گا۔ (ہا ہا ہا) ٹھیک ہے کہ نئے پیسوں کے اب تک ہم عادی نہیں ہوئے لیکن ہیر پھیر کی اجازت میں کسی کو بھی نہیں دوں گا۔ مجھ سے تو انیس ۱۹ پیسے لیں لوٹاتے وقت ریزگاری میں تین آنے کے بدلے اٹھارہ پیسے تھما دیں۔ جب تک پولیس کا ڈنڈا سر پہ نہ پڑے ان لوگوں کا دماغ درست نہ ہوگا۔"

موسیٰ نے محسوس کیا کہ مس ہارون باہر جانے کے لئے کسمسا رہی ہے اس کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی ناظم صاحب کی فضول اور بے کار باتوں سے عاجز آ چکا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ مس ہارون مسکرا دی لیکن جواب میں موسیٰ نے نگاہ پھیر لی۔ جو بُعد اور فاصلہ دونوں کے درمیان قائم ہو چکا تھا۔ موسیٰ چاہتا تھا وہ جوں کا توں قائم رہے۔ بعض اوقات آنکھ کا ہلکا اشارہ ہونٹوں کی خفیف مسکراہٹ برسوں کا فاصلہ منٹوں میں طے کر لیتی ہے اس لئے موسیٰ حتی الوسع گریز کرتا رہا اسی میں وہ اپنی عافیت سمجھتا تھا۔ کم از کم اور کچھ نہیں تو آج وہ قدرے ہلکا پھلکا اور مطمئن سا اپنے وجود کو محسوس کر رہا تھا۔

ناظم صاحب کھڑے ہو کر اپنی باہر نکلی توند پر ہاتھ پھیرتے رہے اور مس ہارون کی طرف للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ موقع پا کر مس ہارون نے دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی۔ باہر نکلتے نکلتے موسیٰ رُک گیا اور گردن موڑ کر ناظم صاحب سے کہنے لگا۔

"ڈاکٹر صاحب! ساڑھے تین بج چکے ہیں۔ اب اگر ہم بازار جائیں گے تو شام وہیں پر ہو جائے گی۔ کیا یوں نہیں ہو سکتا کہ ہم کل صبح چلے جائیں؟"

"مجھے تو کوئی اعتراض نہیں موسیٰ صاحب!۔ آپ دونوں آپس میں طے کر لیں۔ یہ پورٹ فولیو تو مس ہارون کا ہے۔ بہتر ہے آپ اُسی سے بات کر لیں۔" ناظم صاحب نے چرمی تھیلا کھولتے کہا اور موسیٰ اپنا سامنہ لیکر باہر آگیا۔ پھر اسے یوں لگا جیسے اس کے انگ انگ میں میٹھی میٹھی گدگدی ہونے لگی ہو۔ آج وہ اکیلا ہی مس ہارون کا ہم سفر ہوگا۔ اس کے لمبے بالوں سے اٹھتی ہوئی خوشبو کی مہک، وہ تن تنہا لوٹیگا۔ آج ناظم اس کا شریک نہ ہوگا۔ کتنی عجیب بات تھی وہ سوچنے لگا۔ پھر اس نے چاہا اپنے آپ پر تھوک دے۔

"لعنت ہو اس دل پر۔ یہ اسے رسوا کر کے ہی رہے گا۔"

"تو آپ تیار ہیں؟" مس ہارون اس کے کمرے میں داخل ہوئی اور بڑے نستعلیق لہجے ہیں گویا ہوئی۔

"اس نے مجھے سمجھا کیا ہے؟ مٹی کا مادھو؟؟" موسیٰ دل ہی دل میں کڑھنے لگا۔

"چھٹی کا وقت ہو چکا ہے مس ہارون!۔ چار بجنے کو ہیں کل چلیں گے۔"

موسیٰ نے رُکھائی سے کہا اور مس ہارون اس کی طرف خشمگیں نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

"یہ میری مرضی پر منحصر ہے مسٹر!۔ اپنی اوقات نہ بھولیں" مس ہارون تیوری چڑھا کر بولی اور موسیٰ تلملا کر رہ گیا۔ ایک لمحہ کے لئے اس نے گھور کر مس ہارون کی طرف دیکھا اور پھر اس کی سنجیدگی سے متاثر ہو کر بغلیں جھانکنے لگا۔ آخر کو وہ اس شعبے کا ایک ادنیٰ ملازم تھا اور ان سب نام نہاد ڈگری یافتہ افسروں کے ماتحت کام کر رہا تھا۔ اور پھر فوجی ملازمت نے بھی تو اس کے دماغ میں حکم ماننے کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھر رکھا تھا۔ لہٰذا قہر درویش بر جانِ درویش کے مصداق اس نے دفتر کے کاغذات سمیٹے اور الماری میں الم غلم ٹھونس ٹھانس کر تالا لگا دیا۔ پھر وہ پیر پٹختا، چابیوں کا گچھا ہاتھ میں لئے، مس ہارون کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

"چلیئے محترمہ!" وہ اپنے غصے اور نفرت پر قابو پانے کی کوشش میں ہکلایا۔ پھر اُسے یوں لگا جیسے آواز اس کا ساتھ نہیں دے رہی۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ ایک لاوا اس کے دل و دماغ میں کھول اٹھا تھا لیکن اس نے اپنے حلق کو یوں دبایا جیسے اس تنگ سی موری، اس چھوٹے سے سوراخ پر اس نے لوہے کا مضبوط ڈھکنا رکھ دیا ہو۔

"محترمہ! محترمہ!!" وہ اپنے آپ پر برسنے لگا۔ "کون محترمہ؟ کہاں کی محترمہ؟؟"

ہونہہ۔ کاش!۔ وہ ملازم نہ ہوتا!۔ کاش! وہ ملازم نہ ہوتا!!"

اس نے محسوس کیا کہ اس کا خون کھول اٹھا ہے۔ اور دماغ میں سیٹیاں سی بجنے لگی ہیں۔ کتنے دکھ کی بات ہے کہ اعلیٰ ملازمت کا انحصار اعلیٰ ڈگریوں پہ ہے چاہے ڈگریوں کے بوجھ تلے دبی ہوئی اس چوہیا کے دماغ میں بھُس ہی کیوں نہ بھرا ہو اُمگر وہ پھر بھی ارفع اور اعلیٰ اور معزز ہے۔ اور۔ اور۔ محترمہ ہے۔ یعنی قابل احترام!۔ واہ کیا بات ہے!۔ ہر ملازمت۔ دوسرے کو محکوم بنانے کا ذریعہ ہے۔ رزق اگر خدا کے ہاتھ میں ہے تو پھر یہ محکومی کا کیا چکر ہے!۔ ایک کو دوسرے پر برتری کیوں حاصل ہے؟"

موسیٰ تیز تیز پلکیں جھپکاتا ننگے شیشوں سے باہر دیکھتا سوچ رہا تھا باہر جہاں ننگی دھوپ کے ننگے سائے پھیلتے جا رہے تھے۔ اور برآمدے کے ستون پر چڑھی ہوئی موتیا کی بیل پہ ایک چڑیا پھدک رہی تھی۔ کاش! وہ چڑیا اس کے ہاتھ آجاتی تو وہ اسے مٹھی میں لے کر اتنا زور سے دباتا کہ اس کا سینہ چٹخ چٹخ جاتا۔ ایک۔ اتنی حقیر چڑیا اور اس کے یہ حوصلے! اس نے نفرت سے مس ہارون کی طرف دیکھا۔ جو اس کے خیالات سے، بے خبر کتابوں کی فہرست پڑھنے میں منہمک تھی۔

"لائبریری کھول لیئے مس ہارون! خزانے سے رقم لینی ہے۔" موسیٰ نے خشک لہجے میں کہا اور پھر ہونٹ کاٹنے لگا۔

مس ہارون نے پرس کھولا، چابیاں نکالیں اور اس کی جانب بڑھا کر دوبارہ فہرست دیکھنے میں مصروف ہو گئی۔ شاید وہ تجاہل عارفانہ سے کام لے رہی تھی شاید وہ اس کی تیز و تند نگاہوں کی تاب نہیں لا سکتی تھی۔ اسی لئے نظریں جھکائے

بہانہ سازی سے کام لے رہی تھی۔ "چلو اتنا تو ہے"، موسیٰ سوچنے لگا "آخر کو وہ عورت ہی ہے۔ کمزور اور۔ اور۔ حقیر عورت" وہ اپنے دل کی بھڑاس یوں نکالنے لگا۔ "کیا ہوا جو وہ حاکم ہے، کم از کم اتنا تو ہے کہ وہ عورت ہے مرد کا کھلونا۔" اس نے چاہا زور زور سے قہقہے لگائے۔ اور اسے جتائے کہ میں تم پر پھر بھی حاوی ہوں۔ میں چاقو ہوں اور تم خربوزہ۔ خربوزہ، خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے لیکن چاقو کی نسل بالکل جدا ہے، چاقو کو زنگ تو لگ سکتا ہے لیکن وہ کسی قیمت پر بھی خربوزے کا رنگ پکڑنا گوارا نہیں کر سکتا۔ چاقو کا پھل تو یوں خربوزے کے پیٹ میں اتر جاتا ہے۔ جیسے۔ جیسے۔ اس نے اپنے حافظے پر لعنت بھیجی۔ ایک اتنی معمولی سی مثال بھی اس کے ذہن میں نہیں آرہی تھی۔ کند ذہن کہیں کے! اس نے اپنا منہ آپ چڑایا۔ اپنی علمیت پر اتنے نازاں، کہ کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتے اور حال یہ کہ اتنی معمولی سی مثال بھی پیش نہیں کر سکتے۔ جیسے پتھر کی کنی۔ جو شیشے کو ناک کی سیدھ میں کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ نہیں شاید یہ برمحل مثال نہیں۔ ہوگی۔ کچھ تو ہوگی۔ اس کا ذہن بھٹکنے لگا۔ اور وہ اپنے آپ پر لعنت بھیجتا لائبریری کی سمت چل پڑا۔ مس ہارڈن اس کے ذہن سے یوں اتر گئی جیسے اس کا کہیں وجود ہی نہ ہو۔

"چار سو روپے ہیں مس ہارڈن، گن لیں"

مس ہارڈن برآمدے میں ٹہل رہی تھی۔ موسیٰ نے چابیاں اور روپے اس کی طرف بڑھائے۔ مس ہارڈن نے چابیاں لے کر رکھ لیں لیکن روپوں کو چھوا تک نہ۔

"انہیں اپنے پاس رکھو" وہ لاتعلقی سے بولی۔ "ضرورت پڑی تو مانگ لوں گی"، پھر وہ پرس جھلاتی آگے بڑھ گئی۔ نیچے ڈرائیور ان کا انتظار کر رہا تھا۔ موسیٰ بھی اس کے پیچھے پیچھے، چند قدموں کے فاصلے پہ چلنے لگا۔ اس نے سامنے نگاہ دوڑائی، اندھیری رات کی طرح سیاہ بالوں کا جوڑا۔ مس ہارون کی پشت پہ کمر سے نیچے یوں جھول رہا تھا جیسے گھڑیال کا پنڈولم ہو۔

گاڑی میں حسبِ معمول وہ سب سے آخر والی نشست پر بیٹھ گیا جبکہ مس ہارون درمیانی نشست پر بیٹھ کر بالوں کو خواہ مخواہ سنوارنے لگی حالانکہ اس کے بال سلیقے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ البتہ بالوں کا جُوڑا، سیٹ کی پشت کے پیچھے لٹک رہا تھا۔ موسیٰ چاہتا تو ہاتھ بڑھا کر اسے چُھو سکتا تھا۔ اور مس ہارون کو احساس تک نہ ہوتا۔ اچھا ہے کہ عورت کے جسم کی طرح، اس کے بالوں میں وہ حرارت، وہ بجلی سرایت نہیں کر جاتی ورنہ وہ اتنی معمولی سی خواہش بھی پوری نہ کر سکتا۔ اس وقت جبکہ مس ہارون دائیں بائیں سڑک پر چلتے ہوئے لوگوں کو دیکھ رہی تھی اور بھیڑ بھاڑ میں کھو گئی تھی، موسیٰ نے جھجکتے، جھجکتے اور ڈرتے ہاتھ بڑھایا اور جوڑے کے نچلے سرے کو پہلے دو انگلیوں سے چھوا اور پھر آخری سرا مٹھی میں لے کر اسے دبانے لگا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اور اس خواہش نے شدت اختیار کر لی کہ وہ مس ہارون کے سارے کے سارے بالوں میں انگلیاں پھیرے۔ پھر موسیٰ اس مذموم حرکت پر آپ ہی آپ شرمندہ ہو گیا اور بالوں کا جوڑا دبانا چھوڑ دیا۔ عین اسی وقت مس ہارون کو اپنے جوڑے کی آوارگی کا احساس ہوا، اس نے گردن کے قریب سے

جوڑا پکڑا اور پھر اس لہراتے سانپ کو اپنی گود میں رکھ دیا۔ ایک لمحے کے لیے اس نے یونہی گردن موڑ کر خالی خالی نظروں سے موسیٰ کی جانب دیکھا اور دوبارہ سڑک کے ہجوم میں کھو گئی۔

بازار میں ایک دکان سے دوسری دکان میں داخل ہوتے اور ناکام باہر نکلتے موسیٰ تھک گیا اور پھر شام بھی ہو چلی تھی۔ ابھی تو آدھی سے بھی کم مطلوبہ کتابیں دستیاب ہو سکی تھیں۔ اور اس پر طرہ یہ کہ مس ہارون موسیٰ کی ہتک کرنے پر تُلی بیٹھی تھی۔ ان جبر آزما لمحوں میں موسیٰ کو ملازمت کے ساتھ ساتھ اپنے آپ سے بھی نفرت ہو گئی۔ مس ہارون ہر دکان دار پر یہ واضح کرنا چاہتی تھی کہ موسیٰ اس کا ساتھی نہیں، اس کے برابر بھی نہیں بلکہ اس کا ایک ادنیٰ ماتحت ہے۔ وہ کتابیں الٹ پلٹ کر دیکھتی اور پھر موسیٰ کو پکڑا دیتی۔ اور پھر بڑی شان سے کونٹر پر جاتی اور دکاندار سے بل بنانے کو کہتی۔ موسیٰ کتابوں کا ڈھیر بازوؤں پر رکھے کاؤنٹر تک آتا۔

"یہ کتابیں پیک کر دیں" مس ہارون دکاندار سے کہتی۔ اور پھر موسیٰ کو رقم ادا کرنے کا حکم دے کر باہر نکل جاتی۔ رقم ادا کر کے موسیٰ کتابوں کا بنڈل لیے دکان سے باہر آتا خریدی ہوئی کتابیں گاڑی میں رکھتا۔

"ایک تو یہ کم بخت ڈرائیور نے اتنی دور گاڑی کھڑی کر رکھی ہے" وہ جھنجھلا اٹھتا اور دل کا غبار بے چارے ڈرائیور پر نکالتا۔

"کیا کروں جناب! ٹریفک کا سپاہی چالان کر دے گا۔ ورنہ میں گاڑی دکان کے اندر بھی لے چلوں۔" ڈرائیور گاڑی کا دروازہ کھولتے کہتا۔

"اچھا اب زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ لو۔ یہ سب کتابیں مس ہارون کی سیٹ پر رکھ دو"۔ موسیٰ ڈرائیور پر حکم چلاتا۔ کتنی ذلیل حرکت کا مرتکب ہو رہا ہے وہ۔ موسیٰ دل ہی دل میں سوچنے لگا۔ بس اس کا بس ڈرائیور ہی پر تو چلتا ہے۔ اس لئے کہ وہ اس سے کم تنخواہ پا رہا ہے۔ آخر یہ تنخواہ ہی کیوں ایک معیار، ایک کسوٹی بن گئی ہے؟ کسی کی حیثیت اور رتبہ جانچنے کی! جو جتنی زیادہ محنت کرتا ہے، اسے اتنی ہی کم تنخواہ ملتی ہے۔ یہ سات سو روپے ماہوار کمانیوالی کام کیا کرتی ہے؟۔ سارا سارا دن تو ناظم کے دفتر میں گھسی رہتی ہے۔ پھر ذرا فرصت ملتی ہے تو لڑکوں اور لڑکیوں میں بیٹھ کر گپیں لگاتی ہے۔ اس کے بعد غسلخانے میں جا کر ہونٹوں پر سُرخی کو از سر نو تیز کر کے واپس اپنے دفتر آتی ہے اور اس چھوٹی سی مشین کی گراری گھما کر دو چار ہندسوں کی جمع تفریق کر لیتی ہے۔ ضربیں بھی تو لگاتی ہے۔ ایک کاری ضرب تو وہ ــــ میرے دل پر بھی لگا چکی ہے"۔ موسیٰ کو اپنے دل کا گھاؤ یاد آیا اور وہ دل تھام کر رہ گیا۔ اس نے دیکھا، مس ہارون ایک دوسری دکان سے دو کتابیں لئے گاڑی کی طرف آ رہی تھی۔

"یہ آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟" قریب آ کر مس ہارون چیں بجبیں ہو کر بولیں۔ "ہم یہاں سیر کے لئے تو نہیں گئے مسٹر موسیٰ! آپ کو اپنے فرض کا ذرّہ برابر بھی احساس نہیں۔ میں ناظم صاحب سے آپ کی شکایت کر دوں گی"

اب موسیٰ کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ قوتِ برداشت مفلوج ہو چکی تھی اس نے شعلہ بار نگاہوں سے مس ہارون کی طرف اور دیکھا اور جھپٹ پڑا

پھر جو زبان پر آیا بکتا چلا گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک دبیز اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ سب صورتیں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے ذہن میں موٹریں ہی موٹریں "پیں پیں" کرتی دندناتی نہایت تیز رفتار سے بھاگی جا رہی ہوں۔ یا اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہو گئی ہے۔ ایک جنون تھا۔ کہ اس کے ذہن پر سوار ہو چکا تھا۔ اور ایک سیلاب تھا جو اس کے ذہن کی تمام اچھائیاں اپنے ساتھ بہا کر لے گیا تھا۔ اب جو کچھ بھی تھا وہ ایک اچھا آدمی ہرگز نہ رہا تھا۔ اسے اتنا یاد تھا کہ اس نے ہاتھ کے ایک زوردار جھٹکے سے گاڑی کے پٹ بند کئے تھے اور اس کے بعد کیا ہوا تھا، اسے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔

شہر کے گنجان آباد چوراہے پر کھڑا وہ اب بھی بوکھلایا ہوا اور پریشان اور جنونی سا لگ رہا تھا۔ جیسے اس کے دماغ کی ساری چولیں ڈھیلی ہو گئی ہوں اور اس جنونی کیفیت میں وہ بُرے بھلے کی تمیز کھو چکا ہو۔ جیسے وہ کسی بھی جذبے سے عاری ہو چکا ہو۔ اس کے ذہن کی سیٹ پر اہنپنج پھر چکا تھا شاید وہ انسانیت کے دائرے ہی سے خارج ہو چکا تھا۔ وہ انتہائی طور پر متاسف ہو کر اپنے کردار کا محاسبہ کرنے لگا۔ "یہ کیا ہو گیا تھا؟" آہستہ آہستہ اس کا دماغ برف کی طرح پگھل رہا تھا۔ اور جنونی بخارات یکے بعد دیگرے یوں نکل رہے تھے جیسے چمنی سے دھوئیں کے بادل معمول کی سطح پر پہنچ کر اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ اور سوچنے لگا۔ اگر ایسے میں شمیم مل جائے تو کتنا اچھا ہو۔ لیکن شمیم اگر مل بھی جاتی تو اس کا ساتھ کبھی نہ دیتی۔

"اُف! میں بھی کتنا مادہ پرست ہوں۔ اور مطلبی۔ اور انتہائی ذلیل!" اس نے چاہا اپنے آپ پر تھوک دے۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور پھر تھوڑا بہت لعاب زبان پر اکٹھا کر کے اس نے تھوک ہوا میں اچھال دیا۔ جو بھر کر ہوا ہی میں تحلیل ہو گیا۔ اس لئے چہرے پر ایک قطرہ تک نہ گرا۔ "کیا وہ دوبارہ کوشش کرے!" وہ سوچنے لگا۔ پھر اس نے اس حرکت کو بھی انتہائی ذلیل اور گری ہوئی سمجھ کر اپنے آپ سے سمجھوتہ کر لیا کہ جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب پچھتانے سے کیا فائدہ؟"

چاروں اندھیرا چھا گیا تھا۔ چوراہے اور سڑکیں روشنی سے جگمگا اٹھی تھیں لیکن وہ تھا کہ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا یہاں تک کہ ہسپتال پہنچ گیا۔ وہ کن راستوں سے گذرا اور کتنا فاصلہ پیدل چل کر طے کیا۔ اسے کچھ احساس ہی نہ ہو سکا۔ بس وہ ہنپایا ہوا قدم بڑھاتا رہا یہاں تک کہ ہسپتال کے پھاٹک پر پہنچ کر اس نے دم لیا۔ وہ جانتا تھا کہ ملاقات کا وقت بہت دیر ہوئی ختم ہو چکا تھا لیکن پھر بھی وہ لوہے کی سلاخیں تھامے پھاٹک پر ڈٹا رہا۔

چوکیدار پھاٹک بند کئے اپنی کوٹھری میں گھسا شائد کچھ پکا رہا تھا۔ سبزی بھوننے کی بھینی بھینی مہک سونگھ کر موتی کو یاد آیا کہ وہ دوپہر سے بھوکا ہے کھانا کھانے کو وقت ہی نہ مل سکا تھا۔ یکبارگی اسے شدید بھوک ستانے لگی اس کا پیٹ کمر سے چپک کر بلبلانے لگا۔ لیکن اس نے اپنے آپ کو تسلی دی کہ پہلے وہ بیمار دوست کے پاس بیٹھ کر دل کی بھڑاس نکالے گا۔ اسے من وعن سب کچھ بتا دے گا۔ وہ تسلیم کر لے گا۔ ہاں وہ سب کچھ تسلیم کر لیگا۔

اس کے بعد وہ کھانا کھانے کے لئے بالکل فارغ ہو گا پھر اس نے چوکیدار کو آوازیں دینی شروع کیں۔

"کیا بات ہے۔ بھئی یہ کون چلا رہا ہے" چمچہ ہاتھ میں لئے چوکیدار اپنی کوٹھری سے جھانکا۔ "ملاقات کا وقت ختم ہو چکا ہے کل آنا۔ کل"

"وہ تو میں بھی جانتا ہوں بابا!۔ لیکن میں بڑی دور سے آیا ہوں۔ میرے دوست کی حالت نازک ہے۔ وہ ٹی بی وارڈ میں ۲ نمبر بستر پر لیٹا ہوا ہوگا۔ بس مجھے ایک نظر دیکھنے کی اجازت دو۔ پھر میں چلا جاؤں گا"

ہومی نے چوکیدار کی خوشامدیں شروع کیں۔ لیکن چوکیدار ٹس سے مس نہ ہوا۔ نہ جانے کیا کچھ بڑبڑاتا چوکیدار دوبارہ اپنی کوٹھری میں روپوش ہو گیا۔

ہومی بے نیل مرام لوٹ آیا۔ نہ جانے اس کے دل میں یہ خیال کیوں بار بار سر اٹھا رہا تھا کہ اس کا دوست یا تو مر چکا ہے یا آج ہی رات مر جائیگا۔ پھر اس کے دل میں ایک عجیب سی خواہش ابھرنے لگی وہ اپنے دوست کو اس ہسپتال میں کفن میں لپٹا ہوا مردہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ ایک وحشیانہ خیال تھا لیکن پھر بھی وہ دل سے چاہتا تھا کہ ایسا ہو جائے۔ ویسے ہی جیسے لڑکپن میں اس نے اپنے بیمار باپ کی موت کی تمنا کی تھی۔ لیکن تب تو اس نے کسی کو کبھی مرتے نہیں دیکھا تھا۔ اب چھتیس برس کی عمر میں تو وہ ہزاروں لوگوں کو مرتے دیکھ چکا تھا۔ چار معصوم بچوں، ان کی ماں اور باپ کی ڈراؤنی مردہ لاشیں، خون کے چھینٹے، بھیجے کا گودا اور خون میں لت پت کلہاڑے اور چھریاں تو وہ ساری زندگی نہیں بھول سکتا۔ یہ جنگ کی واردات نہیں تھی، امن کا دور تھا اور یہ سب کچھ اس نے اپنی آنکھوں

سے دیکھا تھا۔ انسان اتنا درندہ صفت بھی ہو سکتا ہے، ایسا وحشیانہ اور بہیمانہ سلوک اپنے ہی جیسے انسانوں سے روا رکھ سکتا ہے یہ اس نے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ لیکن ایسا ہوا تھا۔ محض سونے کے چند زیورات چھیننے کے لئے!۔ محض چند سو روپوں پر قبضہ کرنے کے لئے!! پھر وہ سوچنے لگا کہ دوسروں کی موت پر ماتم کرنا کچھ ایسا مشکل کام نہیں۔ دوسروں کے لئے چند گھنٹوں اور چند دنوں کے لئے سوگوار ہو جانا بھی ایسا مشکل نہیں۔ مردے کو کندھا دینا بھی بڑا سہل اور آسان ہے۔ مشکل تو یہ ہے کہ انسان اپنے وجود کی فنا برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ زندہ رہنا چاہتا ہے۔ ہر قیمت پر جیئے جانے کا متمنی ہے۔ چاہے اس کے ارد گرد مردوں کے انبار لگ جائیں۔ بس ایک وہی زندہ رہے اور آخری سانسوں تک زندگی کی رمق محسوس کرتا رہے۔ اسی کوشش میں وہ دنیا کے دوسرے انسانوں سے ذہنی طور پر کٹ جاتا ہے۔ اور یہی انسان کا سب سے بڑا المیہ ہے۔

"مجھے تو بابر اور ہمایوں بادشاہوں کا قصہ بھی من گھڑت لگتا ہے۔" چلتے چلتے موسیٰ سوچنے

"جب بستر مرگ پر پڑے ہوئے اپنے بیمار بیٹے ہمایوں کی زندگی کے بدلے میں بابر نے اپنی موت کے لئے دعا کی تھی۔ کیا یوں ہو سکتا ہے ؟۔ شاید ایسی مثالیں خال خال ہی ہوں۔ ورنہ دنیا کی ہر نعمت سے پیاری خود انسان کی اپنی زندگی ہے"۔

سڑک کے کنارے کنارے سر نیہوڑائے قدم بڑھاتے وہ یہی

سوچا جا سکتا تھا کہ اپنی زندگی اور اپنے وجود سے پیاری بھی کوئی چیز ہو سکتی ہے!

رات کو وہ دیر تک جاگتا رہا۔ اسے مطلق نیند ہی نہ آئی۔ بیکار محض اور لایعنی قسم کی سوچ کی۔ جب تان ٹوٹی تھی تو مس ہارون کا ہیولیٰ اچانک اس کے ذہن پر سوار ہو گیا تھا۔ کبھی وہ چڑیل اور بھتنی دکھائی دیتی اور کبھی کنواری برف ایسی نرم و گداز۔ اس کا جی چاہتا بس وہ سدا یونہی تر و تازہ اور نرم نرم محسوس ہوتی رہے!۔ اسے لُو لگے اور نہ وہ کبھی گرمی کی تپش سے پگھلے!!

اگلی صبح جامعہ کی بس میں متاسف بیٹھا۔ موسیٰ سوچتا رہا کہ آج وہ مس ہارون کا سامنا کیوں کر کر سکیگا۔ اور کیا عجب وہ ناظم صاحب سے شکایت بھی کر بیٹھے۔ پھر وہ کیا جواب دے گا؟ پھر اس نے سوچا۔ وہ کسی کو شکایت کرنے کا موقع ہی نہ دے گا۔ استعفےٰ لکھ کر سیدھے ناظم صاحب کے دفتر میں جا کر میز پر رکھ دے گا۔ چلو چھٹی ہوئی۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا اور استعفےٰ کے الفاظ پر غور کرنے لگا۔ ہاں وہ اپنے استعفےٰ کی حمایت میں کہے گا کہ اس کی ساری زندگی مسافری میں کٹی ہے، اب وہ گھر جا کر باقیماندہ زندگی بچوں کی معیت میں گذارنا چاہتا ہے۔ لیکن اگر ناظم صاحب پوچھ بیٹھیں کہ وہ بال بچے یہاں بھی تو لا سکتا ہے اور وہ اہل و عیال کے ساتھ یہاں بڑے آرام اور سکون سے رہ سکتا ہے تو وہ کیا جواب دے گا؟

رد نہیں میرا خیال ہے ناظم صاحب کو پہلے ہی مس ہارون نے بھڑکا دیا ہو گا۔ جوں ہی میرا استعفےٰ پڑھے گا۔ فوری طور پر بغیر کسی پوچھ گچھ کے منظوری کے لیئے صدر دفتر روانہ کر دے گا۔ اور پھر چند ہی دنوں میں یہ کہانی ہمیشہ

ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیگی؟"

موسیٰ کف افسوس ملنے لگا۔ خواہ مخواہ معمولی سی بات پر وہ مس ہارون کی توہین کر بیٹھا تھا۔ کچھ بھی تھا وقت کتنا اچھا کٹ رہا تھا۔ اور پھر یہاں کے لوگ کتنے پیارے اور کتنے میٹھے تھے!۔ اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور تازہ تازہ صاف کیئے ہوئے بس کے شیشوں سے باہر جھانکنے لگا۔

ہسپتال کے سٹاپ پر کچھ سواریاں اور چڑھ آئیں۔ جن میں اکثریت لڑکیوں کی تھی۔ اور موسیٰ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ان سواریوں میں مس ہارون بھی شامل تھی۔ شاید وہ آج ناظم صاحب کی گاڑی سے رہ گئی تھی۔ ورنہ وہ جامعہ کی بس میں کم ہی سفر کرتی تھی۔ مفت کی سواری چھوڑ کر کون ٹکٹ خرید کر سفر کرتا ہے۔ اور پھر جسے مفت سفر کا چسکا پڑ جائے، وہ مشکل ہی سے کرایہ ادا کرتا ہے۔

مس ہارون کے پاس نہ ٹکٹ تھا اور نہ پاس لہٰذا بس کا کنڈیکٹر اس سے اُلجھ رہا تھا۔ ادھر وہ ہاتھ میں ایک روپے کا نوٹ لئے کنڈیکٹر سے تقاضا کر رہی تھی کہ وہ اسے ٹکٹ دے دے۔ ادھر کنڈیکٹر ضابطے اور قانون کا حوالہ دے رہا تھا۔ کنڈیکٹر کے پاس نہ ٹکٹ تھے اور نہ وہ ٹکٹ فروخت کرنے کا مجاز تھا۔ ٹکٹ صرف ھمدرد دفتر ہی سے دستیاب ہو سکتے تھے۔ بات الجھ رہی تھی اور اپنی سیٹ پر بیٹھا موسیٰ کسمسا رہا تھا۔ اس کے پاس فالتو ٹکٹ تو تھے لیکن وہ کیسے ہمت کرتا۔ پست ہمتی ہی تو اس کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ نہ چ ہو کر مس ہارون

کنڈیکٹر کو بے طرح گھورنے لگی۔ پھر اس نے ادھر ادھر مدد کے لئے نگاہ دوڑائی موسیٰ کچھ نمایاں ہو کر مس ہارون کی طرف دیکھنے لگا۔ لیکن مس ہارون کو تو جیسے وہ دکھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ یا شاید وہ اپنی کوئی جان پہچان کی لڑکی ڈھونڈ رہی تھی اس لئے مردوں پر اس کی نگاہ ہی نہیں پڑ رہی تھی۔

مایوس ہو کر موسیٰ چپکا بیٹھ گیا۔ ناگاہ مس ہارون کی نظریں اپنی سہیلی مسز ارشاد پر پڑیں جو سب سے آخری نشست پر دوسری لڑکیوں کے ساتھ براجمان تھی اور وہ سیٹوں کے درمیانی تنگ راستے پر ڈولتی ڈگمگاتی مردوں سے بچتی بچاتی ناک کی سیدھ میں بڑھ گئیں اور پھر وہیں سے کنڈیکٹر کو ٹکٹ دکھا کر یوں اترانے لگیں جیسے بڑا معرکہ سر کیا ہو۔ لڑکیوں نے سکڑ سمٹ کر اس کے لئے جگہ بنا دی اور وہ ٹھنسی ہوئی بیٹھ کر بہکنے لگیں۔ موسیٰ کو اپنی بزدلی اور کم ہمتی پر بہت تاؤ آیا۔ اور دل ہی دل میں پیچ و تاب کھانے لگا۔

جامعہ پہنچ کر وہ بس سے اترا اور بجری بچھی ہوئی سڑک کے کنارے سیمنٹ کی ہوئی تہہ والے فٹ پاتھ پر اکیلا بڑھنے لگا۔ یہ سڑک اور فٹ پاتھ کوئی ایک سو گز کے فاصلے پر جا کر ختم ہو رہے تھے۔ پھر جامعہ کی نئی تعمیر کا سلسلہ شروع ہو رہا تھا۔ ایک منزلہ، دو منزلہ عمارتوں کو محرابی سیڑھیاں آپس میں ملا رہی تھیں۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ان عمارتوں سے عجیب طمانیت اور رفعت کا احساس ہوتا تھا۔ ان کے درمیان گھومتا موسیٰ ہمیشہ یوں محسوس کرتا جیسے وہ خود بھی ایک طالب علم ہے

بے فکر، بے پروا اور بے غم طالب علم !۔ گذرا ہوا وقت کبھی لوٹ کر نہیں آتا۔ وقت بڑا بے رحم ہے۔ وقت بڑا سنگدل ہے۔ اور وقت انسان کا سب سے بڑا دشمن ہے!!

موسیٰ نے محسوس کیا کہ کوئی ٹھک ٹھک کرتا اس کے پیچھے چلا آرہا تھا۔ آواز ہی سے وہ پہچان گیا کہ کوئی لڑکی ہے اس لئے اس نے مڑ کر دیکھنا مناسب سمجھا۔ وہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس نے محرابی سیڑھیاں بھی چڑھ لیں۔ جوتوں کی ہلکی ہلکی آواز اب بھی اس کے کانوں میں پڑ رہی تھی جیسے کوئی برابر اس کا تعاقب کرتا رہا تھا۔ اس نے دروازے کی زرد رنگ کی پیتل کی مٹھی دبائی اور اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ اور پھر کرسی پر بیٹھ کر سنجیدگی سے استعفٰے کے بارے میں سوچنے لگا۔ کیا وہ استعفٰے داخل دفتر کر دے ؟ مگر کیوں ؟۔ کیوں ؟۔ محض اس لیے کہ کل اس نے مس ہارڈن کی معمولی سی توہین کی تھی۔ اور وہ جو اس کے ذہن پر سوار کو دہی ہے، جو اس کے اعصاب پر چھائی ہوئی ہے۔ اور جس نے اس کی مشکلات میں بے پناہ اضافہ کر دیا ہے۔ اسے یہ حق کس نے دیا! میں نے ؟۔ نہیں بھئی نہیں۔ میں ایسا ہرگز نہیں کر سکتا مجھے اپنی ذمہ داریوں کا بھرپور احساس ہے۔ میں ایسا کر ہی نہیں سکتا۔ تو پھر یہ کیسے ہو گیا ؟۔ اس کا محرک کیا تھا آخر ؟۔ اس کے ذہن میں گتھیاں الجھتی چلی گئیں اور بے بس ہو کر۔ اس نے اپنے آپ کو حالات کے سپرد کر دیا۔ جب تک حالات ساز گار ہیں وہ استعفٰے داخل نہیں کرے گا! حالات بگڑ گئے تو دیکھا جائے گا۔ آج کا دن بڑا اہم ہے۔ نہایت اہم۔ اور اس

نے اپنے آپ کو سمجھا بجھا کر آخر اس بات پر راضی کر ہی لیا کہ جب تک تقاضا نہ ہو گا، وہ اپنی جانب سے استعفٰے نہیں دے گا۔

خلاف توقع سب سے پہلے جو لڑکی اس کے دفتر میں داخل ہوئی، وہ شعبے کی ملازمہ نہیں تھی۔ وہ مسز ارشاد تھی۔ جو آدھ کھلے دروازے میں کھڑی باہر کی طرف دیکھتی کسی سے باتیں کر رہی تھی اور ہنس بھی رہی تھی۔ باہر اور کون ہو سکتا ہے، مس ہارون ہی تو ہو گی۔ موسیٰ بے چین ہو کر کرسی پر پہلو بدلتا سوچنے لگا۔

سلام وعلیکم موسیٰ صاحب!" مسز ارشاد آخر آگے بڑھ آئیں اور دروازہ کھُلا رہنے دیا۔

"آئیے مسز ارشاد! فرمائیے۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

مسز ارشاد نے آج بڑی شوخ رنگ کی ساڑھی باندھ رکھی تھی جس میں اس کے جسم کے نمایاں خطوط، کچھ ضرورت سے زیادہ ہی چھلک رہے تھے۔ موسیٰ نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا، پھر نگاہیں جھکا لیں اس نے اسی لمحے دل میں ٹھان لیا تھا کہ آج وہ لڑکیوں سے باتیں کرنے سے گریز کرے گا اور نہ ہی لڑکیوں کی محفل میں بیٹھے گا۔ بس مسز ارشاد چلی جائے تو وہ اندر سے اپنے کمرے کی چٹخنی چڑھا دے گا لیکن وہ جانتا تھا کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ اول تو کچھ لڑکیوں کو حاضری رجسٹر پر دستخط کرنے آنا تھا اور پھر خزانچی اور محاسب جیسے منصب داروں کے لئے گوشہ نشینی اور الگ تھلگ رہنا قابل عمل بھی نہیں تھا۔

اس لئے اس نے اپنے ارادے میں اتنی رعایت اور رکھی۔ کم از کم وہ کسی کے ہاں نہیں جائے گا۔ لڑکیاں اس کے دفتر میں آتی ہیں تو اس کی بلا سے۔ وہ ان کی پرواہی نہیں کرے گا۔

"اچھا۔ میں پھر آجاؤں گی۔ آپ کچھ زیادہ مصروف ہیں شاید" مسز ارشاد نے اس کی بناوٹی اور خودساختہ مصروفیت کو مدنظر رکھ کر تجویز پیش کی

"نہیں نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں مسز ارشاد!" موسٰی اپنے ڈانوا ڈول رویئے پر خود بھی حیران رہ گیا۔

"میری ایک سہیلی لندن میں مقیم ہیں۔ وہ اپنے لئے ایک ہیرا خریدنا چاہتی ہیں۔ کون سے رنگ کا ہیرا ان کے لئے مناسب رہے گا۔ ان کے نام میں حروف ابجد کل سات ہیں اور پہلا حرف نون ہے" مسز ارشاد بولیں۔ موسٰی کے علم میں یہ ایک نیا اضافہ تھا۔ تو کیا علم نجوم اتنا ترقی کر چکا ہے؟ وہ سوچنے لگا اور پھر ان پڑھی لکھی لڑکیوں کے ضعف اعتقاد پر وہ دل ہی دل میں ہنسا۔ اب ایسی نادان لڑکیوں کو بے وقوف بنانا، کون سا مشکل کام تھا۔ موسٰی نے چاہا کوئی سا رنگ بنا دے، کیا فرق پڑے گا۔ پھر اس نے سوچا تھوڑا بہت رعب گانٹھنا چاہیئے، ورنہ بات بگڑ جائیگی۔ موسٰی کچھ دیر خاموش رہا اور خلا میں گھورتا رہا، پھر اس نے مسز ارشاد کے چہرے پر نگاہیں گاڑ دیں اور بڑا سا منہ بنا کر کہا۔

"اپنی سہیلی کو لکھ دیں، وہ ہیرا خریدنے کا خیال ہی چھوڑ دے

ورنہ ایک جانکاہ صدمہ اٹھانا پڑے گا۔ ہو سکتا ہے، وہ ہیرا اس کے لئے موت کا باعث بنے اور پھر اگر اس نے ہیرا خریدنا ہی ہے تو کوئی ایسا ہیرا خریدے جو بے رنگ ہو۔ جیسے پانی کا

مسز ارشاد کا چہرہ زرد ہوگیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور ہونٹوں کے کنارے لرزنے لگے۔ پھر تیز تیز پلکیں جھپکاتی، وہ کرسی سے اٹھی، کتابیں سنبھالیں اور سر کے اشارے الوداع کہہ کر دروازے کے باہر نکل گئیں۔ موسٰی نے اطمینان کا سانس لیا۔ کہ اب وہ اطمینان اور تسلی سے اپنے اقدام پر غور کر سکے گا۔

یہ عورتیں خواہ مخواہ کندھوں پر ڈگریوں کا بوجھ لادنے پر تلی ہوئی ہیں۔ ورنہ داخلی طور پر وہ مردوں سے اب بھی پوری ایک صدی پیچھے ہیں۔ اس نے سنا، باہر برآمدے میں مسز ارشاد مس ہارون سے باتیں کر رہی تھی پھر تھوڑی ہی دیر بعد دونوں کے قہقہے سنائی دیئے۔ تو کیا اس کا تیر نشانے پر نہیں بیٹھا تھا؟ — وہ دل ہی دل میں کڑھنے لگا۔ دو شائد مسز ارشاد نے اس کی پیشن گوئی پر یقین نہیں کیا، یا وہ مس ہارون کے بہکاوے میں آگئی تھی۔

موسٰی اپنے کمرے سے باہر آیا اور برآمدے میں آکر کھڑا ہوگیا۔ اس سے کچھ فاصلے پر مس ہارون اور مسز ارشاد کھڑی باتیں کر رہی تھیں۔ کوئی بات کرتے کرتے مس ہارون کی نظر اچانک موسٰی پر پڑی اور پھر ٹھٹھک کر اسے کچھ دیر تک ٹکٹکی باندھ کر

خشمگین نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ ہوسٹی نے ایک اچٹتی نگاہ اس پر ڈالی اور جوتے کے تلوے سے برآمدے کا فرش رگڑنے لگا۔ اضطراب تھا کہ بڑھتا ہی جارہا تھا۔ پھر اس نے بھی تنگ کر مس ہارڈن کے چہرے پر اپنی نگاہیں گاڑدیں۔ جس کی تاب نہ لاکر مس ہارڈن ادھرادھر دیکھتی، دھیمے دھیمے لہجے میں مسز ارشاد سے کچھ باتیں کرنے لگی۔

"ملازمت کی ایسی کی تیسی" اس نے ذہن کو جھٹکا دیا اور اکڑ اکڑ کر چلتا ہوا، مس ہارڈن اور اس کی سہیلی کی قریب سے گذرا۔ مسز ارشاد نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا جبکہ مس ہارڈن نے نگاہ تک نہ اٹھائی اس نے لمبا چوڑا برآمدہ طے کیا اور دوسری جانب والی سیڑھیوں سے اتر کر اس پار جنگل کی طرف بڑھا۔ جہاں مکمل سکوت تھا۔ اور خاموشی لیکن اس گمبھیر خاموشی سے بھی وہ جلد ہی اکتا گیا۔ کچھ دیر تک نہر کے پل پر کھڑا، نہر میں بہتے ہوئے گدلے پانی اور چھوٹے چھوٹے بھنور دیکھتا رہا۔ لیکن اس کی بے چینی اور بے قراری میں ذرہ بھر فرق نہ آیا۔ ایک لمحے کے لئے اس نے چاہا نہر میں چھلانگ لگا دے۔ مگر وہ جانتا تھا نہر کا پانی اتنا گہرا نہیں، اور پھر اسے خودکشی کا جواز بھی تو نہیں مل رہا تھا۔ سوچا جائے تو اس کا کوئی تعلق ہی نہ تھا مس ہارڈن سے اور نہ ہی مس ہارڈن نے اسے کبھی اہمیت دی تھی۔ یہ مفروضے کسی لحاظ سے بھی قابل قبول نہیں تھے کہ مس ہارڈن کا مربیانہ برتاؤ اور مہربانیاں کسی اور انہونی بات کی غمازی کر رہی تھیں۔ یہ تو محض اس کا

خیال تھا۔ بس قیاس ہی قیاس تھا۔ اور کچھ نہیں۔ خواہ مخواہ وہ دل میلا کر رہا تھا۔ اُسے چاہیئے جتنا جلد ممکن ہو اس جنجال سے چھٹکارا حاصل کرے۔ یہی اس کے حق میں موزوں اقدام تھا۔

اور جب اس کی طبیعت قدرے ہلکی ہوئی تو وہ واپس آکر سیڑھیاں پھلانگتا اوپر گیا اور پھر اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور اپنے پیچھے دروازہ بھیڑ لیا۔ اس کی میز پہ سُرخ جھنڈی کے ساتھ ناظم کے ہاتھ کا لکھا ہوا پروانہ پڑا تھا۔ جس میں اسے ہدایت کی گئی تھی۔ کہ وہ ناظم سے فوراً ملے معاملہ نہایت اہم ہے۔ موسیٰ کا دل یکبارگی دھڑکا اور ہاتھ بُری طرح کانپنے لگے۔ تو مس ہارون نے آخر اس کے خلاف شکایت کر ہی دی ہے۔ خوب!۔ وہ سوچنے لگا۔ چلو اچھا ہی ہوا۔ کم از کم اضطراری کیفیت کا تو خاتمہ ہوگا۔ یہاں نہ سہی، کہیں تو ملازمت مل ہی جائیگی آخر۔ بس انسان کو ہمت نہیں ہارنی چاہیئے اور اپنے قوتِ بازو پہ بھروسہ کرنا چاہیئے۔

وہ بے جھجک اور بڑے اطمینان سے ناظم کے دفتر میں داخل ہوا۔ توقع کے عین مطابق مس ہارون ناظم کے روبرو بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ موسیٰ نے سلام کیا اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھیے موسیٰ صاحب!۔ تشریف رکھیئے!" ناظم نے کچھ لکھتے لکھتے نگاہ اوپر اٹھائی اور موسیٰ کو مخاطب کیا۔ مس ہارون کی کرسی کے قریب دوسری کرسی پڑی تھی جسے ذرا سا پرے کھسکا کر موسیٰ اطمینان سے بیٹھ گیا۔ اسے ٹیل کارنیگی کا قول یاد آیا۔ "زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا ناکہ اسے ملازمت سے جواب

مل جائے گا۔ اس نے سوچا اور ڈیل کارنیگی کا شکریہ ادا کرنے لگا۔ جس کے گر زندگی کے ۔ ۔ ۔ اہم معاملوں میں فیصلہ کرنے میں بڑے ممد و معاون ثابت ہو رہے تھے۔

"کل کی کتابوں پر کُل کتنی رقم خرچ ہوئی ہے موسیٰ صاحب!" ناظم نے لکھنے سے فارغ ہو کر موسیٰ سے پوچھا۔ موسیٰ نے مس ہارون کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا ۔جیسے کل کی توہین اسے یاد آ گئی تھی۔ موسیٰ کے دل میں ہمدردی ٹھاٹھیں مارنے لگی۔ اسے مس ہارون پر بڑا رحم آیا اور اس کے کردار کی گیرائی کو دل ہی دل میں سراہنے لگا۔ ویسے مس ہارون کے لئے یہ کوئی مشکل بات نہ تھی، وہ چاہتی تو ناظم سے موسیٰ کو کم از کم تنبیہہ تو دلا سکتی تھی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ اس نے سرے سے شکایت ہی نہیں کی تھی۔

موسیٰ نے صبح سے کام کو ہاتھ ہی نہیں لگایا تھا۔ سب کاغذات۔ جن میں کل کی خریدی ہوئی کتابوں کے بل بھی پڑے تھے، اس کی توجہ کے محتاج تھے اور جب دل و دماغ ہی پُر سکون نہ ہو تو ایسے میں کوئی کام کیا خاک کر سکتا تھا۔ اب جب ایک بڑا بوجھ اس کے ذہن سے پل کی پل میں اتر چکا تھا۔ وہ اپنے آپ کو چاق و چوبند اور فرض شناس محسوس کرنے لگا۔ اس نے ناظم صاحب سے چند منٹ کی مہلت مانگی اور بھاگا بھاگا اپنے دفتر آیا اور تمام بل اکٹھا کر کے تخمینہ لگایا۔

کل دو سو اڑتالیس روپے کی کتابیں خریدی گئی تھیں۔ وہ بھاگا بھاگا ناظم

کے دفتر میں داخل ہوا اور مس ہارون کی طرف رُخ کر کے ناظم صاحب کو رقم بتا دی۔

"ابھی تو کافی کتابیں خریدنا باقی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب! شام ہو رہی تھی اور اکثر دکانیں تو بند پڑی تھیں۔" مس ہارون نے پہلی بار زبان کھولی۔

"تو آج جمعہ ہو آؤ۔ مس ہارون! سوموار سے پہلے پہلے یہ کام ہو جانا چاہیئے ورنہ اگلا ہفتہ بھی بیکار جائے گا اور طالب علم کورس میں بہت پیچھے رہ جائیں گے" ناظم صاحب نے جواب دیا اور پھر موسیٰ کی طرف دیکھا۔

"موسیٰ صاحب! میں آپ کو صدر دفتر بھیج رہا ہوں۔ وہاں جا کر آپ یہ معلوم کریں کہ نئے عملے کی تقرری کی منظوری کس مرحلے میں ہے۔ یہ نیا پراجیکٹ شروع ہونے والا ہے اور حال یہ ہے کہ ابھی تک تقرری ہی عمل میں نہیں آئی۔ میں کیا کروں۔ کوئی منظوری دے تو کچھ کروں۔ میں نے آج دو دفعہ شیخ صاحب سے ٹیلیفون پر بات کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کسی اہم میٹنگ میں مصروف تھے۔ ارے ہاں! آپ جانتے ہیں موسیٰ صاحب! مس ہارون کو ایک ہزار روپے کا بونس مل رہا ہے ان کا پراجیکٹ مکمل ہو چکا ہے اور اس نے کفایت شعاری اور محنت سے کام لے کر جامعہ کو تیس ہزار روپے بچا لئے ہیں۔ تخمینے سے آدھے میں کام مکمل ہو گیا ہے۔ میں نے تو دو ہزار روپے بونس کی سفارش کی تھی لیکن صدر دفتر کے ایلچیوں نے صرف ایک ہزار روپے کی منظوری دی ہے۔ مس ہارون خوش نہیں ہیں۔ دقّت یہ ہے کہ اس شعبے میں

مجھ سے کوئی بھی خوش نہیں ہے۔" ناظم صاحب نے حسب معمول لمبی چوڑی تقریر جھاڑی جسے مس ہارون بڑی بے توجہی سے سنتی رہی۔

"ابھی ان کی ملازمت کو صرف تین سال ہوئے ہیں۔ میں کوشش کر رہا ہوں۔ اور میں سمجھتا ہوں۔ انہیں مزید ترقی ملنی چاہیئے لیکن اب سارے اختیارات میرے ہاتھ میں تو نہیں۔ آخر میں بھی تو کسی کے ماتحت کام کر رہا ہوں۔ مطلق العنان تو صرف خدا ہے جو آسمانوں میں رہتا ہے۔ زمین پر یا تو بادشاہ مطلق العنان ہوتا ہے اور یا ڈکٹیٹر! اور ان میں سے میں ایک بھی نہیں۔ میری مجبوریوں کا کسی کو احساس ہی نہیں۔ اس ادارے سے میں خود بھی شاکی ہوں۔ لیکن میری سنتا ہی کون ہے۔ میں وہ طوطا ہوں جس کی منقار پر ادارے والوں کا قبضہ ہے۔ ادارہ جو کچھ مجھ سے کہلواتا ہے۔ میں انہیں رٹ کر بے تکان بولے چلا جاتا ہوں۔ ہاں تو موسی صاحب! میں کہہ رہا تھا کہ آپ ابھی ابھی صدر دفتر جائیں اور ان کم عقلوں سے کہیں کہ جب عید گذر جائے تو وہ مہندی اپنے سروں پر تھوپ دیں اگر وہ نئے پراجیکٹ کو سرخرو اور پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے ہیں تو نئے سٹاف کی تقرری کا فوراً اعلان کر دیں ورنہ جہنم میں جائیں۔ ایک سر دردی ہو، تو آدمی برداشت بھی کرے، یہاں تو قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی ہیں اور کسے احساس ہی نہیں، کوئی سنتا ہی نہیں۔ بڑے لوگ مفت پیسہ تو نہیں دیتے۔ اس کے عوض میں کام مانگتے ہیں۔ بچت۔ بچت۔ بچت۔ بس ہمارے ادارے کے مشیروں کو یہی لفظ یاد ہے۔ اُن

سے صاف صاف کہہ دو۔ موسیٰ صاحب!۔ اور اگر وہ سیدھے طریقے سے نہیں مانتے تو ان کے سر پر ڈنڈے برساؤ۔ میری طرف سے کھلی اجازت ہے۔"

ناظم صاحب کو اپنی باتوں پہ آپ ہنسی آئی اور پھر وہ دیر تک بتیسی نکال کر ہنستے رہے۔ پھر انہوں نے ناک پر جمی ہوئی عینک اتاری اور اس کے شیشے، پتلون کی جیب سے رومال نکال کر صاف کرنے لگے۔

"تو پھر میں جاؤں ڈاکٹر صاحب؟" موسیٰ باہر نکلنے کے لئے کسمسانے لگا۔ تھوڑی دیر پہلے وہ طبیعت پر جو بوجھ محسوس کر رہا تھا، اس کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اسے اپنا آپ بڑا ہلکا پھلکا لگا اور کہیں بیٹھ کر چہکنے کو اس کا دل مچل رہا تھا۔

"ہاں ہاں۔ موسیٰ صاحب! آپ ضرور جائیں۔ لیکن میرا خیال ہے مس ہارون بھی تو جائیں گی۔ کیوں مس ہارون! آپ باقیماندہ کتابیں خریدنے آج جائینگی یا کل؟" ناظم صاحب نے مس ہارون سے دریافت کیا۔ مس ہارون نے چبھتی نگاہ موسیٰ پر ڈالی اور پھر ہامی بھر لی "میں جاؤں گی ڈاکٹر صاحب! لیکن واپس نہیں آؤں گی۔ بعد میں مجھے اپنے لئے بھی کچھ ضروری خرید و فروخت کرنی ہے۔" مس ہارون نے بڑے دھیمے اور اداس لہجے میں جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ بھئی ٹھیک ہے" ناظم صاحب نے تائید میں کہا "کتابیں خرید کر موسیٰ صاحب کو دے دیناء۔ گاڑی لے جائیں اور کوشش

کریں کہ دو بجے تک گاڑی لوٹا دیں۔ مجھے بھی ایک ضروری کام سے بعد میں باہر جانا ہے"

موسٰی کے دل کو ایک جھٹکا لگا۔ کہ جس عذاب سے وہ سمجھ رہا تھا۔ چھٹکارا مل چکا تھا، وہ تو ازسرِ نو خونخوار جبڑے کھولے اسے تک رہا تھا وہ سوچنے لگا۔ کوئی صورت نکل آتی اور وہ اکیلے ہی صدر دفتر چلا جاتا لیکن اب ایسا کرنا جائز بھی نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مس ہارون کی ناراضگی اسے بڑی مہنگی پڑتا تھی۔ اس لئے اس نے حالات کے سامنے سپر ڈال دی کہ جو ہونا ہو گا۔ ہو کر ہی رہے گا۔ اپنے دفتر واپس آکر اس نے ضروری کاغذات سمیٹے اور الماری کو تالا لگا کر سیڑھیاں پھلانگتا نیچے آگیا اور گاڑی کے پاس کھڑے ہو کر مس ہارون کا انتظار کرنے لگا۔

وہ بڑا عجیب محسوس کر رہا تھا۔ جیسے مس ہارون کے طفیل وہ بال بال بچ گیا تھا۔ ورنہ نوکری چھوٹ جانے کا قوی امکان تھا۔ پھر وہ اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا۔ کہ اس نے ہار ہی کیوں مانی؟۔ لیکن ہار کیسی؟۔ اس کی سمجھ ہی خود نہیں آرہا تھا کہ جس شکست کا وہ اعتراف کر رہا تھا، شکست تھی بھی یا نہیں۔ بظاہر تو ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ عجیب مخمصے میں گرفتار وہ ٹہلنے لگا۔ اور ٹہلتے ٹہلتے اس نے جی کڑا کر کے سوچا کہ وہ کسی بھی صورت میں مس ہارون سے ہار نہیں مانیگا۔ وہ اس سے بات ہی نہیں کرے گا۔ اور نہ ہی کل کے توہین آمیز رویّے پر پچھتاوے کا اظہار کرے گا۔ آخر اس نے اپنے آپ کو سمجھ کیا رکھا ہے؟

"بس وہ ایک عورت ہے اور مجھے اسے اس سے زیادہ وقعت نہیں دینی چاہیئے" اس نے اپنے دل کو سمجھایا۔ لیکن دماغ نے اس کی ایک نہ مانی۔ وہ اسے زمانہ سازی کا درس دینے لگا۔ اور مقتضی ہوا کہ وہ کل کے بے جا زد دینے پر اگر معافی نہیں مانگتا تو نہ مانگے۔ لیکن اظہار افسوس ضرور کرے۔ خیر۔ دیکھا جائے گا۔ سوچتے سوچتے اس نے زینے کی طرف دیکھا جہاں سے مس ہارون کی آمد کی توقع تھی۔ پھر اس نے گاڑی کا اگلا پٹ کھولا اور ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ "وہ تو میں احتراماً پیچھے بیٹھا کرتا تھا۔ ورنہ مرد کا مقام تو یہی ہے جہاں میں اس وقت بیٹھا ہوں مجھے کوئی چھیڑ کر تو دیکھے!" اس نے متکبرانہ انداز میں سوچا اور "پیں پیں۔ پیں۔ پیں" ہارن بجانے لگا۔ ڈرائیور بھاگا بھاگا کہیں سے نمودار ہوا اور سر پر ٹھیک طرح ٹوپی جما کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اور چابی گھما کر مشین چلادی

"ذرا ٹھہرو بھئی! مس ہارون کو آنا ہے۔" موسیٰ نے ڈرائیور کو حکم دیا۔ اور ڈرائیور اس کی جانب یوں دیکھنے لگا۔ جیسے اسے یقین ہی نہ آرہا ہو۔ موسیٰ کو ہنسی آگئی۔ ویسے اس بے چارے پہ ملامت بھی نہ تھی۔ اس کے سامنے کل جو کچھ ہوا تھا۔ ڈرائیور کو توقع تھی کہ اس کا نتیجہ اچھا نہیں نکلنا تھا۔ ایک ڈرائیور نے تو کیا شعبے کے سارے ملازمین مس ہارون سے دبتے تھے۔ اور حتی الوسع اس کی حکم عدولی سے گریز کرتے تھے۔ موسیٰ وہ پہلا شخص تھا جس نے مس ہارون کی بے عزتی بھی کی اور سزا سے بھی بچ گیا۔ ورنہ ایسے معاملوں میں ناظم صاحب نے کبھی کسی کو معاف نہیں

کیا تھا۔ ڈرائیور کو شائد علم نہیں تھا کہ مس ہارون نے شکایت ہی نہیں کی تھی ورنہ وہ ناظم کا بھتیجا تھوڑا ہی لگتا تھا جو اسے معاف کر دیتا۔

گاڑی کا پچھلا پٹ کھلا اور کوئی اندر داخل ہوا۔ موسیٰ نے گردن موڑ کر مس ہارون کی جانب دیکھا اور پھر یوں نگاہیں پھیر لیں جیسے کوئی بڑی منحوس صورت نظر آگئی ہو۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ جو صورت پیچھے بیٹھ چکی ہے بڑی پیاری اور میٹھی ہے۔ اس نے محض جتانے کے لئے ایسی حرکت کی تھی وہ چاہتا تھا کہ آج مس ہارون اس پر ویسے ہی غصے ہو جیسے کل اس نے غصہ دکھایا تھا۔ وہ اس پر برسے، اسے طعنے دے اس کی خوب خوب سرزنش کرے اور وہ چپکا بیٹھا سب کچھ سنتا رہے۔" اس نے اپنے لئے یہی سزا تجویز کی لیکن مس ہارون نے غصہ دکھایا اور نہ گرجی۔ بس وہ چپ چاپ بیٹھی بالوں پہ ہاتھ پھیرتی رہی۔ کچھ دیر پہلے موسیٰ نے مس ہارون کے جوڑے میں اڑسا ہوا ایک سرخ پھول کنکھیوں سے دیکھا تھا اب وہ پچھتانے لگا۔ اگر وہ پیچھے بیٹھا ہوتا تو وہ جی بھر کر اس پھول کو دیکھ سکتا تھا۔ اور موقع ملتا تو وہ پھول اُچک بھی لیتا۔

گاڑی لمبی چوڑی سڑک پر بھاگی جا رہی تھی اور موسیٰ اپنے پیچ خیالات میں اُلجھا، اپنے آپ پہ برس رہا تھا۔ جس نے ایک نادر موقع محض اپنی نام نہاد بڑائی کے احساس میں کھو دیا تھا۔ وہ سرخ پھول اس کے ہاتھ میں ہوتا۔ یا اس کے بغلی جیب میں دل کے قریب ہوتا اگر آج وہ پیچھے بیٹھتا۔ گاڑی کو دو تین جھٹکے لگے جیسے آپ ہی آپ اس کا انجن بند ہو رہا ہو لیکن

تیز تیز غوں۔ غوں کرتی پھر چل پڑی اور رفتار پکڑ لی۔ یہاں تک کہ صدر دفتر کے بڑے دروازے میں داخل ہوئی۔

گاڑی رکی تو موسیٰ نے چٹخنی دبا دی اور بیلٹ کھول کر نیچے اتر آیا۔ مس ہارون اپنی نشست پر بیٹھی رہی۔ موسیٰ نے ڈرائیور کی طرف دیکھ کر کہا "فارغ ہو کر گاڑی یہیں لے آنا۔ میں تمہارا اسی گیٹ پر انتظار کروں گا"

"کیا مطلب؟" مس ہارون نے بیٹھے بیٹھے کھڑکی سے جھانک کر مداخلت کی۔ اس کے چہرے پر ناراضگی، ناگواری اور غصے کا ملا جلا امتزاج تھا۔ موسیٰ اپنے چہرے پر خون کا دباؤ صاف طور پر محسوس کرنے لگا۔ ہو سکتا ہے اس کا چہرہ سرخ بھی ہوا ہو۔ یا ممکن ہے اس کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی ہو۔ اس لئے اس نے مس ہارون کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ کی۔ دوسری جانب دیکھتے اس نے جواب دیا۔

"مطلب یہی کہ جب آپ اپنے کام سے فارغ ہو جائیں تو گاڑی یہیں لے آئیں۔ تب تک میں بھی ضروری معلومات حاصل کر چکا ہوں گا"

"یہ بھی خوب رہی" مس ہارون نے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔ "مسٹر آپ کو دیر ہی کتنی لگیگی۔ بھاگ کر جاؤ۔ معلومات حاصل کرو۔ اور بھاگے واپس آؤ۔ آپ کو میرے ساتھ بازار جانا ہو گا۔ کتابوں کی ذمہ داری کون اٹھائے گا؟ مجھے تو دفتر نہیں جانا۔ یہ کتابیں آپ ہی کو دفتر پہنچانی ہیں"

موسیٰ نے مڑ کر مس ہارون کو گھورا اور پھر تیز تیز قدم بڑھاتا صدر دفتر داخل ہوا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ واپس لوٹ آیا۔ متعلقہ دفتر میں نہ تو کلرک موجود تھا اور نہ ہی

اس کا افسر۔ پوچھ گچھ کا سوال ہی پیدا نہ ہوا اس نے بادل ناخواستہ اپنے آپ کو مس ہارمن کے حوالے کر دیا۔ بازار قریب ہی تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں گاڑی ایک کتابوں کی دکان کے سامنے کھڑی تھی۔ موسیٰ اپنی نشست پر بیٹھا رہا۔ مس ہارڈن گاڑی سے اتر پڑیں اور پرس جھلاتی دکان میں داخل ہو گئیں۔

سامنے چاٹ والے کی چھابڑی لگی ہوئی تھی۔ موسیٰ سوچنے لگا اگر وہ اکیلا آیا ہوتا تو چاٹ ضرور کھاتا۔ لیکن اس وقت تو وہ ایسے ڈرائیور کی طرح بندھا ہوا بیٹھا تھا جسے یہ علم نہیں ہوتا کہ اس کا مالک کب آئے اور اُسے چلنے کو کہے۔ اس لئے خواہش کے باوجود وہ چپکا بیٹھا رہا۔

دکان کا ملازم دونوں ہاتھوں میں کتابوں کے بنڈل لٹکائے، دکان سے نمودار ہوا۔ اور گاڑی کے قریب آکر ڈرائیور سے کہنے لگا کہ وہ کتابیں رکھنے کے لئے گاڑی کے پٹ کھول دے۔ ڈرائیور نے درمیانی پٹ کھولا اور ملازم نے دونوں بنڈل مس ہارڈن کی سیٹ پر پٹخ دیئے۔ پھر مس ہارڈن آئی، گاڑی میں بیٹھی اور ڈرائیور کو گاڑی آگے بڑھانے کو کہا۔

مس ہارڈن نے دو تین دکانوں سے مختلف قسم کی کتابیں خرید کر گاڑی میں جمع کیں اور پھر ڈرائیور کے ہاتھ چاٹ منگوا کر گاڑی میں بیٹھی مزے لے لے کر چاٹ کھانے لگی۔ موسیٰ تلملا کر ہی تو رہ گیا۔ ایک تو اسے چاٹ کھانے کی خواہش نے پہلے ہی سے پریشان کر رکھا تھا۔ اس پر اچانک اسے شدت کی بھوک بھی ستانے لگی۔ دل ہی دل میں کڑھتا پیچ و تاب کھانے لگا۔ موسیٰ نے سیٹ کی پشت پر ہاتھ پھیلا دیئے اور پھر ان پر سر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔ اور مسالے اور چاٹ

کی بھینی بھینی خوشبو برابر اسے پریشان کرتی رہی۔ مس ہارون کتنی بیگانگی سے پیش آئی تھی۔ موسیٰ کو ہرگز توقع نہ تھی اور نہیں تو کم از کم وہ اتنا تو کر سکتی تھی کہ آج کے دن چاٹ کھانے کا پروگرام ہی ملتوی کر سکتی تھی۔ "یہ کس مٹی کی بنی ہوئی ہے؟" موسیٰ سوچنے لگا۔ ایک طرف تو وہ بے رُخی برت رہی ہے اور دوسری طرف اسے ساتھ ساتھ لئے پھرنے پر بھی کوشاں ہے۔ شاید کل کا انتقام وہ اسی صورت ہی میں لے سکتی تھی۔

"چلو۔ ڈرائیور! اب واپس چلو" چاٹ کھا کر مس ہارون نے ڈرائیور کو حکم دیا اور موسیٰ متعجب ہو رہا تھا۔ کہ مس ہارون اسے اپنے ساتھ لائی کیوں تھی؟ اگر اس نے بزعم خود واپس بھی لوٹنا تھا۔ حالانکہ طے شدہ پروگرام کے ماتحت اس کو بازار ہی میں ٹھہر جانا تھا۔ جوں جوں موسیٰ خیالات میں الجھتا گیا نئے سرے سے نئی پیچیدگیاں ابھرنے لگیں اس لئے اس نے سوچنا ہی چھوڑ دیا۔ اور بڑی بے فکری سے چلتی گاڑی سے نظر آتے ہوئے مختلف لوگوں اور مناظر میں کھو گیا۔ گاڑی ہوا سے باتیں کرتی اڑ رہی تھی۔ گھنٹوں کا فاصلہ منٹوں میں طے کر کے شعبے کے قریب گاڑی آن رُکی۔ مس ہارون نے ایک دو بنڈل کتابوں کے خود اٹھائے اور پھر مسکرا کر موسیٰ کی اور مدد کے لئے دیکھنے لگی۔ موسیٰ نے دو بھاری بنڈل اٹھائے اور اس کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

مس ہارون نے برآمدے میں اپنے کمرے کے سامنے کتابیں رکھیں اور پھر پیتل کی ہتھی گھما کر دروازہ کھولا اور کتابوں کے بنڈل زمین پر سے اٹھا کر اندر داخل ہوئی۔ موسیٰ نے بھی کتابیں ہاتھ میں لئے اس کا تعاقب کیا اور دونوں بنڈل اُسکی

میز پر دھر کر باہر نکلنے لگا۔

"شکریہ" مس ہارون کی میٹھی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا وہ بڑی شوخ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی مسکرا رہی تھی۔ موسیٰ نے بڑی بے رخی سے نگاہ پھیری اور باہر آ گیا۔

اس وقت چار بج رہے تھے جب وہ دوبارہ صدر دفتر کے احاطے میں داخل ہوا۔ ناظم کی ہدایت کے مطابق اس نے مس امتیاز کو ایک پیغام پہنچانا تھا جو اپنے چچا کو دیکھنے یہاں آئی ہوئی تھی۔ اسے اپنے آپ پر تاؤ آ رہا تھا جو دوپہر کا کھانا اکثر بھول جاتا تھا یا بڑی تاخیر سے کھایا کرتا تھا نتیجتاً اس کی صحت گر رہی تھی۔ تب اس نے سوچا مس امتیاز کو پیغام پہنچا کر وہ سیدھے کسی اچھے سے ہوٹل میں جائے گا اور اعلیٰ قسم کا کھانا خوب ڈٹ کر کھائے گا۔

"کون؟" مس امتیاز کے چچا کے دفتر کا بند دروازہ کھٹکھٹانے پر موسیٰ کو جواب ملا۔ مس امتیاز کی آواز پہچان کر اس نے کہا۔ "میں ہوں۔ مس امتیاز! موسیٰ۔ آپ کے لئے ناظم صاحب کا پیغام لایا ہوں" "آیئے موسیٰ صاحب اندر آیئے" مس امتیاز نے دروازہ کھولا "معاف کیجئے۔ میں ذرا لیٹ گئی تھی۔ انکل کہیں باہر گئے ہوئے ہیں اور ان کا انتظار کرتے کرتے مجھے نیند آ گئی تھی۔ یہ چٹائی آپ دیکھ رہے ہیں نا۔ یہ میرا بچھونا ہے۔ گرمیوں کی دوپہریں میری یہیں گذرتی ہیں۔ انکل اتنے مصروف ہوتے ہیں۔ کہ کبھی دوپہر کو گھر نہیں جاتے۔ ان کے بغیر میرا بھی گھر میں دل نہیں لگتا۔ آپ بیٹھیے نا۔ اس کرسی پر بیٹھ جائیے۔ انکل ایک بجے سے کسی ضروری میٹنگ میں شرکت کرنے گئے ہیں اور اب تک نہیں

لوٹنے۔ آپ نے کھانا کھایا ہے؟ میں نے بھی نہیں کھایا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے یہی سوچ رہی تھی۔ کہ ناظم صاحب کے گھر چلی جاؤں۔ انہوں نے سب کو بلا رکھا ہے۔"

"میں اسی سلسلے میں آیا ہوں مس امتیاز!" موسیٰ نے مداخلت کی۔ تاکہ پیغام سنا کر جلد رفوچکر ہو جائے۔ اسے بھوک نے بدحواس سا کر رکھا تھا اور اب خالی خالی باتیں اسے بُری طرح کھٹکنے لگی تھیں۔

ناظم صاحب کہہ رہے تھے کہ آپ پانچ بجے ضرور آئیے گا۔" موسیٰ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

"ہاں ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔ اچھا یہ بتائیے مس ہارون بھی آئیگی یا نہیں؟"

مس امتیاز چوڑے شانوں پر دوپٹہ ٹھیک طرح جماتے کہنے لگی۔ موسیٰ نے ایک چھچھلتی نگاہ مس امتیاز پر ڈالی اور پھر اس کی نگاہیں آپ ہی آپ جھک گئیں۔ کہ اس کے جسم کے نوکیلے ابھار، آج کچھ ضرورت سے زیادہ ہی نمایاں لگ رہے تھے۔

"کچھ کہہ نہیں سکتا مس امتیاز! لیکن میرا خیال ہے، وہ ضرور آئیگی" موسیٰ ہکلایا۔ پھر اور کچھ تو بن نہ پڑا، کھڑے کھڑے نگاہیں جھکائے میز پر بے مقصد انگلی سے لکیریں کھینچنے لگا۔

"آپ بیٹھیے نا موسیٰ صاحب؟ جب سے آپ آئے ہیں کھڑے ہیں معلوم ہوتا ہے کسی سے لڑ کر آئے ہیں۔"

"نہیں مس امتیاز یہ بات نہیں" موسیٰ نے قدرے گھبرا کر کہا اور پھر بغلیں جھانکنے لگا۔ اچانک وہ دل میں ایک عجیب طرح کا درد محسوس کرنے لگا۔

اور اس نے چاہا کہ وہ مس امتیاز پر اپنا راز کھول دے۔ اسے بتا دے کہ وہ مس ہارون سے شدید محبت کرتا ہے۔ اور وہ جن مرحلوں سے گذر رہا ہے انتہائی اذیت ناک ہیں۔ لیکن وہ اب تک مس امتیاز کو اچھی طرح جان نہ سکا تھا اس لیئے اسے اعتماد میں لینے سے وہ گھبرا رہا تھا۔ پھر وہ آپ ہی آپ کرسی پر یوں بیٹھ گیا جیسے کسی نے اسے زبردستی بٹھا دیا ہو۔

"اس روز موسیٰ صاحب! آپ نے میری شادی کا ذکر چھیڑا تھا۔ یاد ہے نا۔ یہ دیکھیئے۔ میرے بالوں میں چاندی کے تار۔ گو خال خال ہیں مگر میری تو جان پر بنی ہوئی ہے۔ ان سفید بالوں کے ساتھ میں شادی کے متعلق سوچ بھی سکتی ہوں؟۔ میں تو بوڑھی ہو چکی ہوں۔ سو فیصد نہیں تو پچاس فیصد ضرور بوڑھی ہو گئی ہوں۔ عورت بس اس وقت ہی بوڑھی ہو جاتی ہے جب وہ بوڑھی دکھائی دے۔ آپ کہیں تو میں اپنے پورے بال کھول کر دکھا دوں۔ ایسے ہی کئی ایک سفید بال آپ کو میری کھوپڑی پر بکھرے نظر آئیں گے۔ دیکھیئے نا۔ یہ دیکھیئے" مس امتیاز جو اس کے بہت قریب جھکی ہوئی کرسی پر بیٹھ چکی تھی، مسلسل بولے چلی جا رہی تھی۔ اور موسیٰ اپنے جسم میں بجلی کے جھٹکے سے محسوس کرنے لگا۔ اس کا رواں رواں کھڑا ہو گیا تھا اور دل بری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ مس امتیاز کا سر موسیٰ کے شانے پر جھک آیا تھا۔ موسیٰ نے ہاتھ لگانے سے گریز کیا۔ بس سفید بالوں کی معمولی سی جھلک اس کے بالوں میں دیکھ کر ہکلایا۔

"آج کل۔ آج کل" وہ صاف طور پر محسوس کر رہا تھا کہ وہ اپنے برانگیختہ جذبات پر قابو پانے میں ناکام ہو چکا ہے۔ اور وہ ان غیر متوقع باتوں سے

بوکھلا بھی گیا ہے۔ ایک لمحے کے لئے تو اس کے مشتعل جذبات نے سب کچھ کر گذرنے
پر اکسایا لیکن پھر اس نے سوچا۔ کیا پتہ اس بے باک لڑکی کے دل میں کیا ہے
اس نے اسے سمجھنے میں غلطی کی ہو اس لئے وہ دل پر پتھر رکھ کر دوبارہ ہکلایا

" آج کل مس امتیاز ا۔ بالوں میں سفیدی کی جھلک کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ میں
نے تو بہت سے نوجوان دیکھے ہیں جن کے سروں کے سارے بال سفید ہو چکے ہیں
اور تو اور۔ مری میں میں نے ایک نوجوان عورت دیکھی۔ جس کے سر کے سب
بال سفید ہو چکے تھے اور وہ شانوں پر بکھرائے اکثر گھومتی نظر آتی تھی۔ سفید بالوں
کے باوجود وہ بڑی حسین لگ رہی تھی۔ شاید حسن کی ایک صورت یہ بھی ہو۔ وہ
چاہتی تو مصنوعی طریقوں سے کام لے سکتی تھی۔ میں سمجھتا ہوں حسن مصنوعی طریقوں
کا محتاج ہونا ہی نہیں چاہیئے۔ مصنوعی بناؤ سنگھار عورت کے چہرے کا قدرتی
اور ملکوتی حسن کھا جاتا ہے۔ بلکہ میرا تو خیال ہے جو عورت جتنی زیادہ سادگی
پسند ہوتی ہے اور اپنے حسن سے مطمئن ہوتی ہے اس کی جوانی دیرپا ہوتی ہے۔
بڑھاپے میں بھی اس کے چہرے سے تازگی اور نکھار ٹپکتا ہے۔"

" لیکن میں تو بدصورت بھی ہوں موسیٰ صاحب!۔ اکثر لڑکیوں نے میرے منہ
پر یہ بات کہی ہے۔"

" یہ آپ کا وہم اور ان لڑکیوں کی کم ظرفی ہے مس امتیاز جو آپ کو بدصورت
سمجھتی ہیں۔ سوچا جائے تو ہم نے حسن کا معیار ہی غلط بنیادوں پر کھڑا کر رکھا ہے
سانولی اور کالی رنگت کو ہم نے بدصورت قرار دیا ہے اور گوری رنگت
کو خوبصورتی سمجھ رکھا ہے۔ حالانکہ پرکھ کا یہ انداز ہی بالکل غلط اور بھونڈا ہے

میری نظر تو ہمیشہ تیکھے نقوش اور موزوں خدوخال پر پڑتی ہے۔ اگر ایک لڑکی بھینگی ہے۔ لمبے لمبے دانت ہونٹوں سے باہر جھانک رہے ہیں، پچکے گالوں کی ہڈیاں ابھر آئی ہیں۔ بھونڈی چال ہے اور ناک کی ہڈی مری کے پر پیچ راستے کی طرح ٹیڑھی میڑھی ہے لیکن رنگ اس کا گورا ہے۔ تو کیا میں اسے خوبصورت سمجھ لوں گا؟ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ میری نظر میں وہ بدصورت ترین لڑکی ہے۔"

مس امتیاز ہنس دیں اور پھر دیر تک ہنستی ہی رہی۔ موسیٰ نے اس کے سراپا پر ایک اور چھچلتی نگاہ ڈالی اور پھر کچھ خفیف سا ہو کر گردن جھکالی۔ پھر کچھ دیر کے لئے دونوں جانب خاموشی رہی۔ جانے مس امتیاز کیا سوچ رہی تھی لیکن موسیٰ کو اچانک مس ہارون کی یاد ستانے لگی تھی۔ جو ایک پتھر بن کر اس کی راہ میں حائل ہو گئی تھی۔ اور یہ پتھر اتنا بھاری اور وزنی تھا کہ وہ اسے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر بھی اپنے راستے سے ہٹا نہیں سکتا تھا۔ اور پھر وہ اتنے قریب ہو کر بھی کتنی دور رہتی تھی۔ اس کے مقابلے میں مس امتیاز کتنی قریب بیٹھی تھی وہ چاہتا تو ہاتھ بڑھا کر اسے چھو سکتا تھا۔ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر سکتا تھا۔ بلکہ اس کی فرمائش تو اس نے خود ہی کی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ کتنی دور تھی!

"ارے ہاں یاد آیا" مس امتیاز نے سکوت توڑا۔ "آج میں دفتر میں بالکل بیکار بیٹھی تھی۔ سوچا چلو آج شاعری کرتے ہیں۔ کاغذ قلم اٹھایا اور لکھنے بیٹھ گئی بس پھر کیا تھا، شعر پر شعر لکھتی چلی گئی۔ میرے انکل بھی بڑے منجھے ہوئے شاعر ہیں کبھی کبھی موڈ میں آکر وہ اپنا کلام مجھے سنایا کرتے ہیں۔ بس ان کے دیکھا دیکھی میں نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔ پتہ نہیں وہ کاغذ کہاں کھو گیا؟ اسی پرس میں ہی میں نے

دکھاتھا۔ میرے انکل کی بیاض میں تو ہزاروں شعر درج ہیں۔ کہیں آپ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ میں نے انکل کی بیاض سے چوری کی ہے۔ اوہو۔ پتہ نہیں کہاں چلا گیا ایک پرزہ سا تھا کاغذ کا۔ ہاں۔ یہ رہا۔ موسیٰ صاحب! بے شک داد نہ دیں۔ لیکن اگر مذاق اڑایا تو میں خفا ہو جاؤں گی۔ ابھی سے بتائے دیتی ہوں ہاں!"

مس امتیاز نے مسکرا کر تہہ در تہہ کاغذ کھولتے کہا۔ اشعار بے بحر تھے اور زیادہ تر نثر میں لکھے ہوئے تھے۔ لیکن وہ ہر مصرع یوں ادا کر رہی تھی جیسے وہ شعر ہی تو ہو۔ ایک ناکام عاشق کی روئیداد تھی جس میں اپنے محبوب کی کرداری کا رونا رویا گیا تھا۔ جب مس امتیاز اپنا کلام سنا چکیں تو موسیٰ نے ایک جھرجھری سی لی۔ اور وہ ٹکر ٹکر مس امتیاز کا چہرہ تکنے لگا۔ اس نے چاہا، اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ پر رکھ دے اور اسے سنجیدگی سے مشورہ دے کہ وہ شادی کر لے۔ شادی کے بعد جو محبت اپنے خاوند کے لئے پیدا ہوتی ہے۔ وہی حقیقی محبت ہوتی ہے۔ اس سے پہلے کی محبتیں سب وقتی، جذباتی اور ناپائیدار ہوتی ہیں جن کی تان ہمیشہ پچھتاوے پر ٹوٹتی ہے۔

"مس امتیاز! محبت وہ زہر ہے جو پاگل کتے کے دانتوں سے ٹپکتا ہے"

موسیٰ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "محبت آستین کا وہ سانپ ہے جو سب سے پہلے اپنے ہی مربی کو ڈستا ہے۔ یہ ایک ایسا لڈو ہے جو بظاہر بڑا خوشنما اور خوش رنگ دکھائی دیتا ہے۔ اس کے درد دل اور ٹیسوں میں بڑی لذت اور مٹھاس ہوتی ہے۔ محبت مارفیا کا انجکشن ہے جس سے انسان چند لمحوں کے لئے سرور حاصل کرتا ہے لیکن اس کا انجام!

ہمیشہ حسرتناک اور قابلِ مذمت ہوتا ہے۔ میرا ایک دوست تھا وہ ایک کرسچین لڑکی کے دامِ محبت میں گرفتار ہوا۔ دونوں میں عہد و پیمان ہوئے اور پھر دونوں نے چوری چھپے عدالت میں شادی کر لی۔ چونکہ فریقین نے ماں باپ کی اجازت کے بغیر ایک دوسرے کو قبول کیا تھا لہٰذا وہ سماجی بائیکاٹ کا شکار ہو گئے۔ شادی کے پہلے چند ماہ تو بڑی ہنسی خوشی گذر رہے لیکن اس کے بعد محبت کا نشہ یوں ہرن ہوا جیسے سرے سے اس کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ مرد اپنی جگہ پشیمان اور عورت اپنی جگہ پریشان۔ دراصل بعد میں ان پر یہ عقدہ کھلا کہ وہ سماج کے تعاون کے بغیر ایک پل کے لئے بھی سانس تک نہیں لے سکتے۔ پچھتاوے نے نفرت کی صورت اختیار کر لی۔ مرد اپنا غم غلط کرنے کے لئے آوارہ گردی کرنے لگا۔ اور عورت خون کے آنسو روتے روتے دِق میں مبتلا ہو گئی۔ اور انجام کار لحد میں جا سوئی۔ یہ سب کچھ کیوں ہوا اس لئے کہ محبت نے جو ایک جذباتی فعل ہے انہیں سب کچھ کر گذرنے پر اکسایا تھا،" موسیٰ آگے کیا کہنا چاہتا تھا، قطعاً بھول گیا تھا۔ اس کے ضمیر نے اچانک سر اٹھایا اور وہ بوکھلا سا گیا تھا۔ دوسروں کو نصیحت کرنا کتنا آسان ہے۔ وہ سوچنے لگا۔ مگر خود اس پر عمل کرنا کتنی مشکل بات ہے۔

"اچھا مس امتیاز!" موسیٰ نے نگاہ اٹھائی اور ٹک ٹک کرتے گھڑیال کی طرف دیکھ کر کہا۔ "پانچ بجنے کو ہیں آپ کا وقت ہو چکا۔ اور میرا بھی۔ اب اجازت دیجئے۔"

مس امتیاز نے چونک کر موسیٰ کی طرف دیکھا اور پھر ٹک ٹک کرتے گھڑیال

پر نگاہیں مرکوز کر دیں۔

"ارے یہ تو پانچ بجنے کو ہیں۔ آپ کی بڑی مہربانی۔ موسیٰ صاحب! میں نے آپ کا خاصا وقت ضائع کیا۔" مس اننیا ذہ پہ سے اٹھ کر دروازہ میں آ کر کھڑی ہو گئیں۔ موسیٰ نے سلام کیا اور باہر نکل آیا۔

بس میں سفر کرتے موسیٰ عجیب گومگو کے عالم میں سوچتا رہا۔ پھر اس کا جی چاہا اپنے آپ پر خوب ہنسے۔ کتنا بیہودہ خیال تھا۔ واہیات۔ بالکل واہیات۔ خوشی کے اس مسکراتے لمحے میں اچانک اسے مس ہارون کا خیال آیا اور پھر رنج میں ڈوب کر اس نے ایک نقطے پر نگاہیں گاڑ دیں۔

ہسپتال کے پھاٹک میں داخل ہوتے اس نے اپنے دل کو سنبھالا دیا وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بیمار دوست اس کے چہرے سے دلی کیفیات بھانپ سکے۔ لیکن اس کے باوجود وہ جانتا تھا کہ اس کا چہرہ کتاب کے اوراق کی طرح کھل گیا تھا جسے ہر کوئی پڑھ سکتا تھا۔ اگر اس کے بیمار دوست کی حالت ذرا بھی سنبھل گئی ہو۔ تو وہ فوراً تاڑ لے گا۔ وارڈ کے برآمدے میں سے گذرتے گذرتے وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا "آخر میں کیا کروں؟" اس نے جھنجلا کر اپنے آپ کو ملامت کی۔ اس کے کانوں میں اپنے دوست کے وہ الفاظ گونجنے لگے۔ جب شروع شروع میں اس نے کہا تھا۔ "کچھ دن یہاں گذارو گے تو تم بھی میری طرح کنگال ہو جاؤ گے۔ اور بیہودہ تصورات میں ہمہ وقت کھوئے کھوئے رہنے لگو گے۔"

"آخر اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟" وہ سوچنے لگا "کہیں ایسا تو نہیں وہ

واقعی اخلاقی طور پر کنگال ہوگیا ہو" پھر وہ دماغ کو جھٹکے دیتا وارڈ میں داخل ہوا۔

بخت جمال نے آنکھیں موند رکھی تھیں۔ اس کے چہرے پر زردی پہلے سے زیادہ کھنڈ گئی تھی۔ اور وہ پہلے کی نسبت زیادہ کمزور، لاغر اور دبلا نظر آرہا تھا اس کے باوجود اس کے ہونٹ مسکرا رہے تھے جیسے کوئی سہانا خواب دیکھ رہا ہو۔ سٹول پر بیٹھے بیٹھے کچھ دیر کے لئے موسیٰ بخت جمال کے زردی مائل چہرے کو تکتا رہا پھر اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور بڑی آہستگی سے اپنے بیمار دوست کے لاغر اور کمزور ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اُف! بخت جمال کا ہاتھ بخار کی شدت سے تپ رہا تھا۔ موسیٰ نے گھبرا کر اس کے ماتھے کو چھوا۔ اسے یوں لگا جیسے ایک گرم کھولتی ہوئی لہر اس کے دوست کی پیشانی سے ہوتی، اس کی ہتھیلی میں سرایت کر گئی ہو۔ اس نے ایک جھرجھری لی۔ اور گھبرا کر ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔

بخت جمال نے اپنی زرد زرد آنکھیں کھولیں اور موسیٰ کو نگاہوں ہی نگاہوں میں خوش آمدید کہا۔ بخت جمال کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں، دوسرے ہی لمحے ایک ننھا سا آنسو دائیں آنکھ کے گوشے سے چھلک پڑا۔ "وہ آگئی!" بخت جمال بڑے دھیمے لہجے میں بڑبڑایا۔ موسیٰ نے پریشان ہو کر بخت جمال کے ہاتھ پر ایک مرتبہ اور اپنا ہاتھ دھرا۔ اس کا دل ہمدردیوں کے بے پناہ ہجوم سے امڈ رہا تھا لیکن زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے جن سے وہ اپنے دوست کی ڈھارس بندھاتا۔

بس وہ ٹکر ٹکر اپنے دوست کو تکتا رہا۔ "موت اٹل ہے میرے دوست!
موت کا راستہ کوئی نہیں روک سکتا" اس نے اپنے دل میں سوچا۔
"کیا وہ نہیں آئی؟" بخت جمال نے دوبارہ پھیپھڑوں پر زور دیا۔
"کون؟ سسٹر؟؟" موسیٰ نے یوں ہی دوست کو بہلانے کی خاطر کہا۔
حالانکہ اسے یقین ہو چکا تھا کہ وہ موت کا ذکر کر رہا تھا۔
"ہاں" بخت جمال نے نقاہت سے جواب دیا اور موسیٰ حیران رہ
گیا۔ یہ کیا معمہ ہے آخر؟۔ وہ سٹول سے اٹھا اور تیز تیز قدم بڑھاتا
سسٹر کے کمرے میں داخل ہوا۔
"معاف کیجئے سسٹر! آپ کو دو نمبر مریض بلا رہا ہے"
سسٹر نے رجسٹر پر کچھ لکھتے لکھتے نگاہ اوپر اٹھائی اور موسیٰ کی طرف
دیکھ کر مسکرائی۔
"بے چارا نمبر ۲ نفسیاتی مریض ہے۔ آج کوئی دس مرتبہ اس نے
مجھے بلایا ہے۔ اور۔ اور۔" سسٹر کچھ کہتے کہتے رک گئیں اور
پھر شرما کر نگاہیں جھکالیں۔ "وہ آپ کے بھائی ہیں کیا؟" نگاہیں بدستور جھکائے
سسٹر نے موسیٰ سے دریافت کیا۔
"نہیں سسٹر! وہ میرے بھائی تو نہیں۔ لیکن بھائیوں سے بھی بڑھ کر
عزیز ہیں۔ وہ میرے دوست ہیں۔ اور دوست کا درجہ بھائیوں سے
کچھ اوپر ہی ہوتا ہے۔ آپ نے ابھی ابھی فرمایا ہے کہ میرے دوست
نفسیاتی مریض ہیں۔ یہاں کوئی ماہر نفسیات ہے؟"

ہاں۔ کیوں نہیں۔" سسٹر نے نگاہیں اوپر اٹھائیں اور موسیٰ کو بتانے لگی کہ اس ہسپتال کا ماہر نفسیات تو ایشیا بھر میں مشہور ہے۔ "آج میں نے آپ کے دوست کی تمام باتیں اور حرکتیں ماہر نفسیات کو بتا دی ہیں" یہ کہہ کر سسٹر نے پھر قدرے شرما کر نگاہیں جھکا لیں اور آپ ہی آپ مسکرانے لگی۔ "کیا آپ کے دوست شادی شدہ ہیں؟"

"نہیں سسٹر! ابھی وہ کنوارے ہیں۔ شادی کے جھنجھٹ سے آزاد ہیں۔ ان کی حالت کیسی ہے سسٹر؟ کیا مستقبل قریب میں ان کی صحت یابی کی کوئی امید ہے؟"

"کیوں نہیں۔ کل ان کی حالت زیادہ بگڑ گئی تھی۔ ڈاکٹروں کو دن بھر تشویش رہی۔ آج تو وہ کل سے بہتر ہیں۔"

"لیکن وہ اس وقت بھی تیز بخار سے تپ رہے ہیں"

"تیز بخار کی کوئی بات نہیں۔ آج رات اتر جائیگا۔ بس ڈاکٹروں کو ان کے مسلسل ہلکے ہلکے بخار سے تشویش ضرور ہے۔"

"تو میں جاؤں سسٹر! آپ اسے دیکھنے آئینگی نا؟" موسیٰ کے اس جملے پر سسٹر نے ایک بار اور نگاہ اٹھا کر موسیٰ کی طرف دیکھا اور مسکرا دی۔ موسیٰ بھاگا بھاگا اپنے دوست کے پاس گیا اور سٹول پر بیٹھ کر اس نے اپنے دوست کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بخت جمال نے آنکھیں کھولیں موسیٰ نے مسکرا کر اسے بتایا کہ وہ آ رہی ہے۔ بس وہ آیا ہی چاہتی ہے۔ بخت جمال کے ہونٹوں پر بھی خفیف مسکراہٹ تیر گئی اور پھر منہ پھیر کر اس نے

آنکھیں موند لیں۔

رات کے اندھیرے میں موسیٰ جہانگیر آباد پہنچا اور اپنی قیام گاہ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ آج وہ قدرے مطمئن تھا۔ اس نے جلدی جلدی کپڑے تبدیل کئے اور پھر روٹی لینے بھٹیارن کے چھپر میں چلا گیا۔ بھٹیارن دکان بڑھا چکی تھی۔ ٹمٹماتے دیئے کی روشنی میں موسیٰ نے دیکھا بھٹیارن کی بیٹی مٹی کے بڑے بڑے خوان صاف کر رہی تھی۔ ہاتھ بھگو کر، خوان کے کناروں پر انگلیاں پھیرتی بھٹیارن کی بیٹی نے نگاہ اٹھائی اور موسیٰ کی طرف دیکھا۔ میلے کچیلے لباس اور بے ترتیب پھیلے ہوئے بالوں میں اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں قندیلیں سی جل اٹھیں اور ایک سوالیہ نشان بن کر موسیٰ کے چہرے پر گڑ سی گئیں۔ موسیٰ جانتا تھا وہ نگاہیں کیا معلوم کرنا چاہتی ہیں؟ موسیٰ نے بجائے لڑکی کے اس کی ماں سے پوچھا۔

"کیوں مائی۔ روٹی مل جائیگی؟"

"مل تو جائیگی پر بابو — روٹی ٹھنڈی ہوگی،" بھٹیارن نے تنور کے کناروں پر کالی سیاہ صافی پھیرتے جواب دیا۔ موسیٰ نے اٹھنی بڑھائی اور بھٹیارن سے دو روٹیاں لے کر رومال میں باندھنے لگا۔ جب بھٹیارن لوہے کی سلاخ سے تنور کے اندر راکھ کرید رہی تھی تو موسیٰ نے دوسری بار اس کی بیٹی کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں کی قندیلیں بجھ چکی تھیں۔ اور سامنے پڑے مٹی کے خوان سے بے خبر گھٹنوں میں سر دیئے جیسے اونگھ رہی تھی۔

"تمہارا بھائی کدھر گیا ہے بابو؟" بھٹیارن کے اس سوال پر اس کی بیٹی نے چونک کر موسیٰ کی اور دیکھا اس کی اداس آنکھوں میں شکوہ تھا اور نہ

شکایت۔ بس ایک سوال تھا۔ ایک کرب تھا، ایک بیتابی تھی۔ اور بخت جمال کے بارے میں کچھ جاننے کی ایک موہوم سی خواہش تھی۔

"وہ کافی دنوں سے بیمار ہے مائی! ہسپتال میں داخل ہے"۔ موسیٰ نے مختصر سا جواب دیا اور دل گرفتہ ہو کر کالے سیاہ چھپر سے سر جھکا کر باہر نکل آیا۔ چھپر کے باہر ابھی موسیٰ نے گندی نالی پار نہیں کی تھی کہ بھٹیارن نے پیچھے سے آواز دی۔

"باقی پیسے لیتے جاؤ۔ بابو"

موسیٰ رک گیا پھر مڑا اور چھپر کے دروازے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ بھٹیارن کے تنور سے راکھ کریدنے سے ہلکا ہلکا کڑوا کسیلا دھواں چھپر میں طواف کر کے دروازے کے راستے باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بھٹیارن کی بیٹی دروازے پر آئی اور موسیٰ کی ہتھیلی پر پیسے رکھتی اس کی طرف یوں دیکھنے لگی جیسے اسے پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ اس کی آنکھوں کی قندیلیں دوبارہ جل اٹھی تھیں اور کڑوے کسیلے دھوئیں نے اس کی آنکھوں میں نمی بھر دی تھی۔

ریزگاری کے چند سکے جیب میں ڈال کر موسیٰ واپس مڑا اور گندی نالی کو پار کر کے اپنی قیام گاہ کی جانب چل پڑا۔ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور باورچی خانے میں پڑی ٹوکری میں سے چند آلو نکال کر انہیں چھری سے چھیلنے لگا آدھ گھنٹہ بعد آلو تلے جا چکے تھے اس نے چولھے سے دیگچی اتاری اور وہیں زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور کھانا کھایا۔ ایسے میں اسے اپنا دوست بے طرح یاد آیا۔ اس کی بے ترتیبی، لاپرواہی اس کی اوٹ پٹانگ باتیں اور اس کی ناکام

اور ادھوری محبتیں۔ بھٹیارن کی بیٹی کی وساطت سے اسے سب کچھ یاد آیا برتن سمیٹ کر اس نے غسلخانے میں بکھیر دیئے اور ہلکے سُروں میں ایک غزل گنگنانے لگا۔ سہ

میں ترا کچھ بھی نہیں ہوں مگر اتنا تو بتا
دیکھ کر مجھ کو ترے ذہن میں آتا کیا ہے

مس ہارون کا خیال آتے ہی اس کے ذہن میں ایک کانٹا سا چبھ کر رہ گیا۔ آخر وہ کھل کر سامنے کیوں نہیں آتی؟" اسے یوں لگا جیسے مس ہارون کا خیال اس کے حواس پر ایسے چھا رہا ہو جیسے کسی بلند و بالا برفانی چوٹی پر بادل کا ٹکڑا بڑی آہستگی سے اُترے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے چوٹی کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے لے۔ سوچتے سوچتے اس کا دل منوں بوجھ تلے دب سا گیا۔ ہاتھ دھو کر وہ اپنے کمرے میں آ گیا اور بتی گل کر کے چارپائی پر لیٹ گیا۔ اندھیرے نے اس کے تصورات کو اور جلا بخشی۔ اور وہ انہونی باتوں کے متعلق سوچنے لگا۔ خود یہ بات اس کے دل پر آرے چلانے لگی۔ کہ مس ہارون پر کسی اور کا قبضہ ہے۔ وہ کسی اور کی ملکیت ہے۔ اس کے کردار میں کتنا عجیب تضاد پایا جاتا تھا۔ ایک طرف تو اس کی منگنی ہو چکی تھی۔ دوسری طرف وہ ناظم صاحب سے بھی ناطہ جوڑے ہوئے تھی اور ساتھ ہی ساتھ اپنے غمزدل سے موسیٰ کو بھی لبھا رہی تھی۔ وہ اپنے ہونے والے شوہر کو کیا منہ دکھائے گی؟" اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے وہ نہ جانے کیا کچھ سوچتا رہا۔ "کبھی یوں بھی ہو سکتا ہے کہ وہ میرے ساتھ فلم دیکھنے جائے۔ سڑکوں پہ گھومے اور پارکوں میں پھرے۔"

سوچتے سوچتے اس کے جذبات میں ہیجان سا مچ گیا۔ اس کے دل میں میٹھی میٹھی گدگدی ہونے لگی اور بدن پر چیونٹے سے رینگنے لگے۔ تب بیقرار ہو کر اٹھا، اور بتی جلا دی۔ اور سر تھام کر بیٹھ گیا۔

"کیسی نادانی اور بچپنے کی باتیں سوچ رہا ہوں میں بھی۔ کہیں بچپن کی طرف تو مراجعت نہیں کر رہا؟" بیٹھے بیٹھے وہ اپنے آپ کو کوسنے لگا۔ اور پھر ایک مصمم ارادے کے ساتھ اٹھا اور بتی گل کر کے دوبارہ لیٹ گیا۔

"کچھ بھی ہو۔ میں اس کے سامنے جھکوں گا نہیں۔ یہ میرا اٹل فیصلہ ہے" اس نے اپنے فیصلے پر آخری مہر لگائی اور خالی الذہن ہو کر کچھ دیر کروٹیں بدلتا رہا پھر لمبی تان کر سو گیا۔

جانے اسے نیند کب آئی تھی لیکن جب صبح اس کی آنکھ کھلی تو روشندان کے ٹوٹے ہوئے شیشے میں چھن چھن کر آتی، کانپتی لرزتی کرن دیکھ کر مو سی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ جلدی جلدی حوائج ضروریات سے فارغ ہو کر داڑھی مونڈنے بیٹھ گیا۔ پھر نہا دھو کر اس نے کپڑے تبدیل کئے۔ آگ جلانے، چائے بنانے اور ڈبل روٹی کاٹنے کا وقت نہیں رہا تھا۔ کپڑوں پہ ایک ناقدانہ نظر ڈال کر اور آخری بار آئینے میں اپنی صورت دیکھ کر اس نے دروازہ پہ قفل چڑھائے اور سگریٹ سلگا کر منہ میں دبائے باہر آ گیا۔ بھاگا بھاگا جہانگیر آباد چوک پہنچا۔ طلباء کی بسیں کب کی جا چکی تھیں۔ اور سامنے سڑک پر دور دور تک کسی بس کے آنے کے آثار بھی نہ تھے اس لئے سواریوں کی تلاش میں کھڑے تانگے پہ ناچار سوار ہو گیا اور مزید سواریوں کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ مہینے کی آخری تاریخیں ہو لہ

جیب میں پیسے بھی نہ ہوں اور آدمی کو دفتر جانے کی بھی جلدی ہو، ایسے میں وہ کیا کرے۔ بس وہ سواریوں کے انتظار میں بیٹھا بیٹھا کڑھتا رہے۔ اس نے کوچوان کی طرف دیکھا جو بڑے آرام و سکون سے اگلی نشست پر اکڑوں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ اسے کوئی جلدی نہ تھی اور پھر وہ موسیٰ کی طرح منہ نہار بھی تو نہ تھا۔ "خوب ڈٹ کر ناشتہ کیا ہو گا اس نے" موسیٰ سوچنے لگا۔ پردیس میں انسان بڑا ندیدہ اور لالچی ہو جاتا ہے۔ اور بڑی معمولی معمولی چیزوں کی خواہش کرنے لگتا ہے۔

ایک بھاری بھرکم جُثے والی سواری دھم سے اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی پھر دو سواریاں یکے بعد دیگرے آئیں اور اگلی نشستوں پر بیٹھ گئیں۔ تب کوچوان نے پاؤں لٹکا دیئے اور باگ سنبھال کر گھوڑے کو کوڑا دکھایا۔ کوئی آدھ گھنٹہ میں تانگہ ریلوے سٹیشن پہنچا۔ جامعہ کی بسوں کا انتظار فضول تھا۔ اب ان کا دوسرا پھیرا ساڑھے دس بجے لگتا تھا۔ اتنے وقت میں تو وہ دفتر پہنچ بھی سکتا تھا سوچتا ہوا وہ بس سٹاپ کی طرف تیز تیز قدم بڑھاتا لپکنے لگا۔ سڑک عبور کرتے وہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ ایک تیز رفتار رکشہ ہارن بجاتا اس کے سامنے گزر گیا۔ بس سٹاپ کی طرف اس نے دو چار قدم ہی لئے ہوں گے کہ وہی رکشا دوبارہ ایک زناٹے سے اس کے بالکل قریب آ کر رُک گیا۔ "موسیٰ صاحب" ایک باریک نسوانی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اور وہ رکشہ میں بیٹھی خاتون کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔

"معاف کیجئے۔ میں برقعہ میں آپ کو پہچان نہ سکا"، رکشا میں بیٹھی مسز ارشاد

کو پہچان کر موسیٰ ہکلایا۔ "آپ لیٹ ہیں یا کچھ پیریڈ خالی ہیں؟"

"پیریڈ تو کوئی خالی نہیں۔ بس لیٹ ہوگئی ہوں۔ آپ کہاں جا رہے تھے؟"

"جامعہ جا رہا تھا۔ اپنی بسیں تو جا چکی ہیں۔ سوچا پبلک بس پکڑ دوں۔"

"میں بھی جامعہ جا رہی ہوں۔ آئیے۔ کافی جگہ ہے۔" مسز ارشاد نے قدرے کھسک کر موسیٰ کے لئے جگہ بنائی۔ موسیٰ نے سر جھکا کر رکشہ میں پہلے ایک پاؤں دھرا اور پھر پورے جسم کو بڑی مشکل سے تھوڑی سی جگہ میں سموتے سمٹ سکڑ کر مسز ارشاد کے برابر بیٹھ گیا۔ رکشہ گول چوراہے کا لمبا موڑ کاٹ کر ناک کی سیدھ میں ٹوٹی پھوٹی سڑک پر اچھلتا کودتا، ہچکولے کھاتا تیز رفتار سے بڑھنے لگا۔

"پہلی مرتبہ آپ کو برقعہ میں دیکھا ہے اس لئے پہچاننے میں دقت ہوئی" موسیٰ نے مسز ارشاد کے سراپے کا جائزہ لے کر کہا۔ مسز ارشاد نے ایک نظر موسیٰ کو دیکھا اور پھر مسکرا نے کر سامنے دیکھنے لگی۔

"آپ بھی یہیں کہیں نزدیک رہتے ہیں کیا؟" قدرے توقف کے بعد مسز ارشاد نے برسبیلِ تذکرہ موسیٰ سے دریافت کیا۔

"میں جہانگیر آباد میں رہائش رکھتا ہوں۔ آج کچھ دیر ہوگئی جامعہ کی بس نہ پکڑ سکا" موسیٰ نے جواب دیا۔ اس کے بعد ہر دو جانب خاموشی چھا گئی۔ رکشہ منزل پر منزل طے کرتا بڑھتا رہا۔ وسیع چوراہے، فلک بوس عمارتیں اور شفاف سڑکیں پیچھے چھوڑتا رکشہ جامعہ کی سمت رواں دواں رہا۔ اس اچھل کود میں کبھی کبھی ان کی پنڈلیاں ایک دوسرے کو چھو لیتیں اور دونوں اپنی اپنی جگہ اور سمٹ سکڑ کر بیٹھ جاتے۔

رکشہ میں بیٹھے بیٹھے موسیٰ نے باہر جھانکا۔ جامعہ کی خوبصورت اور رنگین عمارتیں قریب تر آرہی تھیں۔ تب اسے خیال آیا کہ اس کی جیب میں سوائے چند سکوں کے کچھ بھی نہیں۔ رکشہ کا میٹر چار روپے سے کچھ اوپر بتا رہا تھا۔ وہ سٹپٹا کر رہ گیا اور دل ہی دل میں کڑھنے لگا۔ اس میں تو بڑی سُبکی ہوگی۔ وہ سوچنے لگا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ پھر اسے وہ مقولہ یاد آیا کہ عورت کے سامنے مرد کو ہمیشہ لاف زنی سے کام لینا چاہیئے اور اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنا چاہیئے۔ ورنہ وہ بدظن ہو جاتی ہے۔ رکشہ سے اتر کر موسیٰ جھوٹ موٹ کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔

"نہیں مسز ارشاد! یہ نہیں ہو سکتا۔ کرایہ میں ادا کروں گا" اس نے جیب میں ہاتھ ڈالے ڈالے اکڑ کر کہا۔ لیکن تب تک مسز ارشاد پرس سے پانچ روپے کا نوٹ نکال چکی تھیں اور ڈرائیور کو تھما بھی چکی تھیں۔

"کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا موسیٰ صاحب!۔ رکشہ میں نے کیا تھا۔ آپ تو اتفاق سے راستے میں مل گئے تھے" مسز ارشاد نے باقیماندہ ریزگاری پرس میں ڈالتے کہا۔ پھر وہ رکشہ کی دوسری جانب اتر پڑی اور رکشہ آگے بڑھ گیا۔

"اچھا تو مسز ارشاد۔ بہت بہت شکریہ۔ وقفے میں فرصت ملے تو ضرور تشریف لائیےگا۔ چائے کی پیالی پہ باتیں ہوں گی۔"

موسیٰ سلام کر کے اپنی راہ ہو لیا۔ اور مسز ارشاد غسلخانے میں داخل ہوئی۔ موسیٰ سوچنے لگا۔ بغیر بناؤ سنگار کے تو یہ طالبات جماعت میں قدم بھی نہیں رکھتیں۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا موسیٰ زینہ پھلانگتا برآمدے میں آ گیا۔ سیڑھیوں میں لڑکیوں کے ایک گروہ سے ٹکر ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔ غالباً یہ فنونِ لطیفہ کی طالبات تھیں۔

تبھی تو ان کی گردنیں کچھ ضرورت سے زیادہ لمبی اور اکڑی ہوئی تھیں۔ برآمدے میں جنگلے کے ساتھ ساتھ بڑھتے موسیٰ نے نیچے نگاہ دوڑائی۔ جہاں سرسبز چوکور قطعے کے گرداگرد رنگ رنگ کے پھول کھل رہے تھے اور فوارے کے ارد گرد تنے ہوئے احاطے کی دیوار پر رنگ رنگ کے لباس میں ملبوس طالبات بیٹھی آپس میں چہلیں کر رہی تھیں۔ موسیٰ نے دور ہی سے دیکھا کہ ان کے دفتر کا دروازہ کھلا ہے پھر اس نے گزرتے گزرتے مس ہارون کے کمرے پر بھی اچٹتی نگاہ ڈالی۔ شاید وہ اپنے کمرے میں موجود تھی۔ تبھی تو اندر سے ٹک ٹک۔ گرر گرر کی مسلسل آواز آرہی تھی۔ غالباً وہ نئے پراجیکٹ کے اعداد و شمار اکٹھے کر رہی تھی۔

اپنے دفتر میں آکر سب سے پہلے موسیٰ نے حاضری رجسٹر پر دستخط کئے پھر اپنی میز کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ صبح سے اس نے چائے پی تھی اور نہ ہی کچھ کھایا تھا۔ اس کا دماغ شائیں شائیں کر رہا تھا اور پھر خالی پیٹ تو کام ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ سو اس نے سوچا پہلے کینٹین میں جا کر بھرپور ناشتہ کرے گا۔ "ادھار کھاتہ زندہ باد" اس نے دل ہی دل میں ترنگ میں آکر نعرہ لگایا۔ لیکن میز پر مس ہارون کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر پڑی دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے سوچا۔ ہو سکتا ہے دیر سے آنے کی جواب طلبی ہو۔ مگر ایسی کوئی بات نہ تھی اور پھر اس معاملے میں صرف ناظم صاحب ہی اس سے جواب طلب کر سکتے تھے۔ مس ہارون ایسی جواب طلبی کی مجاز نہ تھیں۔ موسیٰ نے پرچی پر نگاہیں گاڑ دیں اور گردن ذرا ٹیڑھی کر کے پرچی پڑھنے لگا۔

"مسٹر موسیٰ!

مہربانی کر کے تپ دق والے پراجیکٹ

کے اعداد و شمار والی مثل میرے پاس

بھیج دیجیئے۔ اشد ضرورت ہے۔

مس ہارڈن"

اس شکستہ تحریر میں کتنی دلکشی اور جاذبیت اور مٹھاس تھی۔ اس نے یوں محسوس کیا جیسے وہ دفتری پیغام نہ ہو۔ محبت نامہ ہو اور کسی حسین راز کی طرف ہلکا سا اشارہ ہو۔ آج مس ہارڈن کی شکستہ تحریر اسے یوں لگی جیسے اس نے کاغذ کے اس چھوٹے سے ٹکڑے پر موتی بکھیر رکھے ہوں۔ اس نے چاہا کاغذ کے اس حقیر پرزے کو اٹھا کر چوم لے۔ اس نے بڑی احتیاط سے کاغذ کا ٹکڑا تہہ کیا اور اپنے ٹھنڈے کوٹ کی بغلی جیب میں رکھ لیا۔ پھر اس نے الماری کھولی۔ متعلقہ مثل نکال کر باہر برآمدے میں آیا۔ ناظم کے دفتر کے سامنے اس کا چپڑاسی دوسرے چپڑاسی سے گپیں ہانک رہا تھا۔ اس نے آواز دے کر اسے بلایا اور پھر مثل کے بارے میں ہدایت کر کے وہ دوسری جانب والی سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا اور کنٹین کی اور چل پڑا۔

ناشتہ کرتے کرتے اس نے دو مرتبہ کانٹا پلیٹ پر رکھا اور کاغذ کے پرزے کو ٹٹولا۔ جیسے وہ کاغذ کا پرزہ، پرزہ نہ تھا۔ ایک پرونوٹ تھا۔ ایک اقرار نامہ تھا۔ جس کے تحت مس ہارڈن نے اپنی ساری زندگی اس کے ہاتھوں گروی رکھ دی تھی۔ ایک آدھ توس اور آملیٹ کے چند لقموں

سے ہی اس کا پیٹ بھر گیا اور اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔..........
..۔ پھر رومال سے ہاتھ پونچھ کر اپنے لئے چائے بنانے لگا۔ چائے کی دو پیالیاں چڑھا کر وہ کنٹین سے اُٹھ آیا اور لمبے لمبے جست بھرتا دوبارہ سیڑھیاں پھلانگ کر اپنے دفتر میں داخل ہُوا۔ ڈھیروں کام پڑا تھا کرنے کو لیکن پتہ نہیں اس کا دل کام میں کیوں نہیں لگ رہا تھا۔ ایک نشہ سا چھا رہا تھا اس کے انگ انگ پر اور وہ دل سے چاہنے لگا کہ وہ یونہی مخمور رہے۔ کام جائے بھاڑ میں۔ دفتروں کے کام تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ وہ سوچنے لگا۔ بس ایک دن کام کو ہاتھ نہ لگایا تو کونسی قیامت ٹوٹ پڑیگی۔ پھر وہ برآمدے میں آکر کھڑا ہو گیا اور نیچے لڑکیوں کے غول کے غول گھومتے دیکھنے لگا۔ یہ حسینوں کی ٹولیاں۔ یہ بیباک ٹھٹھا مخول کرنے والی الھڑ دوشیزائیں۔ یہ رنگ رنگ کے لباس اور یہ سانپ کی طرح بل کھاتے ہوئے جسم۔ کاش!۔ وہ سوچنے لگا۔ وہ پھر سے جوان ہو جاتا اور اس جامعہ میں ایک طالب علم کی حیثیت سے داخلہ لیتا!۔ اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور کلرکوں کے ہال کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

"اخاہ! عید کا چاند نظر آگیا" موسیٰ کے ہال کمرے میں داخل ہوتے ہی اعجاز نے چوٹ کی اور موسیٰ مسکرا دیا۔ دراصل بہت دنوں بعد موسیٰ آج کلرکوں کے کمرے میں آیا تھا۔ اور پھر جب سے موسیٰ اور مس ہارڈن کی گاڑھی چھننے لگی تھی۔ موسیٰ کلرکوں سے کچھ کٹ سا گیا تھا۔ جسے وہ خود بھی محسوس کرتا تھا لیکن وہ کیا کرتا، فرصت کے جتنے لمحے میسّر آتے، مس ہارڈن کی نذر ہو جاتے اور دفتری اوقات کے علاوہ ان کی ملاقات ہی نہیں ہوتی تھی۔ ایک یہاں نہیں

تمام بڑے شہروں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ موسیٰ نے معذرت کے لئے ہونٹ کھولے ہی تھے کہ اعجاز نے ایک اور وار کیا۔

"آپ نے دیکھا ہوگا موسیٰ صاحب!۔ ممولا بھی کبھی باز کی طرح بڑی اونچائی پر اڑ لیتا ہے۔ لیکن یہ چڑیاں اور دوسرے چھوٹے چھوٹے پرندے اس کے جھپٹنے کے انداز ہی سے جان جاتے ہیں کہ وہ ممولا ہے اس لئے وہ اس سے بالکل خوف نہیں کھاتے۔ اس کے برعکس وہ باز کے سائے سے بھی سہم سہم جاتے ہیں۔"

موسیٰ نے اعجاز کی طرف دیکھا اور ایک مرتبہ اور مسکرا کر رہ گیا۔ گو اس مرتبہ خود اس کی مسکراہٹ بھی طنز سے بھرپور تھی کہ وہ جانتا تھا کہ اعجاز ایک مدت تک مس شہلا اور مس برکت مسیح پر ناکام ڈورے ڈال چکا تھا اور جب وہ اس کے قابو میں نہ آئیں تو وہ فاحشہ عورتوں کے پیچھے مارا مارا پھرنے لگا۔ کتنی ہی مرتبہ اعجاز نے باتوں ہی باتوں میں یہ جتایا کہ عورت ایک قابل نفرت حیوان ہے۔ مرد وہ ہے جو پہلے ہی موقع سے فائدہ اٹھائے اور عورت کا سب کچھ چھین لے۔ اس میں اور اعجاز میں بس اتنا ہی فرق تھا کہ وہ قدرے محتاط اور درمیانہ روی کا قائل تھا اس کے برعکس اعجاز انتہا پسند تھا۔ شروع شروع میں مس برکت مسیح نے اعجاز کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا بھی تھا۔ خصوصاً اس دن کے بعد جب کنٹین میں اعجاز نے مس برکت مسیح کی خاطر لڑائی مول لی تھی۔ مس برکت مسیح اس کی دل سے قدر کرنے لگی تھی، لیکن پھر درمیان میں پتہ نہیں کیا ہوا۔ مس برکت مسیح آپ ہی آپ

اس سے کٹ گئی تھی۔ اور شائد اسی وجہ سے اس کے ذہن میں پراگندگی بھر گئی تھی اور وہ ہر عورت کو ایک ہی نظر سے دیکھنے لگا تھا۔

"آپ کے تحائف کے بڑے چرچے ہو رہے ہیں موسیٰ صاحب" اعجاز نے تیسرا حملہ کیا۔ لیکن موسیٰ پھر بھی ٹس سے مس نہ ہوا۔ وہ آج لڑنے کے موڈ میں تھا ہی نہیں۔ اس لئے بڑے صبر و تحمل سے سب وار سہتا رہا۔

"اس روز مس ہارون آپ کی دی ہوئی تصویروں کی بڑی تعریف کر رہی تھیں عجیب بات تو یہ ہے کہ آپ کے تحفے صرف لڑکیوں تک محدود ہیں۔" اعجاز نے ایک قہقہہ لگایا اور داد طلب نگاہوں سے دیگر کلرکوں کی طرف دیکھنے لگا جو اس کی باتیں بڑی دلچسپی سے سن رہے تھے اور خوش ہو رہے تھے۔

"فضول باتوں کے لئے میرے پاس وقت نہیں" موسیٰ نے مسکرا کر کہا اور پھر وہاں سے چل دیا۔ برآمدے میں گذرتے اس نے کنکھیوں سے مس ہارون کے دفتر کی جانب دیکھا۔ اُسے یوں لگا جیسے مس ہارون نے اسے سلام کیا ہو۔ اس نے گردن پوری طرح موڑ کر دیکھا تو اس غلط فہمی پر دل ہی دل میں ہنس دیا۔ مس ہارون نے سلام نہیں کیا تھا بلکہ وہ پنسل بالوں میں دیئے سر کھجلاتی شیشوں سے باہر کی اور دیکھ رہی تھی۔

دل میں ایک عجیب قسم کی کسک لئے وہ دفتر میں آ کر کرسی پر گر گیا" میں اس دل کا کیا کروں؟" اس کی انگلیوں کی گرفت اس کے بالوں میں اور مضبوط ہو گئی۔ پھر وہ بالوں کو جھٹکے پر جھٹکے دیتا اپنے آپ سے الجھ پڑا۔

کوئی ایک گھنٹے بعد چپڑاسی اس کے دفتر میں آیا اور مس امتیاز کا سلام دیا۔

"وہ کہاں بیٹھی ہیں؟" موسیٰ نے چپڑاسی سے پوچھا۔

مس ہارون کے دفتر میں جناب اور آپ کو وہیں بلایا ہے" چپڑاسی نے جواب دیا۔

"ملازم حسین! تم میری طرف سے مس امتیاز سے معذرت کر دو اُن سے کہو میں بہت مصروف ہوں۔ فرصت ملی تو آجاؤں گا"

موسیٰ کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ گو اسے ایسی ہی توقع تھی پھر بھی وہ کافی دیر تک شش و پنج میں مبتلا رہا اور سوچتا رہا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھائے یا نہ اٹھائے۔ خواہ مخواہ کی بڑائی بھی اچھی نہیں ہوتی۔ وہ اپنے دل کو سمجھانے لگا۔ اس نے الماری سے چند مثلیں اٹھائیں اور میز پر رکھ دیں۔ پھر ایک ایک کر کے ان کا یونہی سرسری سا مطالعہ کرنے لگا۔ تاکہ اپنے آپ کو مصروف رکھ سکے۔ اور دیکھنے والا بھی یہی سمجھے کہ وہ بہت مصروف ہے۔ چپڑاسی کے چلے جانے کے کچھ دیر بعد ہی مس امتیاز اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔

"ابھی ابھی میں نے آپ کو بلایا تھا اور آپ نہیں آئے۔ آپ کے بھی نخرے بڑھ رہے ہیں" مس امتیاز بولی اور پھر آپ ہی آپ مسکرانے لگی۔

"میں نے تو عرض کر دیا تھا مس امتیاز! کہ میں بے حد مصروف ہوں۔ دراصل ہر وقت فضول باتیں کرنا بھی اچھا نہیں لگتا۔ تھوڑا بہت وقت دفتر کو بھی دینا چاہیے"

"اچھا! تو ہماری باتیں فضول ہو گئیں؟" مس امتیاز نے بناوٹی غصے سے کہا۔ اور موسیٰ مسکراتا رہا۔

"اچھا تو۔ آپ فرمائیں۔ آپ مجھے کس لئے بُلا رہی تھیں؟" موسیٰ کی باچھیں کھل اٹھیں۔

"میرے ساتھ آؤ۔ چلو اٹھو۔ بہت اہم بات ہے۔" مس امتیاز مڑ کر دروازے میں آ کر کھڑی ہو گئیں اور پھر گردن موڑ کر موسیٰ کے اٹھنے کا انتظار کرنے لگی۔

"اب اٹھیئے بھی۔ یوں بیٹھے ہیں جیسے کرسی سے چپک گئے ہوں۔"

موسیٰ کے دل میں لڈو پھوٹنے لگے۔ اسے اپنی اہمیت کا شدید احساس ہوا۔ لیکن دلی تاثرات چھپاتا، منہ ہی منہ بڑبڑاتا اٹھ آیا جیسے دل پر جبر کر کے جا رہا ہو۔

مس امتیاز، مس ہارون کے دفتر میں داخل ہوئی تو وہ دروازے کے باہر ہی کھڑا رہا۔

"مس امتیاز! آپ کو جو بات کرنی ہے، کہیں۔ میں کھڑے کھڑے سن لوں گا۔ ورنہ اپنے دفتر میں چلیئے۔ اس دفتر میں میرا داخلہ ممنوع ہے۔" موسیٰ نے قدرے درشت اور تیز لہجے میں کہا تاکہ مس ہارون سن لے۔

"ہاں ہاں۔ امتیاز! یہ اس کمرے میں قدم نہیں رکھیں گے۔ ہٹ کے بڑے پکے ہیں۔" مس ہارون نے بالواسطہ موسیٰ کی بات کا جواب دیا۔

"یہی پوچھنے تو بلایا ہے موسیٰ صاحب! آخر بات کیا ہے؟ اندر تو آیئے نا۔" مس امتیاز دوبارہ دروازے میں آ گئیں اور مس ہارون کی وکالت کرنے لگیں

"جی نہیں شکریہ۔ مس امتیاز!۔ میں اپنی اور توہین برداشت نہیں کر سکتا۔"
موسیٰ نے باہر ہی کھڑے کھڑے سنجیدگی سے کہا۔

"آپ اندر تو آئیں نا۔ موسیٰ صاحب!۔ آپ کی شکایت پر پوری طرح غور کیا جائے گا۔" مس امتیاز نے اُسے گہری نظروں سے دیکھا۔ پھر آپ ہی آپ ہنس پڑیں۔

"میں نے کہا۔ آرٹسٹ صاحب! اندر تشریف لے آئیے۔ آپ سے کوئی پردہ نہیں،" مس ہاردن ہنستے ہنستے بے حال ہو کر اندر سے پکاریں۔

"بس اب تو یہی ایک صورت رہ گئی ہے" مس امتیاز نے ہاتھ بڑھاتے کہا۔ کہ میں آپ کو ہاتھ سے پکڑ کر اندر لے چلوں۔"

موسیٰ نے ادھر اُدھر دیکھا اور یہ سوچ کر جھٹ سے اندر داخل ہوا کہ بھاری بھر کم جُثے والی امتیاز سے دھینگا مشتی کرتے اگر کسی نے دیکھ لیا۔ تو دونوں کی بدنامی ہو گی۔ لیکن اندر جا کر بھی وہ کھڑا ہی رہا۔ اور مس ہاردن کو ایک ٹک دیکھتا چلا گیا جس کے چہرے پر بدستور مُسکراہٹ کھیل رہی تھی اور نظریں جھکائے کوئی سرکاری کاغذ پڑھتی یوں لگ رہی تھی جیسے بڑی پُرسکون اور مطمئن ہو۔ جیسے سارا کھیل اس کی منشاء کے مطابق کامیابی سے کھیلا جا چکا ہو۔

"ہاں تو اب فرمایئں،" موسیٰ نے باری باری دونوں لڑکیوں کی طرف دیکھ کر زبان کھولی۔

"مجھے کس لئے بلایا گیا ہے،" پھر اس نے مس ہاردن پر اپنی نگاہیں گاڑ دیں۔ اُف! کیا ملاحت اور تازگی ہے اس کے چہرے پر! جیسے شبنم سے دُھلا ہوا تر و تازہ سفید گلاب ہو۔ آج وہ اپنی فطری عمر سے کچھ کم ہی لگتی تھی۔ شاید

ابھی ابھی میک اپ تازہ کیا تھا۔ اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اوپر اٹھائیں اور مسکرا کر موسیٰ کی طرف دیکھا۔

"ان بلوریں شفاف آنکھوں اور ان کھنکتے نقرئی قہقہوں نے جانے کتنے دلوں کو مجروح کیا ہوگا" وہ کھڑا کھڑا سوچتا رہا۔

"ہم نے آپ کو اس لئے بلایا ہے کہ آپ اپنی شکایت بیان کریں۔ اور وجہ بتائیں کہ آپ کے منہ پھلائے رکھنے کے خلاف کیوں نہ تادیبی کارروائی کی جائے؟" اب مس ہارون نے براہ راست موسیٰ سے سوال کیا۔

"لہجہ تو آپ کا سرکاری ہے۔ کیا گفتگو بھی سرکاری نوعیت کی ہے یا نجی؟" موسیٰ تلملا کر رہ گیا۔ اور اداس ہو کر سوچنے لگا۔ کہ کیا اس عورت کا پلہ ہمیشہ ہی بھاری رہے گا۔ اور وہ اسے یونہی ذلیل کرتی رہے گی؟ اس نے مس ہارون کو گھور کر دیکھا۔ پھر کرسی کی پشت پر دونوں ہاتھ رکھ کر نگاہیں جھکالیں اور ہونٹ کاٹنے لگا۔ مس ہارون اسے تکتی برابر ہنستی چلی جا رہی تھی۔ برعکس اس کے مس امتیاز سنجیدہ ہوگئی تھی۔ اور ایک طرف کھڑی کبھی موسیٰ اور کبھی مس ہارون کو دیکھنے لگتی۔

"امتیاز! ان سے پوچھیں۔ یہ کس بات پر برہم ہیں؟" مس ہارون نے تمسخرانہ انداز میں سوال کیا۔

"ہاں موسیٰ صاحب! آخر کچھ پتہ تو چلے!" مس امتیاز نے ہمدردی جتائی۔

"یہ آپ انہی سے پوچھیے مس امتیاز!۔ یہ جو آپ کے اور میرے سامنے بیٹھی ہیں۔ کسی کے جذبات مجروح کر کے کتنی خوش نظر آ رہی ہیں!"

موسٰی نے سب کچھ بتلانے کے زبان کھولی۔ "اس روز۔ میں یہاں یعنی محترمہ مس ہارڈن سے لائبریری کی چابیاں لینے آیا۔ اور ـــــ"۔ موسٰی رُک کر مس ہارڈن کی طرف دیکھنے لگا جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں پوری بات کہنے کی اجازت چاہتا ہو۔ موسٰی نے محسوس کیا کہ مس ہارڈن کا چہرہ سُرخ ہوگیا ہے۔ اس کے بعد زرد اور پھر اسے یوں لگا جیسے اس کی آنکھوں سے چنگاریاں سی نکلنے لگی ہوں اور اس کی گردن کی رگیں تن گئی ہوں۔

مس ہارڈن نے لقمہ دیا۔ اور موسٰی کی ادھوری بات آپ مکمل کرنے کی ٹھان لی۔ اس نے مس امتیاز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"اس وقت میں بہت مصروف تھی جب موسٰی صاحب چابیاں لینے آئے تھے" مس ہارڈن نے کانپتے لہجے میں بات بڑھائی "میں نے ان سے کہا تھوڑی دیر بعد آنا۔ اس پر جناب کا پارہ ایک دم چڑھ گیا۔ اور اونٹ کی طرح منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے پاؤں پٹختے باہر نکل گئے اور پھر آج تک بات کرنے کے روادار نہ ہوئے"

مس ہارڈن نے کس ڈھٹائی سے رُو در رُو جھوٹ بولا تھا۔ اس سفید جھوٹ پر موسٰی دنگ ہی تو رہ گیا۔ موسٰی نے مس ہارڈن کی طرف دیکھا، اور اس کی بیچارگی پر رحم کھاتا خاموش کھڑا رہا۔

"یہ تو بڑی معمولی بات تھی موسٰی صاحب" مس امتیاز نے مس ہارڈن کی حمایت میں زبان کھولی۔ "ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو اس قدر محسوس نہ کیا کیجئے۔ ہم آپ کو اپنا سچا دوست اور ہمدرد سمجھتی ہیں۔ آپ یقین کریں۔ اس

شعبے میں ہم اتنی بے تکلف اور کسی سے بھی نہیں ہیں جتنی آپ سے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی دفتری مصروفیات اتنی بڑھ جاتی ہیں کہ ہمیں سر کھجلانے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔ آپ کو چاہیئے ایسے وقت میں ذرا تحمل سے کام لیا کریں۔ دراصل آپ بے حد جذباتی واقع ہوئے ہیں۔ رائی کا پہاڑ بنا لیتے ہیں۔ میں بھی سوچ رہی تھی پتہ نہیں ایسی کیا بات ہو گئی تھی جو آپ ہر وقت منہ پھلائے رکھتے تھے اور سارا سارا دن اپنے کمرے ہی میں گھسے رہتے تھے۔ چلو اب تو بات صاف ہو گئی۔ اور اس خوشی میں ہم ایک ایک پیالی چائے اور ایک ایک سموسہ کھائیں گے۔ میں ابھی آئی" مس امتیاز لمبا چوڑا لیکچر جھاڑ کر باہر کو لپکیں۔ اب موسیٰ اور مس ہارون کمرے میں اکیلے رہ گئے۔

مس ہارون نے نگاہ اٹھا کر ملامت آمیز انداز میں موسیٰ کی طرف دیکھا اور پھر شکایت بھرے لہجے میں کہنے لگیں۔

"میں تو آپ کو بڑا عقلمند سمجھ رہی تھی۔ اچھا ہوا آپ نے میری آنکھیں کھول دیں ورنہ میں تو ——" مس ہارون نے تیکھی نگاہوں سے موسیٰ کو دیکھ کر بات ادھوری چھوڑ دی اور مسکرانے لگی۔

"مجھے کیا علم تھا مس ہارون! میں تو سمجھ رہا تھا اس میں کوئی حرج ہی نہیں اگر میں امتیاز کو وہ چابیوں والا قصہ سنا دیا۔ خدا گواہ رہے مس ہارون! اب تو وقت گذر چکا ہے۔ میں نے محض چابیاں لینے کے لئے آپ کی کلائی مروڑی تھی ورنہ میری نیت بالکل صاف تھی۔"

"ہونہہ" مس ہارون نے ہونٹ سکیڑتے کہا "سب مرد ایسا ہی کہا کرتے ہیں۔ مرد ذات ہے ہی بڑی جھوٹی۔ گویا آپ کی وہ حرکت بڑی معمولی نوعیت

کی تھی۔ اور آپ اس کا ڈھنڈورا پیٹنا چاہتے تھے" مس ہارون کی آنکھوں میں پھر قندیلیں سی چمک اٹھیں "خدا کے بندے ایسی باتیں کوئی لڑکیوں کو بھی بتاتا ہے؟۔ اور پھر میں تو مس امتیاز سے اتنی بے تکلف نہیں جتنا آپ نے سمجھ رکھا ہے"۔

موسیٰ کی باچھیں کھل اٹھیں۔ اور دل بڑے زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے چاہا جو کھیل وہ اس روز نامکمل چھوڑ گیا تھا۔ آج بلکہ اسی دم اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا دے۔ اس نے ایک جھرجھری لی اور اٹھ کر مس ہارون کو ٹکر ٹکر دیکھنے لگا۔

"کہاں چلے" مس ہارون نے اس کی نگاہوں کا غلط مطلب لیا اور سوال کیا۔ کچھ محجوب اور شرمسار سا ہو کر موسیٰ دوبارہ بیٹھ گیا اور بغلیں جھانکنے لگا۔ وہ اپنی شہوانی نظریں مس ہارون سے ملانے کی اپنے آپ میں ہمت نہیں پا رہا تھا۔ اس لئے نگاہیں جھکائے چپکا بیٹھا رہا۔

"یہ مس امتیاز کہاں چلی گئیں؟" مس ہارون نے اس سے پوچھا۔ موسیٰ نے ایک بار اور بھرپور نگاہ مس ہارون کے چہرے اور سینے پر ڈالی اور پھر گردن موڑ کر کمرے میں لٹکی ہوئی ایک گروپ تصویر دیکھنے میں منہمک ہو گیا۔ شہوانی خیالات اس کے دل و دماغ کو بار بار جھنجھوڑ رہے تھے۔ اور وہ ان پر قابو پانے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔ لیکن جب بات حد سے بڑھ گئی۔ اور وہ جسم میں تیز حرارت کی رَو دوڑتا محسوس کرنے لگا تو وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بغیر کسی اجازت اور معذرت کے کمرے سے باہر چلا گیا اپنے پیچھے اس نے زور سے دروازہ بند کیا۔ کہ اپنی حیوانی خواہشات دبانے کا یہی سہل علاج تھا۔ اس کے پاس!۔

"فوجی زندگی میں مَیں نے بڑے بڑے تجربے حاصل کئے ہیں مس ہارڈن!
مجھ پر کڑا وقت بھی آیا ہے۔ صعوبتیں بھی جھیلی ہیں اور صبر آزما لمحوں سے بھی
گذرا ہوں۔ ایک وقت ایسا بھی آیا ہے کہ مجھے اپنے ہی بھائیوں پر گولی چلانی
پڑی ہے۔ یہ میں تب کی بات کر رہا ہوں جب اس ملک پر انگریزوں
کا راج تھا۔ پھر ملک کا بٹوارہ ہوا اور میں اُن قافلوں میں شریک رہا۔
جو ہندوستان سے مسلمانوں کے انخلاء پر مامور ہوئے تھے۔ میری ان'
آنکھوں نے بڑے روح فرسا منظر دیکھے ہیں۔ میں نے خون کی ندیاں بہتی
نہیں دیکھیں لیکن خون میں لتھڑے چہرے ضرور دیکھے ہیں۔ میری دیرینہ
خدمات اور اہلیت کا صلہ مجھے کیا ملا؟۔ آپ جانتی ہیں؟۔ میری ترقی اس
وقت روکی گئی جبکہ اعلیٰ ہیڈکوارٹر سے میری پروموشن کا گزٹ چھپنے والا تھا
میں ایک نئے حکمنامے کا شکار ہو گیا تھا۔ جس میں علاقائی تقسیم کے لحاظ سے
ترقیاں دینا جائز قرار دیا گیا تھا۔ آپ کو یاد ہوگا۔ شروع شروع میں
آپ نے ایک روز مجھ سے پوچھا تھا کہ میں کون ہوں؟۔ پتہ نہیں میں نے کیا
جواب دیا تھا۔ لیکن میں آپ کو بتاؤں مس ہارڈن! میں اس طبقاتی تقسیم
کا بالکل قائل نہیں۔ شاید فوج والوں نے یہ حکم اس لئے جاری کیا ہو کہ
اُن کی نگاہ میں بعض اقلیتی طبقوں کو فائدہ پہنچتا ہو لیکن اپنے یونٹ میں

میں ایک واحد عہدیدار تھا جو اس حکم سے بُری طرح متاثر ہوا اور یہ سب کچھ اس وقت ہوا جبکہ میری ترقی کے سارے مرحلے بخیر و خوبی سے طے ہو چکے تھے صرف گزٹ شائع ہونے کی دیر تھی۔ ایسے میں مجھ پر ترقی کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ میرے واویلے، میرے احتجاج اور میری اپیلیں سب رائیگاں گئیں۔ میں نے اپنے جنرل کو اپیل میں لکھا تھا۔ کہ میری بوڑھی ماں اس طبقاتی تقسیم پر خندہ زن ہے۔ وہ کہتی ہے کہ ایک بچہ جس مقام اور جس مخصوص طبقے میں جنم لیتا ہے۔ اس میں اس بے چارے بچے کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔ چاہیئے تو یہ کہ ان والدین کو تختۂ دار پر لٹکا دیا جائے۔ جو بچے کو ایک خاص مقام پر جنم دینے کے جرم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ بچے کو کیوں سولی پر چڑھایا جاتا ہے؟ اس نے کونسا جرم کیا ہے؟ جو اسے آگے بڑھنے کا موقع نہیں دیا جاتا؟ لیکن میری اپیلوں کی کوئی شنوائی نہ ہوئی اور مجبور ہو کر مجھے فوجی زندگی کو خیر باد کہنا پڑا۔

مس ہارون! یہی سوال میں آپ سے کرتا ہوں۔ کیا یہ محض اتفاق نہیں ہوتا؟ کہ ایک بچہ کسی کی کوکھ سے جنم لے اور دوسرا بچہ کسی دوسرے مقام پر، کسی دوسرے طبقے میں کسی اور کی کوکھ سے جنم لے۔ اور پھر ایک حاکم بن جائے اور دوسرا اس کا محکوم۔ میں تو کہتا ہوں آج آپ جس کرسی پر بیٹھی ہیں۔ یہ بھی محض ایک اتفاق ہی ہے۔ آپ کے وسائل لامحدود تھے۔ آپ نے پڑھ لکھ کر یہ کرسی حاصل کر لی اور میرے حالات دوسرے تھے اور میں روٹی کے ایک ایک نوالے کو ترستا تھا۔ آپ اعلیٰ تعلیم حاصل کر گئیں

اور میں برسوں فوج کے دھکے کھاتا رہا۔ ورنہ بنیادی طور پر مجھ میں اور آپ میں کوئی فرق نہیں" موسیٰ کے ان دلائل کو مس ہارون کافی دیر سے پہلے تو بڑے صبر و تحمل اور دلجمعی سے سنتی رہی پھر شاید اکتا گئی اور جماہیاں لینے لگی۔ جماہیاں لیتے لیتے اچانک مس ہارون کی آنکھوں میں ایک شریر سے چمک عود کر آئی اور بڑی شوخی سے اٹھلا کر کہا۔

"مجھ میں اور آپ میں بڑا فرق ہے ۔میں عورت ہوں اور آپ مرد۔ آپ کو باتیں کرنے کا ڈھنگ آتا ہے اور میں بس سیدھی سادی سی لڑکی ہوں ورنہ ناظم صاحب کے دو پیغام آچکے ہیں اور میں اب تک نہیں گئی۔ آپ کی باتیں سنتی رہی ۔میری جگہ کوئی اور ہوتی تو آپ کو کھری کھری سنا کر کب کی جا چکی ہوتی۔" اچھا آپ بیٹھے رہیں ۔بس میں ناظم سے کھڑے کھڑے بات کر کے ابھی آئی"، مس ہارون نے پرس سنبھالا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تب تک میں بھی کوئی کام کر لوں گا مس ہارون" موسیٰ بھی اس کے ساتھ اٹھ آیا۔

"ٹھیک ہے بس میں بات کر کے سیدھے آپ کے دفتر آجاؤں گی۔ ہاں ؟" مس ہارون نے دروازے کی طرف بڑھتے کہا۔ پھر وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی اور موسیٰ نے بھی اپنے دفتر کی راہ لی۔

"محبت کائنات کی روح ہے۔ روئے زمین کے چپے چپے پر محبت کے موتی بکھرے پڑے ہیں لیکن انہیں ہر کوئی نہیں چن سکتا۔ صرف وہی چن سکتے ہیں۔ جنہیں قدرت اس مقصد کے لئے منتخب کرتی ہے۔" اپنے دوست

کہ یہ الفاظ موسٰی کے کانوں میں گونجنے لگے۔ اپنے بیمار دوست کی یاد آتے ہی اس کے سارے ولولے اور جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ کتنے دکھ کی بات ہے وہ سوچنے لگا۔ کہ اس کا دوست تو زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے اور وہ محبت کا راگ الاپ رہا ہے۔ پھر وہ سوچنے لگا کہ محبت درحقیقت فرصت طلب ہے اور فرصت کے لمحے صرف انہی لوگوں کو نصیب ہوتے ہیں جو کاہل الوجود ہوں۔ اور ہمہ وقت تصورات کی دنیا میں کھوئے رہتے ہوں۔ ملازمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ تندہی سے اور دل لگا کر کام کرے۔ اپنے سفلی جذبات پر قابو رکھے۔ ان متضاد خیالات سے ابھر کر اس نے قلم اٹھایا اور کام میں منہمک ہو گیا۔

لیکن ایک ہی گھنٹے بعد اس کے انہماک کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔ مس ہارون دروازے میں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ جن بیہودہ تصورات سے اس نے بڑی مشکل سے ایک گھنٹہ قبل چھٹکارا حاصل کیا تھا۔ وہ اب دوبارہ اپنے خوفناک جبڑے کھولے اس کے سکون اور دلجمعی کو تہس نہس کر رہے تھے۔

اس کی آنکھوں میں وہی چمک تھی۔ وہی شوخی اور وہی دل لبھانے والا انداز دلبرانہ تھا۔ موسٰی دل تھام کر رہ گیا۔ کتنی قاتل ہیں یہ نگاہیں! ۔۔ وہ سوچنے لگا۔ نہیں۔ قاتل نہیں۔ یہ تو مسیحائی قوت کا سرچشمہ ہیں۔ وہ پھر سے زندہ ہو رہا ہے اور اپنے پٹھوں میں ایک برقی قوت کا احساس محسوس کر رہا ہے۔ یہ نگاہیں اسے نئی زندگی کی سرخوشیوں کا پیغام دے رہی ہیں۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ساری خوشیاں سمیٹ لیں۔ جن کی مس ہارون نے اس پر بارش

کی تھی۔ اُن نگاہوں میں کھلی دعوت کا پیغام تھا۔ ایک انوکھی لگاوٹ تھی۔ اور کسی انہونی بات کی طرف اشارہ تھا۔

"مس ہارون! ایک بات پوچھوں؟" موسیٰ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے کہا۔

"ہاں۔ مگر۔ صرف ایک۔ دو نہیں" مس ہارون نے شوخی سے جواب دیا اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"ویسے تو انسانی دل خواہشات کا گہوارہ ہے۔ ایک طرح کا مرکز ہے۔ انگنت تمنائیں اور آرزوئیں روز جنم لیتی ہیں۔ اور پھر اپنی موت آپ مر جاتی ہیں۔ مگر ان تمناؤں اور آرزوؤں میں سے بعض ایسی بھی ہوتی ہیں۔ جن کا انسان گلا گھونٹ نہیں سکتا۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ انسان ان کو موت کے گھاٹ اتارنے پر قادر نہیں ہوتا۔ دوسری ان گنت آرزوؤں کے علاوہ کتنے دنوں سے میرے دل میں یہ خواہش جڑ پکڑ رہی ہے کہ کوئی آپ جیسی میرے ساتھ فلم دیکھے سیر گاہوں میں گھومے اور صاف ستھری سڑکوں پر چہل قدمی کرے۔ معلوم ہوتا ہے۔ میری یہ خواہش عنقریب پوری ہونے والی ہے۔" موسیٰ نے مس ہارون نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر اپنی دلی خواہش کا آخر اظہار کر ہی دیا۔

"کیا مس مخدوم نے ہامی بھرلی ہے؟" مس ہارون نے اس کا مذاق اڑایا۔

"مس مخدوم سے میرا کوئی تعلق نہیں" موسیٰ نے سنجیدگی برقرار رکھتے

جواب دیا۔ "دراصل دل کے معاملے میں مرد ہمیشہ بے بس ثابت ہوا ہے شائد یہ خصوصیت صرف مشرق کو حاصل ہو اور مغرب اس سے مستثنیٰ ہو بہر کیف یہ کوئی بات نہیں۔ میں سمجھتا ہوں۔ مجھے یہ حق پہنچتا ہے اور میرا مطالبہ جائز بھی ہے۔ کیا نہیں؟"

"لیکن میں تو سرے سے فلمیں دیکھتی ہی نہیں۔ اور پھر میں آپ کے ساتھ باہر جا بھی کیسے سکتی ہوں۔ آپ کے خیال میں میں بڑی آزاد خیال اور بیباک ہوں۔ لیکن ایسا نہیں اور نہ ہو سکتا ہے۔ معاشرہ خاندانوں میں بٹا ہوا ہے اور میں بھی ایک خاندان کی اہم رکن ہوں۔ معاشرے کے علاوہ میں اس خاندان کی بھی تو جواب دہ ہوں جس نے مجھے پال پوس کر جوان کیا ہے۔ یہی وہ قیود، وہ پابندیاں اور وہ حصار ہیں جو میں نہیں توڑ سکتی جو میری بہتری کے لئے میرے خاندان والوں میرے ارد گرد کھڑے کر رکھے ہیں۔ اور پھر ہم دونوں کے درمیان ایک فاصلہ ہے۔ حیثیت اور رتبے کا فاصلہ۔ گو میں ذاتی طور پر اس کی اتنی قائل نہیں لیکن پھر بھی معاشرے اور سوسائیٹی کی خاطر ہی نبھانا پڑتا ہے۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ لوگ مجھ پر آوازے کسیں اور میرا جینا حرام کر دیں؟"

"حیثیت اور رتبہ!" موسیٰ نے زچ ہو کر کہا، "یہ تو آپ کو پہلے بھی معلوم تھا مس ہارون!۔ اس وقت بھی جب اس شعبے میں میں نے پہلے دن قدم رکھا تھا۔ کہ میں کس مقام پر کھڑا ہوں۔ کیا تھوڑی دیر پہلے آپ نے اور مس امتیاز نے یک زبان ہو کر نہیں کہا تھا کہ میں آپ کا دوست

ہوں؟۔ اور جب آپ نے مجھے دوست کی حیثیت سے تسلیم کر لیا ہے تو یہ رتبے کی دیوار اور یہ نام نہاد معاشرے کی پابندیوں کا ہوّا کیوں خواہ مخواہ دکھایا جا رہا ہے؟ کہیں میں تعصب کا شکار تو نہیں ہو رہا۔! اس دوغلی پالیسی سے آپ کی مراد کیا ہے؟؟"

"کچھ بھی ہو۔ یہ ناممکن ہے۔ میں اس سے آگے نہیں بڑھ سکتی اور نہ ہی آپ کو بڑھنے دوں گی۔ کیا یہ کم ہے کہ میں آپ سے باتیں کر لیا کرتی ہوں۔ آپ کو میرا شکر گذار ہونا چاہیئے۔ میں آپ کے کمرے میں آجاتی ہوں۔ جانے کے لئے باقاعدہ اجازت طلب کرتی ہوں۔ ورنہ میں تو اس شعبے میں کسی کو کچھ سمجھتی ہی نہیں۔ آپ نے محسوس نہیں کیا؟ شعبے کے کتنے ہی رکن محض مجھ سے باتیں کرنے کے حیلے بہانے تراشتے رہتے ہیں؟۔ مرد دراصل کسی صورت بھی قانع نہیں ہوا۔"

"میں کچھ نہیں جانتا مس ہارون! میں تو بس یہ محسوس کر رہا ہوں کہ ہماری دوستی نے ایک نیا روپ دھار لیا ہے اور میں نے اپنے آپکو ایک نئے موڑ پر کھڑا پایا ہے۔ ایک ایسا موڑ جہاں اندھیرا اور اجالا ایک مرکز پر آکر مل رہے ہیں۔ میں آنکھیں بند کرکے کھڑا ہوں۔ میں نہیں جانتا اندھیرے کا عفریت مجھے نگل لیگا یا اجالا ہاتھ بڑھاکر مجھے اپنے دامن میں سمیٹ لیگا۔ دونوں میں سے کوئی بھی صورت پیدا ہو گئی تو میں بسر و چشم اسے قبول کر لوں گا۔ کہ مشیّتِ ایزدی کے ہر فیصلے کے سامنے مجھکو سر جھکانا ہے۔"

موسیٰ کی ان باتوں کو شائد مس ہارون نے مجذوب کی بڑ سے زیادہ وقعت نہ دی تھی تبھی تو وہ زوردار قہقہے پر قہقہہ لگا رہی تھی۔ مارے ہنسی کے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے اور پیٹ میں بل پڑ گئے تھے۔ اس کے جسم کے نمایاں خطوط و پیچ و خم کبھی زیادہ ابھرتے، تھرکتے اور کبھی اپنے آپ میں سکڑ سکڑ جاتے۔ لیکن موسیٰ کے دل پر جیسے آرے چلنے لگے تھے اس کا دل بیٹھنے لگا تھا۔ اس کا رنگ فق ہوگیا تھا اور وہ بڑی یاس و حسرت سے مس ہارون کا منہ تکے جا رہا تھا۔ جس کا جسم ہچکولے کھا رہا تھا۔ جس کی آنکھوں سے تمسخر جھانک رہا تھا اور جو سانپ کی طرح بل کھاتی، بار بار لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔ اس کے باوجود اس کا چہرہ جذبات سے عاری عاری سا الگ رہا تھا۔ دور دور تک ایسے تاثر کے آثار تک نہ تھے جس سے موسیٰ معمولی سی غلط فہمی میں بھی مبتلا ہو سکتا۔ موسیٰ نے اپنے آپ کو سنبھالا اور ایک بار پھر قسمت آزمائی۔

"یہ تو آپ تسلیم کریں گی مس ہارون! کہ عورت اور مرد میں اس "تعلق" کے بغیر دوستی ناممکن ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" مس ہارون نے جواب دیا۔ پھر اچانک وہ سنجیدہ ہوگئی۔ اس کی آنکھوں کی وہ عجیب چمک آپ ہی آپ بجھ گئی۔ موسیٰ کو یوں لگا جیسے اس نے اپنی بے بسی اور لاچاری کا اعلان کر دیا ہو۔ موسیٰ نے اطمینان کا سانس لیا۔

"تو کیا میں سمجھ لوں آج سے ہمارے راستے جدا ہو گئے ہیں؟۔ جب

اس فطری تعلق کا وجود باقی نہیں رہ سکتا تو عورت اور مرد میں دوستی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں کوشش کروں گا کہ آپ کو دن بھر اپنی منحوس صورت نہ دکھاؤں ؟"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے ایک دفتر میں کام کرتے آمنا سامنا تو ہوتا رہیگا۔" مس ہارڈون کی فطری بشاشت اور شوخی دوبارہ عود کر آئی اور نشیلی آنکھوں سے موسیٰ کو دیکھنے لگی۔ "البتہ آپ کہیں تو آپ کو دیکھ کر آنکھیں میچ لیا کروں گی۔" اس نے اٹھلا کر کہا اور پھر کھلکھلا کر ہنسنے لگیں۔ موسیٰ نے رنجیدہ ہو کر کہا۔

"مس ہارڈن! ایک بات میں صاف صاف بتا دوں۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ یوں ہو جائے گا۔ گو آپ مانیں گی نہیں لیکن اس معاملے میں آپ مجھ سے زیادہ قصوروار ہیں۔ اس تحریک کا آغاز آپ ہی کی طرف سے ہوا تھا ورنہ میں تو پہلے ہی سے قسمت کا ستایا اور راندہ ہوا انسان ہوں۔ میں یہاں محض ملازمت کرنے آیا تھا اور کچھ نہیں۔ آج مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے کسی نے مجھے ننگا کر کے چوراہے پر لا کھڑا کیا ہو۔ میں اپنی نگاہوں میں آپ گر گیا ہوں۔ کچھ بھی ہو اب تیر کمان سے نکل چکا ہے۔ میں تو اب بھی یہ کہوں گا ؎

تم سے چلتی رہے یہ راہ یونہی اچھا ہے
تم نے مڑ کر بھی نہ دیکھا تو کوئی بات نہیں"

"اچھا تو شاعر صاحب! اب میں جاؤں ؟" مس ہاردن نے سرشار ہوتے ہوئے

سے اس کی طرف دیکھا اور بولی "جیسے آپ کی باتیں اوٹ پٹانگ ہوتی ہیں ویسے ہی آپ کی شاعری بھی بے سر و پا ہے۔ مہربانی کر کے اپنے دماغ کا علاج کرائیں۔ مجھے تو یہ ڈر ہے کسی دن آپ کو پاگل خانے کی ہوا نہ کھانی پڑے۔ موسیٰ کے بچے! عقل کے ناخن لو" مس ہارون کی آنکھوں میں وہی عجیب و غریب چمک دوبارہ مچلنے لگی تھی۔ اور وہ بڑی بے تکلفی سے موسیٰ کو تکے جا رہی تھی۔

"دل والوں ہی کے لئے آتشِ نمرود گلزار بنی ہے مس ہارون! ؎

"بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی"

مس ہارون نے ایک ادا سے موسیٰ کی طرف دیکھا اور دروازے میں کھڑی ہو کر کہنے لگیں۔ "جھوٹے کہیں کے!" اس کے بعد اپنے پیچھے دروازہ کھٹاک سے بند کر کے برآمدے میں ٹھک ٹھک کرتی جوتے چٹخارتی اپنے کمرے کی جانب بڑھیں۔

"قناعت کا تو میں سرے سے قائل ہی نہیں۔ یا اس پار یا اس پار۔ بس مجھ کو اتنا ہی ہے!" سوچتے سوچتے اور مس ہارون کی بعض میٹھی باتوں اور دل نشین انداز یاد کر کے وہ آپ ہی آپ مسکرانے لگا۔

"میرے سرتاج!۔ میرے سرتاج!!" بالکل لغو، بیہودہ اور واہیات لقب ہے۔ کون کس کا سرتاج ہے! سب کہنے کی باتیں ہیں!۔ وہ مجھ سے

محبت نہیں کرتی۔ اس نے مجھ سے کبھی محبت نہیں کی۔ سب دکھاوا ہے بناوٹ اور تصنع ہے۔ بیوی کے خط کے ٹکڑے ٹکڑے ردی کی ٹوکری میں پھینکتے موسیٰ کا دل غم و غصہ سے بھر آیا۔ عورت ذات اتنی گہری ہے کہ اس کی تہہ تک پہنچنا مرد کے بس کا روگ ہے ہی نہیں۔ ازدواجی زندگی کی بعض تلخیاں یاد کر کے وہ پیچ و تاب کھاتا مس ہارون کے دفتر میں داخل ہوا۔ جہاں اس کے علاوہ مس امتیاز بھی بیٹھی کسی بات پہ پٹخے دار قہقہے لگا رہی تھی۔

"آئیے۔ موسیٰ صاحب! بس ایک آپ کی کمی تھی۔ بیٹھیے" مس امتیاز نے گردن موڑ کر موسیٰ کی طرف دیکھتے اپنا قہقہہ اچانک روک کر کہا اور پھر پھولا ہوا سانس درست کرتے لگیں۔ مس ہارون نے نگاہ غلط انداز اٹھا کر موسیٰ کی طرف دیکھا اور پھر مسکرا کر گردن جھکا لی۔ لیکن ایک لمحہ بعد اس نے دوبارہ اپنی قاتل نگاہیں موسیٰ کے چہرے پر گاڑ دیں۔ اور پھر ٹکٹکی باندھے خاصی دیر تک دیکھتی رہی۔ موسیٰ کچھ عجب مجوب سا کرسی پہ بیٹھ گیا۔ وہ ایک مجرم کی طرح اپنے آپ کو شرمندہ و پشیمان سمجھ رہا تھا۔ کل کی واہیات گفتگو یاد آتے ہی موسیٰ کے دل میں ہیجان خیز جذبات نے کروٹ لی اور وہ ہونٹ چباتا میز پر شہادت والی انگلی سے بے مقصد لکیریں کھینچنے لگا۔ ایسی لکیریں جو دکھائی نہیں دے رہی تھیں لیکن اس کے دل پر مرتسم ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ اس نے کل کی واہیات گفتگو بھلانے کی خاصی کوشش کی تھی۔ اور اس کوشش میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی

ہو گیا تھا لیکن نگاہوں کے تصادم نے زخم پھر سے ہرے کر دیئے تھے اور دبی دبی خلش نے اسے پھر سے پریشان کرنا شروع کر دیا تھا۔ اگر ان کے درمیان کوئی "تعلق" معرض وجود میں نہیں آ رہا تھا۔ تو پھر ان قاتل نگاہوں کا پیغام کیا تھا؟ وہ سوچنے لگا۔ یوں دزدیدہ نگاہوں سے دیکھنا کیا معنے رکھتا ہے؟۔

"کوئی بات کیجئے موسیٰ صاحب! آپ تو یوں گم سم بیٹھ گئے ہیں جیسے کسی سے لڑ کر آئے ہوں" مس امتیاز نے مزاحیہ لہجے میں موسیٰ کو مخاطب کیا۔

"امتیاز! کیا تمہیں معلوم نہیں؟ عید آ رہی ہے اور انہیں بیوی بچے یاد آ رہے ہوں گے" مس ہارون نے مسکرا کر لقمہ دیا۔ اس کی آنکھوں میں وہی چمک دوبارہ سمٹ آئی تھی جسے موسیٰ کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔ بس وہ ایک عجیب لذت اور خمار کا احساس دلا رہی تھی۔ موسیٰ کا دل یکبارگی دھڑک اٹھا اور وہ جسم پر چیونٹے رینگتے ہوئے محسوس کرنے لگا۔

"اگر وہ تنہا ہوتا!" موسیٰ سوچنے لگا۔ پھر بھی کچھ بھی نہ ہوتا۔ اس نے ایک ثانیئے کے لئے سانس روک کر سوچا۔ گو وہ دل سے چاہتا تھا کہ اس پکے ہوئے پھل کو توڑ کر کھا لے لیکن ہاتھ بڑھانے والی بات اس کے امکان سے باہر ہوتی جا رہی تھی اور اب دل کے کسی گوشے میں یہ خواہش پرورش پا رہی تھی۔ کہ یہ پکا ہوا پھل آپ ہی آپ اس کی جھولی میں آن گرے۔

"اس میں اداس ہونے کی کونسی تک ہے۔ موسیٰ صاحب! اگر آپ چاہیں تو کل ہی گھر جا سکتے ہیں۔ ناظم صاحب سے میں آپ کی سفارش کر دوں گی"

مس امتیاز نے ہمدردی جتائی۔

"بیوی بچوں کی یاد تو خیر ہر شادی شدہ مرد کو آتی ہے" موسیٰ نے آخر سکوت توڑا۔ "اور آنی بھی چاہیئے کہ یہ ایک فطری امر ہے۔ لیکن اس بار میں گھر جانے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ کون تین چار دنوں کے لیئے دو تین سو روپے کا خون کرے اور مقروض الگ ہو جائے۔" موسیٰ نے بہانہ تراشا اور پھر بڑی گہری نگاہوں سے مس ہارون کی طرف دیکھا جیسے وہ سیدھا اس کے دل میں اترنے کی کوشش کر رہا ہو۔ لیکن اس کی نگاہیں ناکام لوٹ آئیں کہ وہ عجیب و غریب چمک بجھ چکی تھی۔ اور مس ہارون مطمئن سی ہو کر میز پر پڑے ہوئے پتھر سے کھیلنے لگی تھی۔

"یہ تو اور بھی اچھا ہے موسیٰ صاحب!" مس امتیاز بولیں "پھر عید پر ہمارے ہاں آ جائیے گا۔ ہم نے قربانی کے لیئے دو دنبے خرید رکھے ہیں۔ میں آپ کو سیروں گوشت کھلاؤں گی۔ سنا ہے عرب گوشت کے بڑے شائق ہوتے ہیں"

"شکریہ۔ مس امتیاز! بہت بہت شکریہ۔ اس گئے گذرے زمانے میں آپ کا دم غنیمت ہے۔ لیکن آپ سے زیادہ مجھے آپ کے چچا سے ڈر لگتا ہے"، موسیٰ نے مزاح میں اپنا وار کیا! اور وہ دونوں کچھ سمجھتے اور کچھ نہ سمجھتے کھلکھلا کر ہنس دیں۔

"ویسے آپ اچھا نہیں کر رہے ہے موسیٰ صاحب! آپ کو عید پر ضرور گھر جانا چاہیئے۔ بیوی بچے آپ کے منتظر ہونگے" مس ہارون نے

بالوں میں پنسل پھیرتے موسیٰ کو مخاطب کیا۔ موسیٰ نے اس کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھا اور پھر آنکھیں چرا کر بولا۔

"کوئی اور بات کریں مس ہارڈن!"

پھر وہ اداس ہو کر سوچنے لگا۔ یہی عورت کوئی دو ماہ پہلے اس سے باتیں کرنے کو حیلے بہانے تراشا کرتی تھی اور اب یہی عورت اسے آنکھیں دکھا رہی تھی۔ شاید اس لئے کہ وہ موسیٰ کے دل کا بھید پا چکی تھی۔ یہی تو عورت کی سب سے بڑی خامی ہے۔ اور یہی تو مرد کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اظہار محبت جرم ہے۔ بہت بڑا جرم! اب بھگتو موسیٰ! جرم کی سزا بھگتو!! موسیٰ اپنے آپ پر برسنے لگا۔ اور حسرت کے اس شعر کو دل ہی دل میں وِرد کرنے لگا۔

حُسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

کیا وہ اس صورت کو کبھی نہ بھلا سکے گا؟" موسیٰ نے مس ہارڈن کی طرف دیکھ کر سوچا۔

"ہاتھ بڑھاؤ موسیٰ! اور ان قاتل آنکھوں کی قندیلیں بجھا دو! ان شہد آگیں ہونٹوں کا رس چوس لو۔ اس اکڑی ہوئی لمبی گردن کا منکا توڑ دو! اور اِن ریشمی ملائم زلفوں کو نوچ ڈالو۔ ہاتھ بڑھاؤ موسیٰ!۔ ہاتھ بڑھاؤ!!" سوچتے سوچتے موسیٰ کا تنفس اور بڑھ گیا۔ اس کی کنپٹی کی رگ پھڑکنے لگی۔ اور اس کے حلق میں کانٹے سے چبھنے لگے۔ اس نے

خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور تھوک نگل کر میز کے نچلے پھٹے پر دھرے پاؤں ادھر ادھر پٹخنے لگا۔

مس ہارون نے گردن جھکا کر نیچے نگاہ دوڑائی اور پھٹے پر سرکشی کرتے موسیٰ کے پاؤں دیکھنے لگی۔ جو انجانے میں اس کے پاؤں سے بار بار ٹکرا رہے تھے۔ موسیٰ اپنی حرکت سے بے خبر برابر پیر ادھر ادھر پٹخ رہا تھا۔ مس ہارون نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا اور پاؤں پیچھے کھینچ لئے۔ زہر میں بجھی ہوئی اس مسکراہٹ پر موسیٰ تلملا کر رہ گیا۔ اور پھر دونوں سے اجازت لیکر اپنے کمرے میں آگیا۔

"کیا مصیبت ہے!" ناظم کے دفتر میں مس ہارون کو بیٹھے دیکھ کر موسیٰ دل مسوس کر رہ گیا۔ "یہ عورت ہے یا جن کی اولاد۔ ہر کہیں موجود رہتی ہے"، موسیٰ مڑ کر دروازے سے باہر نکلنے لگا۔

"آئیے۔ موسیٰ صاحب! کہیئے کیسے آنا ہوا؟" ناظم صاحب نے مس ہارون سے بات کرتے موسیٰ کو واپس مڑتے دیکھ لیا اور انہیں روکا۔

"میں رخصت کی عرضی لایا تھا ڈاکٹر صاحب!" موسیٰ نے اچٹتی نگاہ سے مس ہارون کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کتنی رخصت چاہیئے موسیٰ صاحب!" ناظم نے مسکرا کر پوچھا۔

"دس دن کی رخصت کافی ہو گی" موسیٰ ہکلایا۔

"دس دن؟ یہ تو بہت زیادہ ہے۔ دیکھیئے نا۔ عید پر سب ہی جانا چاہتے ہیں۔ دقت یہ ہے کہ ــ ویسے مجھے کوئی اعتراض نہیں

ہیں کسی کو بھی روکنا نہیں چاہتا لیکن مصیبت یہ ہے سب ہی عید کی چھٹیوں کے ساتھ زائد رخصت لینا چاہتے ہیں۔ اور کراچی میں کانفرنس کا انعقاد ہونے والا ہے۔ کیوں نہ دفتر کو تالے لگا دیئے جائیں،، ناظم صاحب بے ربط فقرے بولتے چلے گئے اور پھر تان قہقہے پر جا ٹوٹی۔

"لیکن ڈاکٹر صاحب ابیرا گھر تو بہت دور ہے،، موسیٰ درشتی سے بولا۔ اس کے لہجے میں خواہ مخواہ تلخی آ رہی تھی اور آواز کانپ رہی تھی۔ اس نے گھور کر مس ہارون کی طرف دیکھا جیسے اسے گمان ہو چلا ہو کہ وہی اس کے راستے میں روڑے اٹکا رہی تھی۔ "چار دن تو آنے جانے میں لگ جاتے ہیں۔ زائد رخصت لئے بغیر کام چل ہی نہیں سکتا،، اس نے مرتعش آواز میں وضاحت کی۔ اور پھیکی جھینپکاتا، منہ موڑ کر ہونٹ چبانے لگا۔ اسے رہ رہ کر اپنے آپ پر غصہ آنے لگا تھا وہ ایسے وقت آیا ہی کیوں؟ جب یہ حرّافہ یہاں بیٹھی ہوئی تھی۔ پھر وہ ناظم کی بے حسی پر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھانے لگا۔ اس خرانٹ حسینہ کے اشاروں پر ناظم خواہ مخواہ اپنی مٹی پلید کر رہا تھا اور پھر اسی حرّافہ کے سامنے اسکی سبکی ہو رہی تھی۔ کتنے دکھ کی بات تھی کہ وہ مکروہ صورت کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ اور وہ پل کی پل میں اس کی ساری شہرت اور ساری نیک نامی پر پانی پھیر سکتی تھی۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے تہیہ کر لیا کہ وہ گھر جائے گا۔ اور ضرور جائے گا۔ چاہے رخصت منظور ہو یا نامنظور ہو جائے!۔

"ابھی کل ہی تو آپ کہہ رہے تھے کہ آپ اس عید پر گھر نہیں جا رہے" مس ہارون نے سنجیدہ نگاہی سے اس کی طرف دیکھا اور اپنی ٹانگ اڑانے کی کوشش کی۔

"معاف کیجئے۔ میرا معاملہ ناظم صاحب کے زیر غور ہے۔ آپ کی عدالت میں پیش نہیں ہُوا۔" موسٰی نے جل کر کہا اور مس ہارون جز بز ہو کر رہ گئی۔ اس نے شکایت بھرے انداز میں ناظم صاحب کی طرف دیکھا لیکن اس نے بجز مسکرانے کے اور کوئی نوٹس نہ لیا۔ موسٰی نے اتنی مدت میں پہلی بار محسوس کیا کہ اس نے مس ہارون کے ناروا سلوک کا بھرپور بدلہ لے لیا ہے۔ پھر کسی نے اس کے دل میں چٹکی لی اور وہ اپنے بے جا درشتی پر پچھتاتا دل ہی دل میں اپنے آپ پر خفا ہُوا۔

"اوہو شکر ہے وقت پر یاد آگیا۔ موسٰی صاحب! آپ ابھی ابھی صدر دفتر جائیں اور ڈھاکہ والی شاخ کے لئے دوسری قسط کا تقاضا کریں۔ ان سے کہو۔ خدا کے بندو آدمی بنو اور ڈھاکہ والوں کی قسط فوراً ادا کر دو۔ ورنہ نقصان کی ذمہ داری انہی پر عائد ہو گی"۔ ناظم صاحب جیسے رخصت والی بات بھول بھال چکے تھے۔ انہوں نے اس انداز سے گفتگو کا رُخ پلٹا کہ مس ہارون کی شکنیں خود بخود مٹ گئیں اور وہ عام حالت میں دکھائی دینے لگی۔

"اُن سے کہنا" ناظم صاحب کی پاٹ دار آواز سے موسٰی چونک اٹھا۔ کہ معاملہ بڑی سنگین صورت اختیار کر گیا ہے اور اگر ڈھاکہ والی

شاخ کو بر وقت قسط کی ادائیگی نہ ہوئی۔ تو۔ تو۔ دقت یہ ہے۔ میری تو کوئی سنتا ہی نہیں۔ ٹیلیفون کر کر کے تھک گیا ہوں۔ ادھر عید سر پر آگئی ہے۔ دفاتر بند ہو جائیں گے۔ جہنم میں جائیں۔ مجھے کیا؟ بس آپ۔ میرا مطلب ہے میں آپ سے مخاطب ہوں مسٹر موسیٰ!۔ آپ ابھی جائیں اور اپنا فرض ادا کریں۔ اگر انہوں نے کوئی ٹال مٹول کی۔ تو مجھے ٹیلیفون کرنا۔"

موسیٰ دل گرفتہ ناظم کے دفتر سے چلا آیا اور ڈرائیور کو تلاش کرنے لگا ڈرائیور کو ہدایت دے کر جب وہ برآمدے میں اپنے دفتر کی جانب بڑھا تو پیچھے سے مس ہارون نے اس کا نام لے کر پکارا۔ وہ رک گیا۔ "وہ یہ خوبصورت تو ہرگز نہیں مگر میں اس دل کا کیا کروں جو میرا کہا مانتا ہی نہیں۔" موسیٰ انتظار میں کھڑا، اپنی طرف آتی مس ہارون کے متعلق سوچتا رہا۔ یہ بتیس برس کی عورت اپنے آپ کو نو عمر لڑکیوں میں شمار کرتی ہے۔ اونہہ! اس کی عمر دیکھو اور یہ اس کے غمزے، یہ شوخیاں اور یہ شاطرانہ چالیں! کاش اسے اپنی ڈھلتی جوانی کا کچھ تو احساس ہو سکے!!۔

"کیا آپ راستے میں تار گھر سے ہوتے ہوئے نہ جائیں گے؟" مس ہارون نے معنی خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "مجھے ایک ضروری تار دینا ہے"

موسیٰ نے خاموشی سے تار کا فارم ہاتھ میں لیا اور جانے لگا۔

"روپے تو لیتے جاؤ۔ منکی شاعر!۔ تار مفت تو نہیں بھیجے جا سکتے۔" مس ہارون ایک ادا سے مسکرائی اور پرس ٹٹولنے لگی۔ پھر پانچ روپے کا نوٹ اس کی طرف بڑھا کر گویا ہوئی۔

"بقایا رقم لوٹا دینا۔ نہیں تو شکایت کر دوں گی" مس ہارڈن کے سینے سے اس کے جسم کے نمایاں خطوط اور جھلک پڑے اور موسیٰ زچ ہو کر رہ گیا۔

"اور یہ منہ کیوں بسور رہے ہو بابا! آپ کو چھٹی مل جائیگی ناراض کیوں ہوتے ہو۔ ویسے وہ بے وقوف ہی ہوگا جو آپ کی باتوں پر بھروسہ کرے گا۔" موسیٰ جواب میں ایک لفظ نکالے بغیر، نوٹ ہاتھ میں لئے چلدیا۔ اور کھنکھتا نقرئی قہقہہ اس کا سیڑھیوں تک تعاقب کرتا رہا۔ اس کے جی میں آیا تار کا تہہ شدہ فارم کھول کر دیکھے تو سہی کہ وہ کیسے تار بھیج رہی ہے۔ لیکن پھر اپنی حرکت کو نازیبا اور غیر مہذب جان کر اپنے آپ کو اس ارادے سے باز رکھا۔ مگر کب تک؟ تار گھر کے کاؤنٹر پر آخر اس کی نگاہ تار کے الفاظ پر پڑ ہی گئی۔

"تو یہ بات ہے!" محترمہ اپنے والد کو اطلاع دے رہی تھی کہ وہ عید پر گھر نہیں آرہی، اس کا انتظار نہ کیا جائے۔ آخر کیوں؟۔

صدر دفتر سے واپسی پر جب وہ زینہ چڑھ کر برآمدے میں گزر رہا تھا تو اس نے مس ہارڈن اور مس امتیاز کو آپس میں باتیں کرتے سنا۔ مس ہارڈن، مس امتیاز سے کہہ رہی تھیں کہ وہ پرسوں گھر جا رہی ہے۔ یہ ایک عجیب معمہ تھا۔ جو موسیٰ کی سمجھ سے بالکل بالاتر ہو رہا تھا۔

مس ہارڈن نے کنکھیوں سے موسیٰ کی طرف دیکھا۔ اور بڑے تجاہل عارفانہ انداز سے ریزگاری اور تار کی رسید موسیٰ کے ہاتھ سے لیکر پرس

بیں ڈالی۔ پھر مس امتیاز سے باتوں میں یوں منہمک ہو گئی جیسے موسیٰ کا وہاں کھڑا ہونا، نہ ہونا برابر ہو۔ دل برداشتہ ہو کر موسیٰ اپنے دفتر میں داخل ہوا اور کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔

عید آئی اور گذر گئی۔ موسیٰ نے گھر سے واپسی پر سب کو عید مبارک کہا ماسوائے مس ہارون کے جسے وہ جان بوجھ کر نظر انداز کرنا چاہتا تھا۔ بلکہ اس اثنا میں اس نے یہ بھی کوشش کی کہ مس ہارون کا سرے سے سامنا ہی نہ ہونے پائے لیکن ایک دفتر میں کام کرتے ہوئے یہ بات ناممکنات میں سے تھی۔

دوپہر کو ڈھیروں کام سے ذرا فرصت ملی تو موسیٰ چائے پینے کی غرض سے اپنے کمرے سے باہر آیا۔ سوئے اتفاق، ابھی دم مس ہارون برآمدے میں کھڑی نیچے جھانک رہی تھی۔ قدموں کی چاپ سن کر اس نے خمیدہ گردن اٹھائی اور موسیٰ کو دیکھ کر بڑے روکھے پھیکے انداز میں مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میں طنز بھرا ہوا تھا یا شکایت تھی، موسیٰ فیصلہ نہ کر سکا۔ بس وہ مسکراتا اس کے قریب کھڑا ہو گیا۔

"کب آئے؟" مس ہارون نے ایک مرتبہ اور گردن جھکا کر نیچے دیکھتے موسیٰ کو مخاطب کیا۔

"دس بجے پہنچ گیا تھا۔ گاڑی لیٹ تھی۔ اس لئے وقت پر نہ پہنچ سکا۔"

"گاڑی لیٹ تھی یا آنے کو دل نہیں چاہتا تھا؟"

"یہ بھی درست ہے لیکن کیا کیا جائے۔ ملازمت کے لیے گھر کا آرام

قربان کرنا ہی پڑتا ہے"

مس ہارون نے گردن سیدھی کی اور موسیٰ پر بھرپور نگاہ ڈالی۔ اسی وقت برآمدے میں چپڑاسی چائے کے برتن لئے گذرنے لگا۔

"میرے کمرے میں رکھ دو" مس ہارون نے چپڑاسی کو بتایا اور پھر موسیٰ سے مخاطب ہوئی۔

"سر میں درد ہو رہا ہے۔ دوا کھانے کے لئے چائے منگوائی ہے"

"ہاں دوا سے آپ کو آرام آجائے گا"

"چائے پئیں گے؟"

"شکریہ۔ میں کنٹین میں جا رہا ہوں وہیں پی لوں گا۔"

"معلوم ہوتا ہے صبح سے چائے پی ہے نہ ناشتہ کیا ہے؟"

"ہاں مسلسل دو راتیں بے آرامی میں گذاری ہیں۔ سفر چاہے اوّل درجے میں کیا جائے یا تیسرے درجے میں۔ آدمی تھک جاتا ہے۔"

"چلو۔ چائے پی لو۔"

"ہاں جا رہا ہوں۔ کچھ ناشتہ واشتہ بھی کر لوں گا"

"میرا مطلب ہے میرے کمرے میں چلو۔ ناشتہ بھی آجائے گا۔"

موسیٰ نے پہلی بار محسوس کیا مس ہارون قدرے سنجیدہ اور اداس لگ رہی تھی۔ شائد سردرد کا اثر تھا جس سے اس کا چہرہ اُترا اُترا ہوا۔ اور مغموم سا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ہمدردی اور رحم آمیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور چپ چاپ اس کے پیچھے پیچھے اس کے کمرے میں داخل ہُوا

مس ہارون کونے والی میز کی جانب بڑھیں جہاں چائے کے برتن پڑے ہوئے تھے۔ پھر جیسے اسے کچھ یاد آگیا ہو، وہ دروازہ کی جانب لپکیں اور دروازے سے باہر جھانکنے لگیں۔

"ملازم حسین!" اس نے چپڑاسی کو آوازیں دینی شروع کیں۔ اور پھر واپس کونے والی میز کے قریب آکر کھڑی ہوگئی۔ چپڑاسی اندر آیا تو مس ہارون نے اسے مزید چائے اور ناشتے کے لئے توس اور مکھن لانے کو کہا۔ چپڑاسی الٹے قدموں واپس کمرے سے سے نکل گیا۔ تو مس ہارون چائے بنانے میں مصروف ہوگئی۔

"کتنی شکر؟"، چمچہ شکردانی میں ڈال کر اس نے موسیٰ کی طرف دیکھا۔ اور پوچھنے لگی۔

"صرف ایک" موسیٰ کرسی پر بیٹھے بیٹھے کسمسایا اور گردن موڑ کر مس ہارون کی اور دیکھنے لگا۔

"تبھی تو آپ اتنے پھیکے ہیں" مس ہارون مسکرائی "عید مبارک تک نہ کہا"

"عید باسی ہو گئی تھی مس ہارون! اور پھر مجھے جھوٹے لوگ بلکل اچھے نہیں لگتے"۔ مس ہارون نے موسیٰ کی طرف تیکھی نگاہوں سے دیکھا۔ اور پیالی میں شکر گھولتے کہنے لگیں۔

"ہاں جھوٹوں کو میں خود بھی پسند نہیں کرتی۔ عید کیسے گذری؟"

"اچھی گذری"، موسیٰ نے جواب دیا اور پھر مس ہارون کے چہرے پر اپنی

نگاہیں گاڑ دیں۔

"میں نے اور میری سہیلی تسنیم نے امتیاز کے ہاں عید منائی تھی واقعی انہوں نے دو دنبوں کی قربانی دی تھی۔"

موسیٰ سٹپٹا کر رہ گیا اور حیران ہو کر کافی دیر تک اسے تکتا رہا۔ اور جب مس ہارون چائے کی پیالی لئے اس کی جانب آنے لگیں تو اس نے گردن موڑ کر نگاہیں جھکا لیں۔

مس ہارون کے ہاتھ سے پیالہ لیتے اس نے ایک بار اور اس کے چہرے کا بھرپور جائزہ لیا۔

"لیکن آپ تو کہہ رہی تھیں کہ میں گھر جاؤں گی" عید سے پہلے، مس ہارون اور مس امتیاز کے مابین گفتگو کا موسیٰ نے حوالہ دے کر کہا۔

"کب؟۔ میں نے ایسی کوئی بات امتیاز سے نہیں کہی تھی۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ بتاؤ مجھے سفر خرچ پیشگی مل سکے گا؟"

"کوشش کروں گا مس ہارون!۔ کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

چائے کی دو پیالیاں چڑھا کر اور ناشتہ کر کے موسیٰ نے مس ہارون کا شکریہ ادا کیا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ اسے رہ رہ کر اپنے آپ پر تاؤ آ رہا تھا۔ لیکن پھر وہ سوچنے لگا کہ اس کے کان اسے دھوکہ نہیں دے سکتے۔ اس نے ٹھیک ہی سنا تھا۔ اور اب یہ خواہ مخواہ بن رہی ہے۔ یا اسے مرعوب کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ "خیر میں مس امتیاز سے اس کی تصدیق کرا دوں گا" موسیٰ سوچنے لگا۔ لیکن مس امتیاز نے اگر تصدیق کر بھی دی تو کیا فرق پڑے گا؟ جو ہونا تھا، ہو چکا۔"

چار بج گئے تھے، دفتر کا سارا عملہ چھٹی کر چکا تھا۔ ایک موسیٰ تھا کہ بیٹھا ہوا مسلسل قلم گھسیٹ رہا تھا۔ اور کئی دنوں سے کھٹائی میں پڑے ہوئے اہم امور کو آج ہی مکمل کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اچانک دروازہ کھلا اور مس ہارون اندر داخل ہوئی۔

"افوہ! کتنی تھک گئی ہوں!" مس ہارون بولیں اور پھر موسیٰ کے سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ موسیٰ نے نگاہ اٹھا کر دیکھا اور دوبارہ قلم گھسیٹنے لگا۔ مس ہارون نے میز پر سے ایک کاغذ اٹھایا اور اس کا متن پڑھنے لگیں۔

"آپ ابھی تک گئے نہیں؟ کیا کام بڑھ گیا ہے یا جانے کو دل نہیں کر رہا؟" مس ہارون نے مسکرا کر کہا اور جواب میں موسیٰ بھی مسکرا دیا۔

"آپ کا لیکچر ختم ہو گیا؟"

"ہاں سیدھے وہیں سے آ رہی ہوں۔ صبح سے دفتری کام میں اتنی نہیں تھکی جتنی ان پینتالیس منٹوں میں تھکاوٹ محسوس کی ہے۔ بعض کوڑھ مغز لڑکیوں اور لڑکوں نے دماغ چاٹ لیا۔"

"چھوڑو مس ہارون! جانتی وانتی تو کچھ ہو نہیں۔ بس یونہی یونہی کہہ کر طلباء کو ٹرخا دیتی ہو۔" موسیٰ نے قلم رکھ دیا اور ترنگ میں آکر اس کا مذاق اڑایا "کبھی میری کلاس میں بیٹھو اور میرا لیکچر سنو تو تمہیں پتہ لگے۔"

"میں تو اتنا جانتا ہوں مس ہارون! جو مجھ سے بھی کم جانتا ہے، وہ بالکل بدھو ہے۔"

"اچھا تو آپ کے خیال میں میں آپ سے کم جانتی ہوں؟"۔

"یقیناً! کتنی ہی مرتبہ تو آپ کو بحث میں ہرایا ہے۔"

"آپ مجھے کیا ہرائیں گے موسٰی!۔ میں تو آپ کے ناظم سے بھی زیادہ جانتی ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے پاس پی ایچ ڈی کی ڈگری ہے۔ کتنی ہی مرتبہ وہ پڑھاتے پڑھاتے میرے پاس بھاگے بھاگے آتے ہیں اور میں نے انہیں صحیح مشورہ دیا ہے"

"اسی لئے تو میں کہا کرتا ہوں مس ہارون! یہ ڈگریاں وگریاں سب فضول ہیں۔ جتنا علم میں نے بغیر کسی کالج میں داخلے کے حاصل کیا ہے، اتنا آپ نے مختلف کالجوں میں جوتیاں چٹخاتے کب پایا ہوگا!"

"یوں کہئے۔ آپ کے پاس مشاہدے کی فراوانی ہے ورنہ ایک ان پڑھ اور آپ میں فرق ہی کتنا ہے"

"چلو۔ میں ان پڑھ ہی سہی۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کر لیتا تو آپ جیسا فریبی اور ہرجائی ہو جاتا"

"اچھا تو میں ہرجائی ہوں؟"

"اس میں کیا شک ہے۔ اچھا یہ تو بتاؤ۔ کراچی کب جا رہی ہو؟ وہاں اس سے ملو گی؟"

"کس سے؟" مس ہارون نے اسے آنکھیں دکھائیں۔ لیکن وہ قطعاً مرعوب نہ ہوا اور اپنی بات کی مزید وضاحت کی۔

"اسی سے جو آپ کی زندگی کا مالک بننے والا ہے"

"یہ آپ اس کا ذکر کیوں چھیڑ دیتے ہیں۔ آپ کو زیب نہیں دیتا"

"واہ۔ یہ بھی خوب رہی!"

"تو پھر جلنے والے جلا کریں۔ میں تو اس سے بہ بانگ دُہل ملوں گی" مس ہارڈن نے قہقہہ لگایا اور موسیٰ زچ ہو کر اس کا منہ تکتا رہ گیا۔ کتنی ڈھٹائی سے اعتراف کر رہی تھی وہ۔ اسے ذرا بھی تو لاج نہ آئی۔

"آپ جانتی ہیں مس ہارڈن! جب تک قرب حاصل نہ ہو، محبت پھل پھول نہیں سکتی"

"یہ آپ کا خیال ہے مخبوط الحواس!"

"میں شرط بدنے کو تیار ہوں کہ آپ کو اس کی شمہ برابر پروا بھی نہیں"

"اپنے دماغ کا علاج کراؤ۔ آپ کی اوٹ پٹانگ باتوں میں اتنا بھی یاد نہ رہا کہ میں یہاں کیوں آئی تھی۔ میں پرسوں جا رہی ہوں۔ کل مجھے پیشگی سفر خرچہ دلا دینا۔ سمجھے؟"

"آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے مس ہارڈن! میں یہاں خازن نہیں، ایک معمولی اہلکار ہوں۔ اس معاملے میں آپ خازن سے رجوع کریں"

"میں خازن وازن کو نہیں جانتی۔ بس میں آپ کو جانتی ہوں۔ ذرا ذرا۔ ایک درخواست لکھ دو۔ میں دستخط کر دوں گی"

"درخواست میں کیا لکھوں؟"

"یہی کہ میں کراچی میں ہونے والے اجتماع میں وفد کی حیثیت سے جا رہی ہوں اور مجھے دو سو روپے پیشگی سفر خرچہ عطا کیا جائے"

موسیٰ نے ٹائپ کی مشین پر کاغذ چڑھایا اور درخواست ٹائپ کرنے لگا۔

"آپ نے آج کھانا کھایا تھا؟" مس ہارون نے مداخلت کی۔

"آپ کو اس سے کیا سروکار؟۔ آپ نے اپنا پیٹ تو بھر لیا تھا نا۔ میں دیکھ رہا تھا چپڑاسی آپ کا کھانا لے جا رہا تھا۔"

"آپ بھی آ گئے ہوتے!" موسیٰ نے ٹائپ کرتے کرتے اچانک انگلیاں روک لیں۔ اور مس ہارون کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ مس ہارون جھینپ سی گئی اور مسکرا کر بغلیں جھانکنے لگیں۔ موسیٰ نے دوبارہ ٹائپ کرنا شروع کیا اور پھر تھوڑی دیر بعد ٹائپ شدہ درخواست اس نے سامنے میز پر رکھ دی۔

"لیجئے محترمہ! درخواست پر دستخط کر دیجئے۔"

"یہ آپ کل خود لے جائیں گے تو کام بنے گا۔ ورنہ صدر دفتر میں زیر غور پڑے پڑے ہی گل جائے گی۔"

"وقت ملا تو کل چلا جاؤں گا۔"

"وقت کی کوئی قید نہیں مسٹر! یہ کام آپ کو کل کر کے دینا ہے۔"

"کل تو آنے دو۔ کون جانے آج رات ہی میرا دم نکل جائے۔ آخر صدمے اٹھانے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔"

مس ہارون نے ایک قہقہہ لگایا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ناظم صاحب جانے والے ہیں۔ چلنا ہو تو چلو۔" اس نے دروازے میں کھڑے ہو کر گردن موڑ کر موسیٰ کو مخاطب کیا۔

"آپ کو ناظم صاحب کی گاڑی مبارک ہو۔ بندہ بسوں میں سفر کرنے کا عادی ہے اور بس ہی میں سفر کرے گا۔"

"یوں گھور گھور کر کیا تکے جا رہے ہو؟"

"سوچتا ہوں مس ہارون! یہ مذاق کب تک چلتا رہے گا! کیا میرے اپنے کوئی جذبات نہیں؟ کیا میں مٹی کا مادھو ہوں۔ کیا میں بے جان و بے قالب کسی سنگتراش کا تراشا ہوا بت ہوں؟۔ میں اندھا ہوں! بہرہ ہوں؟ گونگا ہوں؟ آخر کب تک؟۔ کب تک میں اس بیہودہ "تعلق" کو نبھاتا رہوں گا؟"

مس ہارون کی کھلی ہوئی باچھیں سکڑ گئیں اور سنجیدہ ہو کر اس نے موسیٰ کی طرف ایک لمحے کے لئے دیکھا اور پھر دروازہ سے باہر نکل گئی۔ "یہ آگ کب بجھیگی؟۔ یہ آگ کب بجھیگی؟؟" موسیٰ سر تھام کر بیٹھ گیا۔ اور اپنے بال نوچنے لگا۔

آج شام مس ہارون وفد کے ساتھ کراچی جانے کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ دن بھر وہ ناظم صاحب کے دفتر میں گھسی رہی۔ موسیٰ نے چند ایک ضروری کاموں کو جلدی جلدی نبٹایا اور پھر صدر دفتر جانے کے لئے بس سٹاپ پر آ گیا۔ سٹاپ پر چند لڑکیاں کھڑی آپس میں چہلیں کر رہی تھیں۔ موسیٰ ایک طرف کھڑا ہو گیا اور بڑی بے چینی سے بس کا انتظار کرنے لگا۔ پھر اس نے مس ہارون کی درخواست کھولی اور ایک ایک لفظ پڑھنے لگا "آپ کا فرمان بردار نوکر" کے نیچے مس ہارون کے دستخط پر اس کی نگاہیں جم کر رہ گئیں سا سکی ہاتھ کی تحریر میں بھی کتنی جاذبیت تھی۔ ابھی وہ اس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے حروف ہی کھو کر

رہ گیا۔ کاش! وہ خازن ہوتا!!۔ موسیٰ سوچنے لگا اور مس ہارون اسے یوں مخاطب کرتی تو وہ دو سو روپوں کی جگہ دو لاکھ روپے کا چیک کاٹ کر دے دیتا۔ زیادہ سے زیادہ اس پر اختیارات کے ناجائز استعمال کا دعویٰ دائر ہوتا۔ پھر بھی یہ سودا مہنگا نہ پڑتا!۔ لیکن دو لاکھ روپے تو بہت بڑی رقم ہے۔ دو لاکھ روپوں سے تو وہ بیسیوں عورتیں خرید سکتا ہے! "مگر عورتوں میں بھی فرق ہوتا ہے"، موسیٰ اپنے آپ سے بحث کرنے لگا "ہر عورت کو دولت نہیں خرید سکتی۔ کم از کم مس ہارون ان عورتوں میں نہیں جسے دولت خرید سکے! اگر ایسا ہوتا تو اس کے تعلقات اس سے اتنے گہرے کبھی استوار نہ ہو سکتے۔ کون ایک کنگال کو منہ لگاتا ہے؟ لیکن پھر ان نوازشوں اور مہربانیوں کے در پردہ کون سا راز پوشیدہ ہے؟ محبت؟۔ ہرگز نہیں۔ لگاوٹ؟۔ توبہ کرو۔ دوستی؟۔ ہاں کسی حد تک مگر عورت اور مرد میں دوستی کیا معنی رکھتی ہے؟۔ بغیر کسی "تعلق" کے یہ دوستی نبھ ہی نہیں سکتی۔

گھر گھر کی آواز سے موسیٰ چونک اٹھا۔ نہ جانے کب کی بس سٹاپ پر آکر کھڑی تھی۔ اور لڑکیوں نے اگلی نشستوں پر قبضہ جما رکھا تھا۔ ایک لڑکی کھڑکی سے سر نکالے اسے دیکھتی ہنس رہی تھی۔ شائد وہ اس کے کھوئے پن کا مذاق اڑا رہی تھی۔

موسیٰ نے آگے بڑھ کر پائیدان پر قدم رکھا اور پھر بس کی سیڑھیاں پھلانگتا دوسری چھت پر ایک کونے والی نشست پر بیٹھ گیا۔ کچھ ہی

دیر میں بس طلباء سے بھر گئی اور گروہ در گروہ باتوں کا لامتناہی سلسلہ چل نکلا۔ موسیٰ الگ تھلگ بیٹھا اپنے آپ میں کھویا رہا۔ بس کب روانہ ہوئی؟ راستے میں کون کون سے سٹاپ آئے؟ موسیٰ کو مطلقاً خبر نہ ہوئی اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا، بس صدر دفتر کے سٹاپ کے نزدیک آ چکی تھی۔ اور جب گاڑی رکی اور کنڈیکٹر نے اترنے والوں کے لئے ہونک لگائی تو موسیٰ اچک کر دھپ دھپ کرتا سیڑھیوں سے اترا اور دھینگا مشتی کرتی بس پر سوار ہونے والی لڑکیوں کے بیچوں بیچ راہ نکالتا، فٹ پاتھ پر آ گیا۔ پھر وہ صدر دفتر کے پھاٹک میں داخل ہوا۔

دو سو روپے کا چیک جیب میں ڈالے جب موسیٰ واپس اپنے دفتر پہنچا تو مس ہارون بڑی بے چینی سے برآمدے میں ٹہلتی دکھائی دی

"اب کیا فائدہ؟ بینک تو بند ہو گیا ہے" مس ہارون نے چیک ہاتھ میں لے کر مایوسی دکھائی۔ موسیٰ رومال سے پسینہ پونچھتے ٹکٹکی باندھے اس کی صورت دیکھتا رہا۔

"ساری محنت اکارت گئی" اس نے دل میں سوچا۔ پھر مس ہارون سے مخاطب ہوا۔

"آپ چیک پر دستخط کریں دو سو روپے مل جائیں گے"

مس ہارون نے اس کی جانب عجیب نظروں سے دیکھا۔ جیسے اس کے لہجے کے دکھ اور کرب کو بھانپ گئی ہو۔ پھر اس نے پرس کھول کر قلم نکالا اور چیک کی پشت پر جلدی جلدی دستخط کر دیئے۔

قلم کا ڈھکنا چڑھاکر اس نے قلم واپس پرس میں رکھا اور روشنی کی جانب جھک
بڑھاکر اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

"گھبرائیے نہیں۔ میں ٹھگ نہیں۔ بس اتنا کیجئے کہ لائبریری کی چابیاں،
مراجعت فرمائیے۔"

"یہ آپ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں؟"

"میں سب جانتا ہوں مس ہارورن! میں نگاہوں کو پڑھ سکتا ہوں۔ آپ
نے جن نگاہوں سے مجھے دیکھا، میں تاڑ گیا کہ آپ کے دل میں شکوک پیدا
ہوگئے ہیں۔ آپ کا خیال ہے۔ میں دو سو روپوں کی خاطر آپ کو دھوکہ دے
دوں گا۔ یہ تو صرف دو سو روپے ہیں، کوئی ـــ دو کروڑ روپے بھی میری ہتھیلی
پر رکھ دے تو آپ کو دھوکہ نہیں دوں گا۔ یہ میرا ایمان ہے۔"

"یہ تو وہی بات ہوئی۔ آ بیل مجھے مار۔ میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتی۔
فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست!"

"آپ نے فارسی پڑھی ہے؟"

"ہاں سکول کے زمانے میں۔ اچھا! اب جلدی کرو۔ ابھی مجھے اور بھی
بہت سے کام کرنے ہیں۔ ۶ بجے شام والی گاڑی پکڑنی ہے۔ وفد کے سب
اراکین میری راہ دیکھ رہے ہوں گے۔ اور میں نے ابھی تک سامان باندھا ہے
اور نہ بکنگ کرائی ہے۔ اس کے علاوہ ایک ضروری تار بھی تو دینا ہے۔"
مس ہارورن نے آخری جملے پر جان بوجھ کر زور دیا اور پھر اسے کنکھیوں سے
دیکھتی مسکرانے لگی۔

"اب میرا منہ کیا تکے جا رہے ہو؟ چلو۔ دو سو روپے نکالو۔ یہ لو۔ لائبریری کی چابیاں اور اپنا خزانہ کھولو۔"

چابیاں لے کر موسیٰ بھاگا بھاگا لائبریری کی سمت بڑھا اور جلدی جلدی لائبریری کھول کر، خزانہ کھولنے لگا۔ خزانے پر چابی نہیں نہیں لگ رہی تھی۔ موسیٰ نے چابی کا نمبر پڑھا جس پر ایک کا ہندسہ کندا ہوا تھا۔ اس نے جھلا کر دو نمبر کی چابی پہلے تالے میں گھمائی اور اس کے بعد ایک نمبر کی چابی گھمائی کڑک کی آواز سے تالا کھل گیا۔ اس نے دو سو روپے تین بار گن کر الگ کئے اور ان کی جگہ چیک رکھ کر دوبارہ تالا لگا دیا۔

اتنے ہی مس ہارون بھی اندر چلی آئی۔ موسیٰ نے دس دس روپے کے بیس نوٹ اس کی جانب بڑھاتے کہا۔

"گن لیجئے۔ پورے دو سو روپے ہیں۔"

"اب اتنا وقت ہی کہاں ہے۔ ٹھیک ہی ہوں گے۔ مجھے آپ پر مکمل بھروسہ ہے۔ اچھا۔ اب میں جاتی ہوں۔ میری سہیلی پریشان ہو رہی گی۔ وہ بھی تو وفد میں شریک ہے۔"

مس ہارون نے روپوں کو پرس میں ڈالتے کہا۔ "اور ہاں! آج سے اس لائبریری کے محافظ بھی آپ ہی ہیں۔ خیال رہے ایک کتاب بھی گم ہو گئی تو دگنا ہرجانہ وصول کر دنگی۔"

مس ہارون دروازہ سے باہر نکلنے لگی تو موسیٰ نے پیچھے سے آواز دی "سنو!" مس ہارون نے پلٹ کر اس کی جانب دیکھا اور مسکرانے لگی۔

"گاڑی کتنے بجے جائیگی؟" اس نے مغموم ہو کر پوچھا۔

"بتایا تو تھا۔ چھ بجے شام والی گاڑی چھوٹتی ہے"

"میں نے اس وقت سنا نہیں تھا"

"تو اب کان کھول کر سن لو۔ گاڑی ٹھیک ۶ بجے روانہ ہوگی۔ اب دوبارہ نہ پوچھنا"

"بڑی خوش دکھائی دیتی ہو؟"

"کیوں نہیں ایسے مواقع روز روز تھوڑے ہی ملتے ہیں"

"ان سے ملنے کے؟" موسیٰ نے چبھتی نگاہوں سے دیکھتے پوچھا۔ اور مس ہارون کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ایک ثانیے کے لئے وہ ٹکر ٹکر موسیٰ کو گھورتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں وہی عجیب چمک ایک لمحے کے لئے نمودار ہوئی اور پھر کھوئے کھوئے لہجے میں گویا ہوئی۔

"کبھی تو تمیز سیکھو۔ بندۂ خدا۔ وفد میں جا رہی ہوں۔ میرے لئے یہ سب سے بڑا اعزاز ہے" موسیٰ کے دل پر سے منوں بوجھ جیسے آپ ہی آپ سرک گیا۔ اور اس نے سرشار نگاہوں سے مس ہارون کی جانب دیکھا۔

"اچھا تو میں ریلوے سٹیشن پر الوداع کہنے آؤں گا" موسیٰ نے بشاشت سے کہا۔

"جی نہیں۔ شکریہ! مس ہارون مسکرائی۔ میں آپ سے یہیں ٹاٹا کر لونگی"

"آخر اس میں ہرج ہی کیا ہے؟"

"بس کہہ دیا نا۔ آپ ریلوے سٹیشن پر نہیں آئیں گے۔ نہیں تو میں

کبھی آپ سے بات نہ کر دں گی مس ہارڈن نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں الوداع کہا اور لائبریری سے باہر نکل گئی۔ کچھ دیر بعد وہ بھی بوجھل بوجھل قدم بڑھاتا، لائبریری کو تالا لگا کر اپنے کمرے کی اور بڑھا۔ بکھرا سامان سمیٹ کر اس نے دفتر بند کیا۔ اور بس سٹاپ پر آگیا۔

بس گھر گھر کرتی چلنے کو تیار کھڑی تھی۔ موسیٰ اُچک کر اس میں بیٹھ گیا۔ اور جب نگاہ سامنے دوڑائی تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ مس ہارڈن کو اس کے جوڑے کی ساخت اور بناوٹ ہی سے پہچان سکتا تھا۔ شائد آج اس نے ناظم صاحب کا انتظار نہیں کیا تھا، ورنہ وہ تو شاذو نادر ہی بسوں میں سفر کیا کرتی ہے۔

موسیٰ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کے بالوں کو چھوا اور پھر اس کی لمبی گردن پر الوداعی بوسہ ثبت کیا۔ بس ہچکولے کھاتی چل پڑی۔ اور مختلف سٹاپوں سے ہوتی ہوئی ڈاکخانے پر آکر رک گئی۔ مس ہارڈن نے عورتوں کے اندر باہر آنے جانے والا دروازہ کھولا اور فٹ پاتھ پر آگئی۔ موسیٰ نے ایک جست بھری اور وہ بھی فٹ پاتھ پر اُتر آیا۔ یونہی ادھر ادھر دیکھتی مس ہارڈن کی نگاہیں موسیٰ پر پڑ گئیں اور پھر بڑے میٹھے انداز میں مسکرا کر آگے بڑھ گئی۔

نہ چاہتے ہوئے بھی موسیٰ نے کوئی ایک سو گز تک اس کا تعاقب کیا۔ اور جب مس ہارڈن تار گھر کی عمارت میں داخل ہوئی تو موسیٰ فٹ پاتھ پر چہل قدمی کرنے لگا۔ چہل قدمی کرتے کرتے وہ سوچنے لگا۔

"آخر وہ کسے تار دے رہی ہے! کون ہو سکتا ہے! وہی تو ہے۔ اور کون ہو سکتا ہے۔ وہ جو سکھر میں کوئی ٹریننگ لے رہا ہے۔ کتنا خوش نصیب ہے وہ! کتنا خوش نصیب ہے وہ!!"

موسیٰ کے دل میں ایک انجانے جذبے نے چٹکی لی اور وہ لمبی چوڑی سڑک کو اپنے تیز تیز قدموں سے کوٹتا تار گھر میں داخل ہوا۔ ایک خالی کاؤنٹر کی کھڑکی کے قریب کھڑی مس ہاردن تار کے فارم پر خانہ پُری کر رہی تھی۔ کہ موسیٰ دبے پاؤں، اس کی پشت پر آن کھڑا ہوا۔ مس ہاردن نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ پھر اس کے ماتھے پر شکنیں ابھرتی چلی گئیں۔ اس نے جلدی جلدی آخری الفاظ تار پر گھسیٹے اور موسیٰ کی جانب خشمگین نگاہوں سے دیکھتی تار دینے والی کھڑکی پر جا کھڑی ہوئی۔

موسیٰ ہال سے برآمدے میں آگیا اور اپنے آپ کو اس ذلیل حرکت پر کوسنے لگا۔

مس ہاردن تار کی رسید پرس میں ڈال کر اس کے قریب گذرتے گویا ہوئی۔

"آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیئے تھا۔ آپ نے اچھا نہیں" اور پھر وہ آگے بڑھ گئی۔ موسیٰ برآمدے میں کھڑا اسے احاطے سے باہر نکلتے دیکھتا رہا۔ اب وہ فٹ پاتھ پر کھڑی ہو کر ادھر ادھر شاید ٹیکسی سواری کے لیئے نظریں دوڑا رہی تھی۔ ایک بار بھی تو اس نے گردن گھما کر اس کی جانب نہ دیکھا۔ مایوس ہو کر موسیٰ دوسرے دروازے سے کسی اور سمت کو جاتی سڑک پر سر نیہوڑائے

خیالوں میں ڈوبا بڑھنے لگا۔

یہ شام بڑی اداس اور بھاری تھی۔ گھر آکر اس نے جلدی جلدی کپڑے تبدیل کئے۔ آئینے میں اپنی صورت دیکھی۔ قبیح اور مکروہ صورت پر جم جم کر پھٹکار برس رہی تھی۔ ماتھے پر دو ایک شکنیں اور گہری ہو کر ابھر آئی تھیں اس نے چاہا۔ آئینہ پٹخ دے۔ "بد اخلاقی کی انتہا!"

کمرے میں کاٹھ کباڑ کے انباروں اور بے ترتیبی پر طائرانہ نگاہ ڈالتے وہ سوچنے لگا۔ آخر کس بل بوتے پر! کس گھمنڈ میں؟ اس نے یہ جرأت کیسے کی؟ ـ مکان کو تالا لگا کر وہ جہانگیر آباد کے چوک پر آکر کھڑا ہو گیا۔ خیر۔ مس ہارون نے تو اسے انتہائی ذلیل سمجھا ہو گا۔ آج واپی لگا ہوں میں بھی معتوب اور اخلاقی طور پر دیوالیہ لگ رہا تھا۔ "مجھے اس سے معافی مانگنی چاہیے" اچانک۔ اس کے ذہن میں یہ خیال روشنی کی ایک کرن کی طرح پھوٹ نکلا اور منوں بوجھ آہستہ آہستہ آپ ہی آپ سرکنے لگا۔ "ہاں یہ ٹھیک ہے۔ میں اسے بتاؤں گا۔ کہ میں۔ میں بہت ذلیل ہوں۔ میں بڑا کمینہ ہوں۔ میں اس قابل ہی نہیں کہ تمہاری جیسی شائستہ با اخلاق اور مہذب عورت مجھے منہ لگائے۔ میں قابل نفرت ہوں۔ خدارا! مجھے معاف کر دو۔ مجھے تو یہ کچھ زیب ہی نہیں دیتا۔ میں ہٹ جاؤں گا تمہارے راستے سے بالکل ہٹ جاؤں گا۔ تمہاری ٹھوکر کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔"

کچھ ہی دیر بعد ایک خالی ٹیکسی پر وہ ریلوے سٹیشن کی طرف بڑھ رہا تھا

ٹیکسی ہارن بجاتی ڈنڈناتی چلی جارہی تھی۔ اور وہ بڑی بے چینی سے آنکھوں سے راستہ ناپ رہا تھا۔ آخر بڑے سٹیشن کی وسیع عمارت دکھائی دی اس نے کرایہ ادا کیا اور بھاگا بھاگا پلیٹ فارم کی جانب لپکا۔ پلیٹ فارم پر قلی قطار باندھے کسی آنے والی گاڑی کے انتظار میں کھڑے تھے۔ کراچی جانے والی گاڑی کب کی جا چکی تھی۔ وہ ہانپتا ہوا ایک خالی بنچ پر بیٹھ گیا۔ اور ویران نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

یہ غالباً انسانی جبلّت ہے کہ انسان دکھ پر سُکھ، غم پر خوشی اور تکلیف پر راحت کو ترجیح دیتا ہے۔ ورنہ مصائب کے لمحوں میں جو کسک محسوس ہوتی ہے۔ اس کا بھی اپنا ایک الگ مزہ ہے۔ بعینہٖ اسی طرح غریب دوست پر مالدار اور بیمار دوست پر تندرست دوست کو ترجیح دی جاتی ہے۔ بخت جمال جب تک تندرست رہا۔ موسیٰ نے اس کا فاقت کا بھرپور ساتھ دیا لیکن جب سے اس نے ہسپتال کی راہ لی تھی۔ موسیٰ اپنے دوست سے غافل رہنے لگا تھا۔ یہاں تک کہ اب وہ مہینوں اس کی بیمار پرسی کو نہ جاتا کبھی کبھی جب ضمیر کے کچوکے اسے بے کل کر دیتے تو وہ ہسپتال کا رُخ کرتا اور محض دس پندرہ منٹ اپنے دوست کی معیت میں گذار کر واپس آکر اپنے رنگین تصورات میں کھو جاتا۔

آج جب کہ مس ہارون کے غم سے اسے چند دنوں کے لئے فرصت مل گئی تھی، اسے بخت جمال بے طرح یاد آیا اور اپنی پہلی فرصت میں اس کی

عیادت کو پہنچا۔ شام کے جھٹپٹے کا وقت تھا تاہم ملاقات کا وقت ابھی باقی تھا۔ اتنی طویل غیر حاضری کے لئے وہ دل میں طرح طرح کے بہانے تراشتا وارڈ میں داخل ہوا۔ دن کی ڈیوٹی والی نرسوں کی جگہ رات والی نرسیں آچکی تھیں۔ اور اس وقت وہ وارڈ میں ایک ساتھ کھڑی حمد گا رہی تھیں۔ زندگی سے مایوس مریضوں کو تندرستی کا پیغام اپنی سریلی آواز کے ذریعے پہنچا رہی تھیں۔ موسیٰ ایک جانب کھڑا ہو گیا تاکہ نرسیں حمد ختم کریں تو وہ اپنے دوست کے بستر پر پہنچے۔ وہ نظریں جھکائے کھڑا رہا اور نرسیں حمد گاتی رہیں۔ موسیٰ نے محسوس کیا اس کے رونئیں رونئیں میں تقدس کا نور پھیل رہا ہے۔ کیف و سرور سے مسحور ہو کر اس نے آنکھیں بند لیں اور اپنے ملحدانہ خیالات پر اپنے آپ سے دست و گریبان ہو گیا

"ہر مذہب کا صرف ایک ہی پیغام ہے۔ خدائے بزرگ و برتر کی تسلیم و رضا!" موسیٰ آنکھیں میچے میچے سوچ رہا۔ "میں اعتقاد رکھتا ہوں تو میری بے اعتقادی کا علاج کر" "آمین!" نرسوں نے ایک ساتھ بلند آواز سے کہا تو موسیٰ نے آنکھیں کھول دیں اور دو نمبر بستر کی جانب بڑھا جو وارڈ کے دوسرے سرے پر تھا۔ قریب پہنچ کر موسیٰ کا دل دھک سے رہ گیا۔ دو نمبر بستر پر ایک لحیم شحیم ادھیڑ عمر کا آدمی لیٹا ہوا کراہ رہا تھا۔ موسیٰ نے بے چین نگاہیں سارے وارڈ میں گھما دیں لیکن اس کا دوست کہیں نظر نہ آیا۔

موسیٰ وارڈ کے ملحقہ نرس کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہی پرانی نرس

جو بخت جمال کے علاج کے لئے نفسیاتی طریقے آزمانے پر زور دیا کرتی تھی۔ ابھی ابھی اپنے کمرے میں آئی تھی اور میز کے قریب کھڑی شاید کام کا جائزہ لے رہی تھی۔

"جی ہاں۔ وہ فوت ہوگیا ہے۔" موسیٰ کے استفسار پر نرس بولیں۔ اور موسیٰ اسے پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتا رہ گیا۔ "یہ غلط ہے!" اس نے چاہا نرس کی پرزور تردید کردے "محبت کرنے والے کبھی نہیں مر سکتے!۔ کبھی نہیں مر سکتے!!" اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے نرس کی طرف دیکھا۔ پھر اسے یوں لگا جیسے کسی نے اس کا دل مٹھی میں لے کر زور سے بھینچ دیا ہو۔

"وہ مکمل ایک دن تک سرد خانے میں پڑا رہا" نرس کی آواز دوبارہ ابھری۔ "اس کا ایک چچا اسے دیکھنے اکثر آیا کرتا تھا لیکن جس روز سے بخت جمال کی حالت بگڑ گئی تھی، اس کا چچا بھی نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ بخت جمال ساری رات بیہوش رہا پھر دوسرے دن اس نے دم توڑ دیا۔ ہمیں مجبوراً اسے سرد خانے میں رکھنا پڑا۔ دوسرے دن اس کا چچا آگیا اور اس کی لاش لے گیا۔"

موسیٰ نے محسوس کیا جیسے نرس کو بھی اس کی موت کا بے حد افسوس ہو۔ اس کے لہجے میں بڑا کرب اور دکھ اُمڈ آیا تھا۔ اور وہ بار بار ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ پھر اس کا لہجہ تلخ تر ہوتا چلا گیا اور غیر مربوط سے جملے اس کی زبان پر آنے لگے۔

"یہاں سینکڑوں مریض آتے ہیں۔ میں کیا کروں۔ میں کر بھی کیا سکتی ہوں۔ چند گھنٹوں، چند دنوں اور چند مہینوں سے زیادہ یہاں کوئی بھی مریض نہیں ٹکتا۔ تندرستی یا موت دونوں صورتوں میں وہ ہسپتال کو خیرباد کہہ دیتے ہیں۔ یہ ایک سرائے ہے۔ مریضوں کا مسافرخانہ ہے۔ یہاں جانے ہی کے لئے سب ٹھہرتے ہیں۔ میں کس کس کا ساتھ دے سکتی ہوں؟ —

اس نے رات کو خون کی قے کی اور پھر بیہوش ہو گیا۔ وہ ساری رات بیہوش رہا اور پھر صبح ٹھنڈا ہو گیا۔ اس رات بھی بدقسمتی سے میں ہی ڈیوٹی پر تھی۔ یہ غلط ہے کہ ہمارے دل ہسپتالوں میں کام کرتے پتھر کے ہو جاتے ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ صدمہ اسی چیز کے کھونے کا ہوتا ہے جو اپنے دل کے بہت قریب ہو۔ آپ سے زیادہ اس کی موت کا دکھ اس کے ماں باپ اس کے بہن بھائیوں کو ہوگا۔

موسیٰ ٹکٹکی سے نرس کو دیکھتا رہا۔ پھر اس کی صورت گڈمڈ ہو کر رہ گئی۔ ضبط کے باوجود موسیٰ کی آنکھوں سے دو ایک آنسو چھلک ہی پڑے اس نے جیب سے رومال نکالا اور ناک کی بہتی رطوبت صاف کی۔

"میں بڑا ذلیل ہوں۔ بڑا نمک حرام ہوں۔ میں کسی کا دوست نہیں۔ میں کسی کا دوست ہو ہی نہیں سکتا۔ باہر آ کر موسیٰ نے اپنے کردار پر شدید نکتہ چینی کی۔ اُسے اپنے آپ سے نفرت ہو گئی۔" زندگی کے بعد موت قدرت کا اٹل اصول ہے۔ لیکن یہ کیا بات ہے کہ اس ترقی یافتہ دور میں بس ایک موت ہی وہ سربستہ راز ہے، جسے انسانی عقل حل نہ کر سکا، اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتے سڑک پر ندھال

پڑھتے موسیٰ کو اپنے دوست کی بے طرح یاد آئی اور پھر ایک اندھیرے گنبج میں کھڑے ہو کر وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

اجتماع کی مدت میں توسیع ہوگئی تھی۔ کچھ دن تو موسیٰ نے اپنے دوست کی موت کا ماتم کیا پھر اس کی حالت معمول پر آگئی اور وہ بڑے شدّ ومد سے مس ہارڈن کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ جس روز اس کی آمد کی توقع تھی ناظم کے نام اس کا تار موصول ہوا اور موسیٰ کا دل مُرجھا کر رہ گیا۔ پھر وہ وہ کس منہ سے اس کا سامنا کرے گا۔ اب اس کا آنا نہ آنا برابر ہے۔ اس کی ذلیل حرکت نے مس ہارڈن سے دوستی نبھانے کے سارے راستے مسدود کر دیئے تھے۔

لیکن خلافِ توقع جب دو دنوں بعد مس ہارڈن اپنے مخصوص سفید براق لباس میں ملبوس دوپہر سے ذرا پہلے وارد ہوئیں تو موسیٰ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

موسیٰ ایک ضروری کام میں الجھا ہوا تھا۔ پہلے تو اسے احساس ہی نہ ہوا کہ کوئی اس کے کمرے کے قدآور شیشے پر ہلکی ہلکی دستک دے رہا ہے۔ اور جب مس ہارڈن نے شیشوں پر جلترنگ بجا کر اسے اپنی جانب متوجہ کیا تو موسیٰ چونک اٹھا اور پھر باہر کھڑی مس ہارڈن کو دیکھ کر وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔

مس ہارڈن مسکرا کر ماتھے پر ہاتھ لے گئیں اور بڑے دلفریب

انداز سے اسے سلام کیا۔ موسلی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور دل اچھل اچھل کر باہر آنے لگا۔ مس ہارون مسکراتی آگے بڑھنے لگیں۔ تب موسلی کو ہوش آیا۔ اور وہ والہانہ انداز میں دروازے کی جانب لپکا۔

"سنیئے!" موسلی نے دروازے میں کھڑے ہو کر اسے پکارا۔ مس ہارون نے برابر آگے بڑھتے پلٹ کر دیکھا اور مسکرا کر بولیں۔

"ابھی آتی ہوں۔ ذرا ناظم صاحب سے مل آؤں"

موسلی کا دل بلیّوں اچھل رہا تھا۔ مارے خوشی کے اس کے اوسان خطا ہو رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی خوشی کا اظہار کس طور کرے۔ مس ہارون کی اچانک آمد اور پھر اس کے رویے میں ایسی عجیب تبدیلی کہ موسلی دل تھام کر رہ گیا۔ شائد اس نے اس دن والی ذلیل حرکت کا برا نہیں مانا تھا۔ یا شائد اس نے اسے معاف کر دیا تھا۔

موسلی جس ضروری کام میں تھوڑی دیر پہلے منہمک تھا، وہ دھرا کا دھرا رہ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں قلم ضرور تھا لیکن اب وہ لکھنے سے بالکل قاصر تھا۔ شائد اس کی روشنائی سوکھ گئی تھی۔ موسلی کی گردن فخر سے تن گئی "دیکھا! سب سے پہلے مس ہارون اسی کو سلام کرنے چلی آئی تھی" وہ دل ہی دل میں اترانے لگا۔ دفتر کا وقت کب کا ختم ہو چکا تھا۔ سب اہلکار اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ ایک موسلی دفتر کھولے بیٹھا تھا۔ اور بڑی شدت سے مس ہارون کی ناظم کے دفتر سے واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔

پھر ایک گھنٹہ اور گزر گیا۔ تھک ہار کر اور قدرے مایوس ہو کر موسٰی نے دفتر بند کیا اور باہر برآمدے میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی نگاہیں ناظم کے دفتر کے دروازے پر گڑی ہوئی تھیں۔ اور اس کے کانوں میں مس ہارون کے جوتوں کی ٹک ٹک کی آواز ابھرتی ڈوب رہی تھی۔ وہ اس کی چال کو سینکڑوں عورتوں میں پہچان سکتا تھا۔ بے چینی بڑھ رہی تھی اور ساتھ ہی ایک ہیجان خیز جذبۂ رقابت نے اس کے دل و دماغ کو جکڑ لیا تھا۔ کچھ دیر وہ برآمدے میں ٹہلتا رہا پھر بے قرار ہو کر وہ تیز تیز قدم بڑھاتا ناظم کے دفتر کی جانب چل پڑا۔ اور جب وہ دروازے کے قریب پہنچا تو ناظم صاحب کے دفتر کے پردے ہلے اور مس ہارون مسکراتی برآمد ہوئی۔

"اب تو دیر ہو گئی موسٰی!" اس نے مسکرا کر کہا "کل۔ ٹھیک ہے نا؟" اس کی نظروں میں وہی عجیب چمک پا کر موسٰی دل تھام کر رہ گیا۔

"کیا بات تھی؟۔ آپ نے بڑی دیر لگا دی" موسٰی ایک چھچھلتی نگاہ مس ہارون کے سراپا پر ڈالتے گویا ہوا۔ وہ پہلے سے کہیں بڑھ چڑھ کر حسین لگ رہی تھی۔ موسٰی کی نگاہیں اس کے جسم کے ہر زاویئے کو برابر تول رہی تھیں۔

"وفد کے سربراہ نے خواہ مخواہ میری شکایت کر دی تھی۔ میں ناظم صاحب کو اسی کے بارے میں تفصیل بتا رہی تھی۔" مس ہارون نے اپنے نئے پرس پر نگاہیں گاڑ کر جواب دیا۔

"تو گویا ایک میں ہی آپ کے مزاج کی برہمی کا شکار نہیں۔ اور بھی بہت سارے ہیں۔"

مس ہارون نے نگاہ اٹھا کر اس کی جانب دیکھا اور بڑے دلفریب انداز میں مسکرائی۔ عین اسی لمحے ناظم صاحب چرمی تھیلا سنبھالے پھولے ہوئے پیٹ کے ساتھ اپنے دفتر سے باہر آئے اور سگریٹ کی راکھ چٹکی بجا کر جھاڑتے مس ہارون سے مخاطب ہوئے۔

"چلیے محترمہ! دیر ہو رہی ہے" پھر موسیٰ پر ان کی اچانک نگاہ پڑ گئی اور بڑے روکھے انداز میں اس سے کہنے لگے۔

"آپ ابھی تک گئے نہیں موسیٰ صاحب؟ معلوم ہوتا ہے کام بڑھ گیا ہے۔" موسیٰ اس چوٹ پر تلملا کر رہ گیا۔ اور مدافعت کے لئے مس ہارون کی طرف دیکھنے لگا۔

"انہیں میں نے روک رکھا تھا ڈاکٹر صاحب! میرا خیال تھا۔ وقت ملتا تو سفر خرچہ کا بل تیار کر لیتی۔ لیکن فرصت ہی نہ مل سکی۔ یہ بے چارے اب تک میرا انتظار کرتے رہے ہیں۔" مس ہارون نے آخر اس کی بھرپور مدافعت کی اور موسیٰ متشکرانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا مسکرانے لگا۔ جواب میں مس ہارون بھی معنی خیز انداز میں مسکرائی۔

ناظم صاحب کی گاڑی میں سب سے پیچھے بیٹھے ہوئے موسیٰ سوچنے لگا۔ "یہ یقیناً اپنے منگیتر سے ملی ہوگی اور یہ نیا پرس بھی اسی نے

تحفتاً دیا ہوگا" موسیٰ کی طبیعت میں تلخی رچتی چلی گئی۔ مس ہارڈن نے گردن موڑ کر ایک نگاہِ غلط انداز سے موسیٰ کی جانب دیکھا۔ اور پھر مسکرا کر ناظم صاحب سے مخاطب ہوئی۔

"تار گھر سے ہوتے چلیں ڈاکٹر صاحب! مجھے والد کو اپنی آمد کی اطلاع دینا ہے"۔

"مس ہارڈن! مجھے اسی راستے گھر جانا ہے" موسیٰ نے خوشی خوشی اپنی خدمات پیش کیں۔

"تار میرے حوالے کر دیں میں اسے ارسال کر دوں گا" تب موسیٰ کو اچانک تار گھر سے وابستہ تلخ واقعہ یاد آگیا اور وہ دل ہی دل میں پچھتانے لگا۔ عین اسی لمحے مس ہارڈن نے اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورا اور بولیں۔

"کیوں؟ میرے پاؤں ٹوٹ تو نہیں گئے۔ میں اپنا کام خود کر سکتی ہوں"

موسیٰ کا رنگ فق ہو گیا۔ اتنے عرصے میں پہلی مرتبہ مس ہارڈن نے تلخ کلامی دکھائی تھی اور وہ بھی ناظم صاحب کی موجودگی میں۔ آگے بیٹھے ناظم صاحب نے گردن موڑی اور مس ہارڈن کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگے۔ موسیٰ اپنی سُبکی پر متاسف اور بے بس بیٹھا کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ کسی سے نگاہیں ملانے کی وہ اپنے آپ میں ہمت نہیں پا رہا تھا۔ اس بے عزتی اور سُبکی کا ذمہ دار وہ اپنے آپ ہی کو گردانے لگا۔ اتنے تلخ تجربے کے باوجود اس نے بڑی بے وقوفی کا ثبوت دیا تھا۔

جو مس ہارون کو بھولا بسرا واقعہ یاد دلایا تھا۔

گاڑی ایک جھٹکے سے تار گھر کے سامنے رک گئی۔ مس ہارون اور ناظم صاحب گاڑی سے اتر پڑے اور تار گھر میں داخل ہوگئے۔ کچھ دیر بعد موسیٰ نے بھی پٹ کھولا اور تار گھر کے عقبی دروازے سے ہوتا ہوا سڑک پر نکل آیا۔ اور فٹ پاتھ پر اداس اداس بڑھنے لگا۔ کافی دور جاکر اس نے مڑکر دیکھا، تار گھر کے قرب و جوار میں ایسا کوئی متنفس دکھائی نہ دیا جس پر وہ مس صاحبہ کا گمان کر سکتا۔ اس کا دل ڈوب کر رہ گیا۔ اور اسں نام نہاد "تعلق" اور غلط فہمی پر اپنے آپ کو کوستا آگے بڑھ گیا۔

آج صبح ہی صبح مس ہارون کے کمرے سے ملے جلے قہقہوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ شاید شعبے کے بیشتر مرد و زن یکجا تھے اور کسی تقریب میں حصہ لے رہے تھے۔ لیکن ایسی کیا تقریب ہو سکتی ہے؟ موسیٰ اپنے کمرے میں بیٹھا کانٹوں پر لوٹتا سوچنے لگا۔ اُس کے اپنے کمرے سے ویرانی سی ٹپک رہی تھی۔ اور ملحقہ کمرہ اونچے اونچے قہقہوں سے گونج رہا تھا۔ مس امتیاز ٹھیک ہی تو کہتی ہیں کہ مس ہارون پر محبتوں اور نوازشوں کی بارش ہوا کرتی ہے۔ آخر وہ جملہ اہل کاروں میں اتنی مقبول کیوں ہیں؟ موسیٰ برابر سوچتا اور کڑھتا رہا حالانکہ وہ ان تمام لڑکیوں میں سب سے زیادہ اکھڑ، مغرور اور منہ پھٹ واقع ہوئی ہے۔ پھر بھی سب ہی اسی کے گرویدہ کیوں ہیں؟۔ وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب

کھانے لگا۔ سب سے بھیانک قہقہے ناظم کے تھے جس کی آواز پھٹے ہوئے ڈول کی طرح اس کے کانوں سے بار بار ٹکرا رہی تھی۔

ایک مسلسل کربناک گھنٹے کے بعد کہیں جاکر مجمع منتشر ہوا اور موسیٰ نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور ابھی وہ کام کو ہاتھ لگانے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ دروازے کی مٹھی آپ ہی آپ گھوم گئی اور کرٹک کی آواز سے دروازہ کھلا مس ہارون اندر داخل ہوئی۔

"کیا کر رہے ہو؟" اس نے کرسی پر بلا اجازت بیٹھتے مسکرا کر پوچھا۔

"جھک مار رہا ہوں مس ہارون! آپ کو کوئی اعتراض ہے؟" موسیٰ نے جھلا کر کہا مس ہارون کی آنکھیں ایک ثانیے کے لئے اپنے آپ میں سکڑ گئیں اور وہ ششدر سی ہو کر اسے تکنے لگی پھر مسکرا کر بولیں۔

"بڑے غصے میں بیٹھے ہو۔ بات کیا ہے؟"

"بات کیا ہونی ہے مس ہارون!۔ اتنا شور تو کسی چنڈو خانے میں بھی نہیں ہوتا ہوگا۔ جتنا اس دفتر میں ہوتا ہے۔ آدمی کیا خاک کام کرے!" موسیٰ دل کا غبار نکالنے پر تلا ہوا لگ رہا تھا۔

"یوں کہو۔ جل گئے" مس ہارون نے بھرپور انداز میں چوٹ کی۔

"آپ کو بلایا ہوتا تو پھر جو بھی غل غپاڑہ مچتا، آپ کو کوئی شکایت نہ ہوتی بات صرف اتنی ہے۔"

"یہ غلط ہے۔ بالکل غلط" موسیٰ نے اپنا چور چھپانے کی کوشش کی۔ اور پھر شرمسار ہو کر وہ بغلیں جھانکنے لگا۔ جیسے مس ہارون نے اس کی چوری پکڑ لی ہو

"اچھا چھوڑو۔ اس کج بحثی کو۔ آپ تو ہر وقت جلال ہی میں رہتے ہیں۔ یہ بتاؤ۔ میرے سفر خرچے کا بل کب بناؤ گے؟"

"بن جائے گا۔ آج ہی بن جائے گا لیکن آپ کو اتنی جلدی کیا ہے۔ دو سو روپے تو آپ ہڑپ کر ہی چکی ہیں"۔

"پھر بھی حساب تو بیباق کرنا ہے نا"۔

"دوپہر تک تیار لے لیں مجھ سے"

"اچھا تو پھر میں۔ ایک بجے دریافت کروں گی"

"ہم تو خادم ہیں۔ آپ سب کے خادم۔ خدمت ہمارا پیشہ ہے"

"کل پھر دُم دبا کر بھاگ گئے تھے نا"۔ اچانک مس ہارون کھلکھلا کر ہنس دیں اور کافی دیر تک اس کا نازک جسم ہچکولے کھاتا رہا۔ موسیٰ نے اسے گھور کر دیکھا اور پھر کام میں مصروف ہو گیا۔ لیکن اس کے ہاتھ کانپنے لگے تھے۔ اس سے ایک لفظ بھی نہ لکھا جاتا تھا۔

"بس اتنی ہی سزا کافی تھی۔ امید ہے۔ آئندہ احتیاط سے کام لیں گے" مس ہارون اسے تیکھی نظروں سے دیکھتی گویا ہوئی اور پھر کرسی سے اٹھ کر باہر جانے لگیں۔ ابھی وہ دروازے ہی میں تھیں کہ موسیٰ نے پیچھے سے آواز دی۔

"اے مس صاحبہ! یہ آپ کا ڈبہ رہ گیا ہے"۔ موسیٰ نے میز پر پڑے ایک ڈبے کی طرف اشارہ کیا۔ مس ہارون نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں وہی عجیب چمک دوبارہ عود کر آئی اور پھر سرشار نگاہوں سے دیکھتی،

مسکرا کر کہنے لگیں۔

"یہ ڈبہ میرا نہیں، آپ کا ہے"

مس ہارڈن چلی گئیں تو موسیٰ نے دھڑکتے دل سے ڈبہ کھولنے کی کوشش کی۔ ناکام ہو کر اس نے دراز سے لفافے کھولنے والا چاقو نکالا اور ڈبہ کا ڈھکنا کھولا۔

"اچھا تو یہ بات ہے!" موسیٰ نے چاقو سے حلوہ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا کاٹ کر اپنے آپ سے کہا۔ اس کا دل یکبارگی دھڑکا اور ہاتھ پاؤں سُن ہو کر رہ گئے۔ پھر جیسے چیونٹے ہی چیونٹے وہ اپنے جسم کے روئیں روئیں پر رینگتے محسوس کرنے لگا۔

"اپنے وطن میں ایک ملازمت مل رہی ہے، سوچتا ہوں، چلا ہی جاؤں" ایک روز مس ہارڈن کے دفتر میں بیٹھے بیٹھے موسیٰ نے انکشاف کیا۔ مس ہارڈن نے اس کی جانب گھور کر دیکھا، پھر مسکرانے لگیں۔

"لیکن آپ نہیں جا سکتے۔ میں تو اتنا جانتی ہوں، اس شہر کے گرد اگرد ایک مقناطیسی ہالہ تنا ہوا ہے۔ جو ایک بار پھنس گیا، سو پھنس گیا پھر ساری زندگی اپنے تئیں چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا"

"لیکن میں ان میں نہیں ہوں مس ہارڈن! میں چاہوں تو آج بھی اس حصار کو توڑ سکتا ہوں"

"یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ہر مقام سے کچھ نہ کچھ یادیں وابستہ ہوتی ہیں، کچھ

بندھن ہوتے ہیں جنہیں انسان اتنی آسانی سے نہیں توڑ سکتا۔ کم از کم میں تو ایسا نہیں کر سکتی۔ اور پھر آپ کے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ آپ کی آئندہ ملازمت، اس ملازمت سے بہتر ہوگی۔ دور کے ڈھول ہمیشہ سہانے ہوتے ہیں۔"

"امید پر دنیا قائم ہے۔ یوں تو انسان قسمت کے ہاتھوں مجبور اور لاچار ہے۔ لیکن توقعات ہمیشہ اونچی رکھنی چاہئیں۔ قسمت آزمانے میں ہرج ہی کیا ہے؟"

"رلتے، لڑھکتے پتھروں سے وہ چٹان کہیں بہتر ہے جو ایک مقام پر ایستادہ ہے"

"چٹان پر جمود طاری ہے یا پھر صبر شکر کر کے اس نے اپنے لئے اسی مقام کو چن لیا ہے۔"

"ان پتھروں کے بارے میں کیا خیال ہے جو بے حسی کے شکار ہیں؟ اب کوئی کہاں تک ان پتھروں سے اپنا سر پھوڑے"

"اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ مجھے چلا جانا چاہیئے۔ اپنے وطن میں شاید یہ زخم بھر سکیں۔"

"لیکن تم اٹھ کیوں گئے ہو؟۔ اور یہ میرے سر پر کیوں جھکے چلے آ رہے ہو؟ تمیز سیکھو۔ بیٹھ کر باتیں کرو۔"

"میں نے تمہارے کہنے پر ہمیشہ صاد کیا ہے مس ہارڈن! لیکن ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ آج تو بس دو ٹوک فیصلہ ہو جانا چاہیئے۔ کہو اب

کیا کہتی ہو؟"

مس ہارون کے چہرے پر زردی کھنڈتی چلی گئی۔ موسیٰ اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا۔ عورت بام عروج پر بیٹھی ہو یا گھر کی چار دیواری میں مقید ہو، کمزور بزدل اور ڈرپوک ہوتی ہے۔ موسیٰ کو اس کی حالت پر رحم آنے لگا۔

"آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرو" مس ہارون نے سہم کر کہا۔ اس کی آواز تھرا رہی تھی اور وہ روہانسی ہو کر جیسے اپنی چیخ ضبط کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

"میں آگے بڑھا ہوں تو تمہاری ایما پر۔ پیچھے ہٹنا اب میرے لئے بالکل ناممکن ہے۔ تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا" موسیٰ میز کے کنارے کنارے دو قدم اور آگے بڑھا اور مس ہارون پیچھے ہٹتے ہٹتے دیوار سے جا لگی۔

"خدا کے لئے موسیٰ مجھے پریشان نہ کرو۔ یہاں سے چلے جاؤ" مس ہارون کی کانپتی آواز ابھری اور اس سے قبل کہ موسیٰ درمیان میں حائل کرسی کھینچتا اور اس تک پہنچتا، دروازہ کھلا اور مس امتیاز اندر داخل ہوئی۔

"دیکھو نا امتیاز! موسیٰ صاحب مجھے پریشان کر رہے ہیں" امتیاز کو دیکھ کر مس ہارون کی جان میں جان آئی۔ اور مسکراہٹوں کی بارش برساتی کرسی پر بیٹھ گئی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ "میں نے ان سے کہا، بیٹھ کر باتیں کرو۔ مگر یہ صاحب کھڑے رہنے ہی پر تلے رہے اور پھر الٹا مجھے پریشان کرنے لگے۔"

موسیٰ کے ماتھے پر ندامت اور پشیمانی کے قطرے سے چمکنے لگے۔ اس نے جیب سے رومال نکالا اور پسینہ پونچھنے لگا۔

"امتیاز! ذرا انہیں بتا دو کہ یہ چند دن ہمارے لئے کتنے اہم ہیں۔ زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔" مس ہارون کی آواز دوبارہ ابھری۔ مس امتیاز نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا پھر وہ ہونٹ کاٹتی گویا ہوئی۔

"یہ سچ ہے موسیٰ صاحب! یہ دن ہمارے لئے بڑے اہم ہیں۔ کیا آپ نہیں جانتے ہمارا انٹرویو ہونے والا ہے اور اسی انٹرویو پر ہماری ترقی کا دارومدار ہے۔ آپ تو مرد ہیں۔ کہیں بھی جا سکتے ہیں۔ کوئی بھی ملازمت آپ کے لئے معیوب نہیں۔ لیکن ہم عورت ذات ہو کر کہاں ماری ماری پھر سکتی ہیں۔ ہمارے لئے تو یہی ملازمت غنیمت ہے۔ اس لئے یہ چند دن آپ بھول جائیں کہ ہم آپ کی دوست ہیں۔" موسیٰ کے بگڑتے تیور دیکھ کر مس امتیاز نے بات بڑھائی۔ "امید ہے آپ نے برا نہ مانا ہوگا۔ اور اگر برا مان گئے ہیں تو مانتے پھریں۔ جب آپ کو ہماری پروا نہیں تو ہم آپ کی کیا پروا کرتی ہیں۔"

موسیٰ نے مس ہارون کی طرف گھور کر دیکھا۔ پھر اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا اور باہر آ گیا۔

اگلے چند دن موسیٰ نے بڑی بے کلی سے گذارے۔ وہ دفتر برائے نام آتا۔ سارا سارا دن یا تو ادھر ادھر گپیں ہانکنے میں گذارتا یا پھر اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے بیٹھ جاتا اور گھنٹوں کھوئے کھوئے انداز میں خلاء میں گھورتا رہتا۔ اسے تعجب ہو رہا تھا کہ مس ہارون نے ناظم صاحب سے اس کی شکایت کیوں نہ کی تھی۔ اس نے یوں چپ کیوں سادھ رکھی تھی۔ اور وہ کب

تک یوں ہانگا رون پر ٹوٹتا رہے گا۔ اور پھر اس روز تو وہ بھڑک ہی اٹھا جب صدر دفتر والوں نے مس ہارون کے سفر خرچ کا بل ایک اعتراض کے ساتھ واپس کر دیا تھا۔ اور مس ہارون چاہتی تھیں کہ وہ نقص موسیٰ دور کر دے۔ اس نے چپڑاسی کے ہاتھ رقعہ بھی بھیجا جس میں موسیٰ سے استدعا کی گئی تھی کہ وہ اس کی رہنمائی کرے۔ لیکن موسیٰ تو جیسے ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ اس نے رقعے کے ساتھ ساتھ سفر خرچ کے بل کے بھی پرزے اڑا دیئے۔

دوسرے دن چپڑاسی نے اسے بتایا کہ مس ہارون کل بڑی برہم تھیں شاید وہ ناظم صاحب سے شکایت بھی کر بیٹھی ہو اس نے تو یہاں تک کہا تھا کہ یہ دو ٹکے کا آدمی اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے؟ چپڑاسی کی زبانی ایسے توہین آمیز کلمے سن کر موسیٰ کا دماغ شائیں شائیں کرنے لگا۔ اس کا خون کھول اٹھا عین اسی وقت مس ہارون اپنے کمرے کی جانب برآمدے میں بڑھتی دکھائی دیں نفرت کے مارے موسیٰ کی مٹھیاں بھنچ سی گئیں اور کنپٹی کی رگ پھڑکنے لگی۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اپنے کمرے سے باہر آیا اور مس ہارون کے دفتر کا دروازہ ایک زوردار جھٹکے سے کھولا۔ اور پھر اس کے سامنے کھڑا کھڑا ڈولنے لگا۔

مس ہارون میز پر کچھ ڈھونڈھ رہی تھیں۔ کاغذات کو الٹتے پلٹتے اس نے نگاہ اٹھا کر موسیٰ کی طرف دیکھا اور دوبارہ اپنی تلاش میں منہمک ہوگئیں

"کیا چاہیئے؟" اس نے نگاہ اٹھائے بغیر موسیٰ سے دریافت کیا۔

"کل تم نے کیا کہا تھا؟" موسیٰ گستاخانہ انداز میں اسے گھورتے گویا ہوا۔

"میرے پاس فضول باتوں کے لئے وقت نہیں ہے۔ پھر کسی وقت آنا"۔ مس ہارون میز پر بدستور کچھ تلاش کرتی ہڑی رکھائی سے بولیں۔

"فضول باتیں؟۔ میری توہین کو تم فضول باتیں سمجھتی ہو؟ تمہیں یہ جرأت کیسے ہوئی؟"

موسیٰ تنک کر بولا اور مس ہارون ایک ثانیے کے لئے زچ ہو کر رہ گئیں۔ پھر جیسے حواس مجتمع کر کے اور نفرت سے بھرپور نگاہیں موسیٰ پر مرکوز کر کے بولیں

"میرا وقت ضائع نہ کرو۔ اس وقت میں بہت مصروف ہوں۔ چلے جاؤ یہاں سے!"

"میں اس توہین کا بدلہ لے کر رہوں گا"۔ موسیٰ نے اس کو گھورا اور کھڑا کھڑا بڑبڑا ڈولتا رہا۔

"میں کہتی ہوں اس وقت مجھے پریشان نہ کرو۔ مہربانی کر کے یہاں سے چلے جاؤ۔ پھر جو تمہارے جی میں آئے کرنا" مس ہارون قدرے روہانسی ہو کر بولیں اور دوبارہ میز پر پڑے ہوئے کاغذات ہی کچھ ڈھونڈنے لگیں۔

"اچھی بات ہے۔ میں سمجھ لوں گا"۔ موسیٰ نے دھمکی دی اور پیر پٹختا باہر نکل آیا۔ پھر وہ اپنے کمرے میں آیا اور ٹائپ کی مشین پر دھڑا دھڑ کچھ ٹائپ کرنے لگا۔ آدھ گھنٹے بعد اس نے شکایتوں سے بھری درخواست پر دستخط کر دیئے اور چپڑاسی کے ہاتھوں ناظم صاحب کو بھیج دی۔

دوپہر کو ناظم صاحب نے انہیں بلایا۔

"میں نے ملازمت کی ہے ڈاکٹر صاحب! عزت گروی نہیں رکھی۔

ملازمت چھوڑ سکتا ہوں مگر آن کا سودا نہیں کر سکتا۔ آپ غیر جانبدارانہ تحقیقات کا حکم صادر فرمائیں۔ میں گواہ پیش کر سکتا ہوں"۔ ناظم صاحب کے استفسار پر موسٰی برس پڑے۔

"آپ تشریف تو رکھیئے موسٰی صاحب!۔ دیکھیئے نا۔ معاملہ بڑا نازک ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے مس ہارون یہاں آئی تھیں"۔ ناظم صاحب مسکرا کر بولے "وہ اخبار کی آڑ میں رو رہی تھیں۔ میں سمجھا، شاید میری ترش روئی کی شاکی ہو کر آنسو بہا رہی تھیں۔ لیکن جب آپ کی درخواست پڑھی تو معاملہ سمجھ میں آگیا۔ دقت یہ ہے کہ یہاں سب روٹھے ہوئے ہیں۔ اب میں کس کس کو مناؤں؟"

"میں آپ سے دادرسی چاہتا ہوں ناظم صاحب! آپ انصاف کی کرسی پر بیٹھے ہیں۔ میں آپ سے غیر جانبدارانہ تحقیقات اور انصاف کا مطالبہ کرتا ہوں" موسٰی اپنے مطالبے پر بدستور مُصر رہے۔

"اچھا! اب تو دفتر کا وقت ہو چکا ہے۔ کل تحقیقات شروع کروں گا۔ آپ اطمینان رکھیں۔ میں انصاف کے تقاضے پورے کروں گا"، ناظم صاحب نے اس کی تسلی کرائی۔ پھر وہ دل پر منوں بوجھ لادے اپنے کمرے میں آگیا۔ اور کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ اس نے سوچا تک نہ تھا کہ پل میں حالات اتنے ناگفتہ بہ ہو جائیں گے۔ لیکن اب تو حالات پوری طرح سے قابو سے باہر ہو چکے تھے۔ اور جو کچھ ہونا تھا، ہو چکا تھا۔ "پیچھے ہٹنا تو میں نے سیکھا ہی نہیں" موسٰی نے اپنے آپ کو تسلی دیتے سوچا۔

سورج غروب ہو رہا تھا جب وہ کمرے سے باہر نکلا۔ سارے میں بڑی بڑی دو منزلہ عمارتیں بھائیں بھائیں کر رہی تھیں۔ دور جنگل سے بدستور پرندوں کی چہچہانے کی آواز خاموشی کا سینہ چیر رہی تھی۔ موسیٰ بوجھل بوجھل قدموں سے برآمدے میں بڑھنے لگا۔ اچانک اس کی نظر مس ہارون کے کمرے پر پڑی۔ اس نے دروازے کی مٹھی گھمائی۔ دروازہ کھل گیا۔ وہ اندر داخل ہوا اور ایک ایک شئے کو بنظر غائر دیکھنے لگا۔ پھر اس کی نظریں سامنے ٹنگی ہوئی دو تصویروں پر جم کر رہ گئیں۔ یہ وہی فریم تھے جو اس نے مس ہارون کو تحفتاً دیئے تھے۔ وہ کرسی پر چڑھا اور دونوں تصویریں اتار کر بغل میں داب لیں۔ پھر وہ واپس اپنے کمرے میں آیا اور الماری کا تالا کھول کر تصویریں اس میں چھپا لیں۔ الماری کو تالا لگا کر وہ باہر آ گیا اور پھر بڑے اطمینان اور سکون سے سیڑھیوں سے اترا اور بس سٹاپ پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ اسے یوں لگا جیسے منوں بوجھ اس کے ذہن سے آپ ہی آپ اتر گیا ہو۔ اب وہ اپنے آپ کو بڑا ہلکا پھلکا غیر مرئی سا محسوس کرنے لگا۔

کافی دیر انتظار کے بعد جب کوئی بس آتی دکھائی نہ دی تو سڑک پر پیدل ہی چل پڑا اور رات کو اندھیرے میں ریلوے سٹیشن پہنچا۔ ایک معمولی ہوٹل میں چند لقمے زہر مار کیے۔ پھر تانگے میں بیٹھ کر اپنے گھر کی راہ لی۔

صبح جب وہ دفتر پہنچا تو معلوم ہوا مس ہارون نے کہرام مچا رکھا ہے ناظم صاحب، مس ہارون اور مس انتیاز مل کر ایک ایک دفتر کی تلاشی لے رہی ہیں۔

بے چارے چوکیدار کی شامت آئی ہوئی تھی۔ جو بوکھلایا ہوا ادھر ادھر بھاگتا پھرتا دہائی مچا رہا تھا۔ ناظم صاحب نے چوکیدار کو دھمکی دے رکھی تھی۔ کہ اگر مس ہارون کے کمرے کی گم شدہ چیزیں برآمد نہ ہوئیں تو چوکیدار کو نوکری سے برخاست کر دیا جائیگا۔ موسیٰ یہ سب کچھ معلوم کر کے دل ہی دل میں ہنستا اپنے کمرے میں آگیا اور بڑے سکون سے کام میں جٹ گیا۔ پھر شاید سب طرف سے مایوس ہو کر ناظم صاحب لڑکیوں کی جھرمٹ میں موسیٰ کے دفتر میں اس وقت آ دھمکا جب وہ باہر جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ شعبے کے دیگر اہلکار بھی ایک ایک کر کے موسیٰ کے کمرے میں آگئے۔ اور بڑے شوق اور دلچسپی سے عجیب قسم کی چوری کی کارروائی جانچنے لگے

"موسیٰ صاحب!" ناظم صاحب نے مسکرا کر موسیٰ کو مخاطب کیا۔ "ہارون کے دفتر سے دو فریم چوری ہوئے ہیں۔ کچھ عجیب سی بات ہوئی ہے۔ دقت یہ ہے کہ مس ہارون انہیں بڑی اہمیت دے رہی ہیں۔ ہم نے سب دفتروں میں تلاش کر لئے ہیں لیکن وہ کہیں نہ ملے۔ کیا آپ اس معاملے پر کچھ روشنی ڈال سکتے ہیں؟"

"کیسے فریم تھے ناظم صاحب؟۔ کیا بہت قیمتی تھے" موسیٰ نے کنکھیوں سے مس ہارون کی طرف دیکھتے ناظم صاحب سے پوچھا۔

"اس سے آپ کو کیا مطلب؟" بجائے ناظم کے مس ہارون کی برہم آواز موسیٰ کے کانوں سے ٹکرائی۔ "کوئی جرأت ہی کیسے کرے کہ میرے دفتر سے کوئی چیز چرا کر لے جائے"

موسیٰ کی خواہ مخواہ ہنسی چھوٹ گئی۔ پھر وہ حواس مجتمع کر کے بولے
"فریم تو کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ چوکور بھی تکونے بھی اور بیضوی بھی
یہاں تک کہ گول مٹول بھی ہوتے ہیں۔ پہلے فریموں کا حدود اربعہ تو بیان کیجئے۔"
موسیٰ نے مس امتیاز کی طرف دیکھا اور بھرپور قہقہہ لگایا۔ "ہاں واقعی!"
اس نے ہنسی روکی اور اچانک مس ہارون پہ اپنی نگاہیں گاڑ کر بات بڑھائی
"کون اتنی جرأت کر سکتا ہے کہ آپ جیسی معزز خاتون، اعلیٰ تعلیمیافتہ
اور اس شعبے کی نائب ناظم کے دفتر سے کوئی چیز چرا سکے!۔ یقیناً وہ کوئی پاگل ہی
ہوگا!" موسیٰ کا پارہ آہستہ آہستہ گرم ہو رہا تھا۔ اتنے سارے لوگوں
میں وہ اپنی سبکی گوارا نہ سکتا تھا۔ اس نے غصے میں ادھر ادھر دیکھا۔
پھر میز پر مکہ مارتے اپنی بات جاری رکھی۔

"یہ کیا مذاق ہے؟ آپ سب یہاں کس لئے جمع ہوئے ہیں؟"
مس امتیاز نے اس کی طرف ملتجیانہ انداز میں دیکھ کر پہلی مرتبہ مداخلت کی

"موسیٰ صاحب! خواہ مخواہ بات کو طول نہ دیجئے۔ اگر وہ فریم آپ
کے پاس ہوں تو انہیں لوٹا دیجئے۔"

"پھر وہی" موسیٰ گرجا۔ "مس امتیاز آپ بھی مجھے ہی الزام دے
رہی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ سب کی نگاہوں میں اس پورے
شعبے میں صرف میں ہی چور ہوں۔ حالانکہ میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ
کیسے فریم تھے۔ کس رنگ کے تھے؟۔ کیسی ساخت تھی ان کی؟؟"۔
"آپ جانتے ہیں مسٹر موسیٰ!۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں" مس ہارون

نے اسے چبھتی نگاہوں سے گھور کر دیکھا اور گرجیں۔ "یہ وہی فریم تھے جو آپ نے مجھے تحفہ میں دیئے تھے۔"

موسلی نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور وہ ماتھے اور گردن پر ٹھنڈے پسینے کی لکیریں بہتا محسوس کرنے لگا۔ پھر وہ بغلیں جھانکتا گویا ہوا۔

"آپ نے خواب تو نہیں دیکھا مس ہارڈن! کہاں میں اور کہاں، آپ! چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک! میں۔ دو ٹکے کا آدمی۔ اتنا حقیر۔ اتنا چھوٹا۔ اور آپ کو تحفہ دوں؟ پھر آپ اسے قبول بھی کریں؟۔ خوب! خوب!!"

"مسٹر موسلی! آپ کو شرم آنی چاہیئے۔ میں عورت ہو کر نہیں چھپا رہی۔ اور آپ مرد ہو کر صاف مکر گئے ہیں۔ آپ تو اپنے آپ کو عرب سمجھتے تھے۔ کیا عرب اتنے جھوٹے ہوتے ہیں!۔ کیا عرب اتنے بزدل ہوتے ہیں؟!۔ آپ میں اتنی بھی جرأت نہیں؟۔ آپ اتنے ڈرپوک ثابت ہوئے؟ ہاں!۔ میں اب بھی کہتی ہوں کہ آپ نے مجھے وہ فریم تحفتاً دیئے تھے۔ اور میں نے بڑی خوشی سے قبول کئے تھے۔ یہ وہی فریم تھے جنہیں شعبے کا ہر فرد دن میں کئی مرتبہ دیکھتا تھا۔ اور ہزاروں مرتبہ آپ کی نگاہوں سے بھی گذرے ہونگے۔ آپ میں جرأت ہونی چاہیئے کہ صداقت کا ساتھ دے سکیں۔ کوئی آپ کو پھانسی کے تختے پہ تو نہیں لٹکا دے گا۔ اگر آپ نے سچ بول دیا۔"

موسٰی گم سم کھڑا، تمبع پر نگاہیں جمائے رہا۔ چاروں طرف ایک سکوت طاری تھا۔ سب حیران سے ہو کر ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اور مس ہارون کی آنکھیں شعلے اُگل رہی تھیں۔ پریشانی کی حالت، اس سے چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ ایسے میں موسٰی کی گمبھیر آواز اُبھری۔

"اپنے گریبان میں جھانکیے مس ہارون! کہنے کو تو میرے پاس بھی بہت کچھ ہے۔ مجھے زبان کھولنے پر مجبور نہ کیجیے۔"

"موسٰی صاحب!" مس امتیاز نے دوبارہ مداخلت کی۔ "میں اس کی گواہی دیتی ہوں اور پھر مس برکت مسیح بھی گواہ ہیں۔ یہی فریم آپ نے مس برکت مسیح کو کرسمس کے موقع پر دیئے تھے۔ ایسے ہی فریم آپ نے مجھے بھی لاکر دینے کا وعدہ کیا تھا اور ایسے ہی فریم آپ نے مس ہارون کو تحفتاً دیئے تھے۔ اتنا تو سب ہی جانتے ہیں۔"

"ہاں!" موسٰی نے اداس ہو کر رُک رُک کہا۔ "یہ ٹھیک ہے لیکن وہ ہارون مر چکی ہے۔ جسے میں نے کبھی تحفہ دیا تھا۔ اس وقت جو میرے سامنے کھڑی ہے یہ تو اس کے عشر عشیر بھی نہیں۔ میری بات کو ہنسی میں نہ اڑاؤ۔ اور سنو!۔ تم سب مہربانی کر کے یہاں سے چلے جاؤ۔ بہت ہو چکا۔ کھیل ختم ہو چکا ہے حضرات! آپ مہربانی کر کے یہاں سے چلے جائیں۔"

موسٰی کا دماغ کھولنے لگا۔ اس نے بڑے دُکھ اور کرب سے مس ہارون

کی جانب دیکھا جس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں اور جو سب سے پہلے اس کے کمرے سے باہر نکلنا چاہتی تھیں۔ کچھ لوگ مسکراتے نکلے، کچھ حقارت سے دیکھتے نکلے، لیکن ناظم صاحب کے ماتھے پر شکنیں تھیں اور وہ غصے میں بھرے ہوئے چلے گئے۔

موسیٰ کو یوں لگا جیسے کوئی اس کے ذہن میں چیخیں مار رہا ہو! جیسے کوئی زور زور سے قہقہے لگا رہا ہو! چند ہی لمحوں میں وہ اپنے دفتر میں اکیلا کھڑا تھا۔ مجمع چھٹ چکا تھا۔ سب اپنے اپنے دفتروں کو جا چکے تھے۔

غصے میں بھرے ہوئے اس نے کرسی پیچھے دھکیلی۔ آگے بڑھ کر الماری کھولی اور دونوں فریم بغل میں داب کر اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ برآمدہ خالی پڑا تھا۔ وہ تیز تیز قدم بڑھاتا .... مس ہارون کے دفتر کی جانب بڑھا اور پھر ایک زوردار جھٹکے سے دروازہ کھول کر دندناتا اندر داخل ہوا۔

"یہی تھے نا وہ فریم!" اس نے وحشت بھری نگاہوں سے اسے گھور کر دیکھتے گرج کر کہا۔

"اوہو۔ ٹسوے بہانا بھی جانتی ہو۔ لیکن اطمینان رکھو۔ تمہارے ٹسوؤں سے صرف ناظم ہی متاثر ہوں گے جنہوں نے معمولی بات کا بتنگڑ بنایا اور مجھے ذلیل کیا۔ میرے لیے یہ سب بے کار ہے۔ تمہارا کوئی حربہ کارگر ثابت نہیں ہو سکتا۔ تمہاری یہ سرخ آنکھیں اب میرا

راستہ نہیں روک سکتیں۔ میں یہ آخری بندھن بھی توڑ کر جا رہا ہوں تا کہ اس کی کرچیں کچھ تمہارے دل میں بھی پیوست ہو سکیں۔ جھوٹی!۔ مکار!۔ تم نے مجھے کھلونا سمجھ رکھا تھا!۔ لو۔ میں یہ بندھن تمہارے سامنے توڑ رہا ہوں"۔ موسیٰ نے دونوں فریم فرش پر پھینک دیئے۔ اور پھر انہیں بوٹوں تلے مسلنے لگا۔

"لو۔ لو۔ لو۔ یہی وہ آگ تھی جو مجھے خاکستر کئے دے رہی تھی۔ میں نے اس آگ کو اپنے ہی ہاتھوں بجھا دیا ہے"۔

اور جب فریموں کے شیشے پس پس گئے اور تصویروں کے کاغذ اور گتے اچھی طرح مسلے گئے تو موسیٰ نے نفرت سے بھرپور نگاہ مس ہاروں پر ڈالی اور دروازہ پھر اسی زوردار جھٹکے سے کھول کر باہر آگیا۔ اونچی اونچی، دو منزلہ خوبصورت، اور نئی ساخت کی بنی ہوئی ادارے کی عمارتوں کو حقارت سے دیکھتا وہ سڑک پر سر نیہوڑائے بڑھتا سوچنے لگا۔ کہ ان اندھی گلیوں میں وہ کب تک بھٹکتا رہے گا! کب تک ؟ کب تک ؟؟

"ختم شُد"

(منظور عام پریس پشاور)